رجسٹرڈ نمبر لے ۴۷۸

بہ المستعان

الناظر

ایڈیٹر ـــ ظفر الملک علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ للعہ

قیمت فی پرچہ ۵ر

فہرست مضامین بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۰ء

نمبر ۱ جلد ۳۷

ہندوستانی اکاڈمی صوبہ متحدہ کے

مطبوعات

(۱) ازمنہ وسطیٰ میں ہندوستان کے معاشرتی و اقتصادی حالات

از علامہ عبداللہ بن یوسف علی۔ ایم اے۔ ایل ایل ایم سی بی ای۔ مجلد عہ۱۲ر

(۲) ایضاً ایضاً غیر مجلد عہر

(۳) اردو زبان و ادب

از سید محمد ضامن علی صاحب ایم اے۔ . . . . عہر

(۴) مغلوں سے پہلے عرب اور ہندوستان کے تعلقات

از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی . . . . للعہر

زیر طبع

(۱) مسلمانوں کے تمدن پر ہندوؤں کا اثر۔ از مولانا محمد امین صاحب عباسی۔

(۲) قرون وسطیٰ کا ہندوستانی تمدن۔ از رائے بہادر مہامہوپادھیایہ پنڈت گوری شنکر ہیراچند اوجھا۔

(۳) ہندی شاعری۔ از ڈاکٹر اعظم کریوی۔

(۴) ناتن (جرمن ڈراما) ترجمہ مولانا محمد نعیم الرحمن صاحب ایم اے، ایم آر، اے، ایس

(۵) ترقی زراعت۔ از خاں صاحب مولوی محمد عبد القیوم ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت الہ آباد

ملنے کا پتہ

ہندوستانی اکاڈمی صوبہ متحدہ۔ الہ آباد

طلسم تقدیر۔ مصنف روح تنقید کا ایک دلچسپ فسانہ ہے جس میں شہنشاہ اورنگ زیب کے آخری ایام کی ایک عبرت خیز داستان بیان ہوئی ہے۔ شروع میں عبدالقادر صاحب بی اے کے قلم سے فن افسانہ نویسی پر ایک مختصر مقدمہ بھی ہے۔ قیمت ۸ر

ہیملٹ۔ شکسپیر کے مشہور ڈرامہ کا ترجمہ منشی امتیاز علی بی اے وکیل نے عرصہ ہوا کیا تھا۔ اب دوبارہ ترمیم کے بعد شائع کیا ہے۔ دیباچے میں ڈرامہ اور اس کی تاریخ پر فلسفیانہ بحث کی ہے۔ اور قصہ کا خلاصہ لکھ کر اس پر تنقید کی ہے۔ قیمت عہ

باغ فردوس۔ میر ولایت علی فردوس وحیدری جو میر انیس کے شاگرد تھے اور مرثیہ گوئی میں مہارت تام رکھنے کے ساتھ ساتھ غزل، قصیدہ، مثنوی، ہر صنف کلام کے قادر الکلام شاعر تھے اور اردو فارسی دونوں میں صاحب دیوان تھے۔ یہ مثنوی انھیں کے زور طبع کا نتیجہ ہے۔ مثنوی گلزار نسیم کی بحر اور غالباً اسی کے جواب میں لکھی ہے۔ جسٹس محمود اور فردوس کے دوسرے قدردان انکی زبان سے اسکے اشعار سنکر داد سخن دیتے، اور اسکی طباعت پر اصرار کیا کرتے، مگر با کمال شاعر کی وارفتگی طبع کے باعث ان کی زندگی میں احباب اور دلی قدردانوں کی یہ حسرت پوری نہ ہوئی۔ فردوس کے انتقال کے بعد اُن کی عمر بھر کا اندوختہ یعنے دفتر شاعری اعزہ و ورثا کی بے اتفاقی کی بدولت قعر گمنامی میں جا پڑا، لہٰذا یہ غنیمت ہے کہ انکے ایک عزیز نے اس گوہر گراں مایہ کو طبع کرکے محفل ادب میں پیش کر دیا ہے۔ حجم ۱۵۲ صفحے قیمت عہ

سیر گل۔ مسٹر جلیل احمد جلیل قدوائی بی اے (علیگ) کے مختصر افسانوں کا مجموعہ۔ جس میں ۶ طبعزاد ہیں اور ۶ روس کے مشہور فسانہ نگاروں چیخوف اور ٹولسٹائی کے تراجم ہیں۔ قیمت عہ

صبح پیری کا ستارہ۔ حضرت شفق عماد پوری کی پچاس رباعیوں کا مجموعہ۔ سب رباعیاں پیری کے متعلق کہی گئی ہیں۔ ہر رباعی ایک صفحہ پر چھپی ہے۔ قیمت ۶ر

دل سی پارہ۔ حضرت شفق کی تیس رباعیوں کا مجموعہ۔ سب رباعیاں دل کے متعلق کہی گئی ہیں۔ ہر رباعی ایک صفحہ پر چھپی ہے۔ قیمت ۴ر

لمعات اختر۔ الناظر کے پرانے قلمی معاون حضرت اختر جوناگڑھی کی نظموں کا مجموعہ۔ جن میں سے بعض الناظر میں اور بقیہ دوسرے رسائل میں چھپی ہیں۔ قیمت ۸ر

خیالات ارونگ۔ امریکہ کے مشہور مورخ و انشا پرداز واشنگٹن ارونگ کے بعض دلچسپ و مفید مضامین کا ترجمہ۔ از مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے ایل ایل بی وکیل۔ قیمت عہ

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب۔ عہد محمود غزنوی کے شعرا کے حالات اور اُن کے ادبی کارنامے اور محمود کے معاصر حکمرانوں کی ادبی دلچسپیوں کی تفصیل۔ سید محی الدین زور ایم اے مصنف روح تنقید کے قلم سے۔ قیمت ۱۲ر

شاما۔ پنڈت کشن پرشاد کول بی اے رکن انجمن خادمان ہند کا دلچسپ فسانہ۔ جس میں معاشرتی اصلاح سے بحث کی گئی ہے مناظر قدرت خصوصاً کشمیر کے دلفریب مناظر کے بیان اور سیرت نگاری کے لحاظ سے یہ فسانہ نہایت دلچسپ ہے۔ عہ

دکن میں اردو۔ جنوبی ہند میں اردو کی ابتدا اور اسکی ترقی کی مفصل روداد۔ جو قیمتی معلومات سے لبریز ہے۔ از مولوی نصیر الدین ہاشمی منشی فاضل۔ قیمت ۱۲ر

اسوۂ حسنہ۔ حضور رسول مقبول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک حالات زندگی کے متعلق مولوی احمد عبد اللہ المسدوسی (عثمانیہ یونیورسٹی) کا قابل دید مضمون قیمت ۸ر

ابن یمین۔ فارسی کے مشہور شاعر ابن یمین کے حالات زندگی اور اسکے کلام پر تبصرہ۔ از مولانا عبدالسلام ندوی عہ

سرکار کا دربار۔ احمد الیاس مجیبی صاحب نے نہایت دلاویز پیرایہ میں حضور سرور کائنات صلعم کے حالات لکھے ہیں لیکن لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے نہایت مفید کتاب ہے۔ عہ

دنیا کے بسنے والے۔ دنیا کی ان قوموں کے عجیب حالات جو متمدن دنیا سے الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے عام طور پر روشناس نہیں۔ از سید بشیر حسین زیدی بی اے بیرسٹر ایٹ لا قیمت ۱۲ر

نور اللغات

منشی امیر احمد امیر مینائی کے شاگرد اور مشہور لغت گو
حضرت حسن کاکوروی کے خلف الرشید مولوی نور الحسن نیر
ایم اے ایل ایل بی وکیل نے سالہا سال کی محنت و جانفشانی
کے بعد اُردو کا یہ [illegible] جامع لغت تیار کیا ہے۔ جسکی خوبی کا
اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حکومت صوبجات متحدہ نے
تین سال تک [illegible] اس لغت کی طبع و اشاعت کے لیے
دو ہزار روپیہ سالانہ کی امداد
دیا اور مطبوعہ جلد کے پچاس
نسخے خرید کر تنقید کے سپرد
تین حصے تیار ہیں۔
حصہ اول میں حروف الف
ب کے الفاظ ہیں۔ حجم [illegible]
[illegible] نسخے تقطیع
[illegible] قیمت عنہ
حصہ دوم حروف پ تا
غ کے الفاظ ہیں۔ حجم ۵۱۰
صفحے۔ قیمت سے۔
حصہ سوم میں حروف ف لغایت ی کے الفاظ ہیں اور
حصہ اول و دوم کا ضمیمہ اضافہ کیا گیا ہے حجم ۶۴۳ صفحے عللعہ

روحوں کے کرشمے

یورپ میں اب یہ خیال بہت
پھیلتا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی انسانی روح باقی رہتی
ہے [illegible] اثر انداز ہوتی ہے۔ اسکے ثبوت
میں امریکا سوشل سوسائٹی کے ایک کارکن نے اپنے
بعض تجربات و مشاہدات شائع کیے ہیں۔ جسکو مولوی
محمد ظفر صاحب وکیل نے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ قیمت ہجر

عالم خیال

منشی احمد علی شوق قدوائی کی لاجواب نظم
[illegible] اپنے شوہر کو عالم تنہائی میں کس طرح
یاد کرتی ہے۔ شاعر نے اُس کے حقیقی جذبات کی ترجمانی کی
ہے۔ جسکے ہر شعر کی مناسبت سے ایک تصویر بنوا کر اضافہ
کی ہے اور بیگم صفدر علی صاحب نے مقدمہ لکھا ہے۔ قیمت مع بے تصویر [illegible]

حضرت ریاض خیر آبادی کا

مشہور فسانہ

حرم سرا

جو سالہا سال سے شائقین کو دستیاب نہیں
ہوتا تھا۔ اسکے کچھ نسخے حال ہی میں ملے ہیں۔
دونوں جلدیں مکمل ہیں۔ قیمت ہے۔ شائقین
فوراً طلب فرمائیں۔

قیمتی طبی کتابیں

از حکیم فضل الرحمن خاں پروفیسر طبیہ کالج دہلی

کتاب الباثولوجیا (علم الامراض) امراض کی حقیقت و
ماہیت اور انکے وہ اسباب و تغیرات جو ہزاروں لاشیں
چیرنے کے بعد خوردبین سے مشاہدہ کیے گئے یا علم الکیمیا کے
تجربات سے منکشف ہوئے ہیں۔ قیمت عاعہ

کتاب الکیمیا - جدید تحقیق کے مطابق عناصر کی حقیقت
انکے خواص اور انکے مرکبات
کا بیان۔ مرکبات کی تحلیل اجزائی
کے طریقے، دھاتوں سے نمک اور
کشتے بنانے کی ترکیبیں غرضکہ علم
کیمیائے جدید کے اصول، تجربے اور
عمل سب کی وضاحت درج ہے۔ عاعہ

تشخیص علمی - مع مطب یونانی و
ڈاکٹری تشخیص علمی کے اصول اور جدید
طریقے۔ معجون و جوارش وغیرہ کے نسخے
مسیح الملک کے خاندان اور بنگلہ کے
کے قابل فخر ڈاکٹروں کے نسخے اور
ہندوستان کے ہسپتالوں کے مجرب نسخے۔ قیمت عاعہ

اردو ترجمہ علاج الامراض - یہ مسیح الملک کے جد امجد
حکیم شریف خاں کی بیاض کا منتخب مجموعہ ہے جس میں
مسیح الملک کے خاندان کے تمام ممتاز اطبا کے تجربات اور
اس خاندان کے ممتاز مخصوص، اور کامیاب اصول و نکات
و اسرار علاج درج ہیں۔ قیمت سے

منیول آف تھراپوٹکس اردو - ڈاکٹر ہوتے جیسے تجربات
و تحقیقات کی بدولت یورپ اور امریکہ میں خاص وقعت ہے اور یہ انکی
طریق علاج کے متعلق یہ انکی قابل قدر کتاب ہے۔ [illegible]

علم القابلہ (با تصویر) یعنی علم زچہ و بچہ جسمیں حمل، حاملہ، وضع
حمل، زچہ بچہ کے امراض و حالات، اور انکے علاج ڈاکٹری کی
مستند اور جدید کتابوں سے منتخب کیے گئے ہیں۔ آسانی فہم کے
لیے تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ اپنے فن میں بے مثل کتاب ہے۔ عاعہ

ملنے کا پتہ - الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر (۱) جلد ۳ جنوری سنہ ۱۹۳۰ء

اُدباء و ادبیاتِ اُردو

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را

ہر تنزل کو ترقی اور عروج کے لیے زوال ایک ضروری چیز ہے، اُردو زبان کے لیے بھی ایک زمانہ ایسا ہوگیا ہے کہ اس کی بنیاد پڑتے ہی امراء و ارکان سلطنت اسکو ایسی حقیر نظرے دیکھتے تھے کہ شاید ایک معمولی آدمی پر بھی ایسی تیکھی اور ترچھی نگاہیں نہ ۲۰ پڑتی ہونگی۔ مُنہ لگانا تو درکنار، باریابی کی درخواست سنتے ہی انکے غضب آلود تیور ایسے بدل جاتے تھے کہ جو ایک سخت نفرت کا اظہار انکے بشرے سے ظاہر ہوکر دلی تنفر کا پتہ دیتے تھے۔ یعنی اپنی دیسی زبانوں کے پاس سے نکل جانے کے وہ ذرا بھی روادار نہ تھے۔ یہاں تک کہ عام بازاری اور لشکری زبان سمجھ کر اسے روزمرہ کے خط و کتابت میں اپنا محرم و مساز بنانا گوارا نہ کیا جاتا تھا۔

جس کی نسبت تاریخی واقعات سے علیحدہ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اُردو چونکہ بہت سی زبانوں کا مجموعہ اور مخزن ہے، اسی وجہ سے کیا عجب کہ اپنا ایک بڑا کنبہ رکھنے کی بنا پر اسکو لشکری زبان سے نامزد کردیا ہو اور اس نام کے اثر نے اس کی چلبلی طبیعت کو دوسری پر فتح و ظفر پانے کے لیے معرکہ ادب میں بھی اپنے سپاہیانہ کرتب کا وہا منوانے سے باز نہ رکھا کہ جو اُردو ہی

شاہجہانی زبان کا کام تھا - مگر اپنے خیال کے برعکس تاریخ کی پیروی کرنے پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کون
جانتا تھا کہ ایسی ناقدری اور ذلت و خواری کے سامنے ایک زمانہ اُس کی کامیابی کا ایسا آئیگا
کہ جس قدر اس سے نفرت اور دُوری اختیار کیجائیگی ویسی ہی نسلاً بعد نسلٍ اسکی ایسی قدر
کیجائیگی کہ جس کی کسی طرح سے بھی اُمید اسکے مخالفین سے نہیں پائی جاتی تھی - سچ ہے ؎

تا صد ہزار خار نمی روید از زمین ... از گلبنے گلے بہ گلستاں نمی رسد

اسکی پیدائش اور ہندو مسلمانوں کا اتفاق

اگر ہم اُردو زبان کا فوٹو کھینچنے کھڑے ہوں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں
کے قدم رکھنے کے بعد اردو زبان کا زمانۂ جنین ہندو مسلمانوں کی یکدلی و اتفاق کا ایک
ایسا سچا ثبوت ہے جس سے ہمکو ایک دوسرے کے میل جول، ہمدردی و محبت کا ضرور پتہ ملتا ہے۔
جس کی وجہ سے مسلمان فاتحین کی عربی و فارسی زبانیں اُنکی بھاشا زبانوں سے ایسی مل جل گئیں کہ
اس گڈمڈ سے ایک نئی زبان کا جنم ہوا، جسکا نام پردۂ زنگی کے اُٹھنے پر شاہجہاں کی زمانۂ سلطنت
میں اُردو رکھکر دلّی میں ایک بازار اُردوی معلّی کے نام سے تقریب عقیقہ کی یادگار میں
آباد کیا گیا -

اے دیکھ طفلی میں کہتی تھی دایہ ... لڑکا طرحدار پیدا ہوا ہے

اکبر بن ہمایوں اور اُسکے اکلوتے بیٹے جہانگیر نے محل میں دخل دیکر اس نومولود کی پرورش
و سرپرستی کا سامان کیا ہی تھا کہ جو منہ لگاتے چل بسے - البتہ صاحبقران ثانی شاہجہاں کے سایۂ ہمایوں
[illegible] میں گو اس نے بہت کچھ ہوش سنبھال لیا تھا لیکن جن سپاہیوں کی بارکوں میں اسکی پرورش ہو رہی
تھی وہ خود الجھن میں پڑے تھے، کیونکہ شاہجہاں کے چاروں بیٹوں میں جو اپنے باپ کی کمال محبت سے
اپنے اپنے صوبوں میں حکمران تھے آپس میں بڑی دشمنی ہو گئی تھی - باوجود ان جھنجھٹوں کے شاہجہاں ابتداء ہی
سے اپنے دادا اکبر کی طرح ہندو مسلمانوں کو ایک نظر سے دیکھتا تھا، اور اس طریقہ سے اُردو زبان کو
جلد عالم میں شہرت دینے اور ہر دلعزیز بنانے کا سامان کرتا رہا - دربار اور اہل دربار کے طرز آزاد کے ساتھ
زبان کی صفائی کا خیال رکھتا تھا، گلی کوچوں میں سب قسم کے پیشہ وروں کا مختلف آوازوں کے
ساتھ گشت لگانا کہ جو ہر شہر میں اب بھی دیکھا جاتا ہے، اسی بادشاہ کی ایجاد ہے - واقعی اس تدبیر
سے غریبوں کے رنج تکلیف کے علاوہ اُردو زبان ہی کی ترقی مقصود تھی - اگر عالمگیر اُسے قبل از
وقت نظربند نہ کرتا تو یقینی اُردو زبان اسی کے عہد میں منزل ترقی کو بہت جلد طے کر لیتی!

گر جب اورنگ زیب عالمگیر اپنے بھائیوں سے لڑکر دلّی چھوڑ کر دکن پہونچا ہے تو شاہی فوج کے ساتھ امیر غریب، عالم فاضل سب ہی قسم کے لوگ چل کھڑے ہوے، جنکے ہمرکاب اس ہونہار ترقی کے پتلے اُردو نے بھی ملک دکن کی راہ لی۔ ؎

شاہی لشکر کے ساتھ رہ کر　　　گود وں میں پلا یہ نیک اختر

وہاں کی آب و ہوا اسکو ایسی راس آئی کہ اسکے بدن پر بوٹی چڑھنے کی امید بندھی۔ یہاں تک کہ ستارۂ اقبال نے جب بلندی کی طرف رخ کرنا شروع کیا اور مدتوں تک اسکا ذکر خیر زبانوں پر جاری رہا تو اس کی تقدیر سیدھی ہونے کے ساتھ ہی سعدی دکنی[۱] نے پہلے اُردو زبان میں ریختہ کے نام سے مستقل غزل کہی، جسکا مقطع یہ ہے ؎

غزل انگیختہ شیر و شکر آمیختہ　　　در ریختہ دُر ریختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

انکے بعد اور شعرا بھی اسی طرح کہتے گئے۔ گر جب عالمگیر کی فوج کا ملک دکن میں قیام ہوا تو ولی دکنی نے کہ جو سب میں بہت مشاق شاعر تھے بطور فارسی گویوں کے ایک دیوان مرتب کیا، کہ جو نہایت اعزاز کے ساتھ فوج شاہی میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے شعرائے فارسی نے بھی اس سے اپنی دلچسپی ظاہر کی، اور نعمت خاں عالی نے وقایع میں ہندی الفاظ استعمال کیے۔

لیکن دلّی میں اسوقت تک کوئی بھی اسکو منہ نہ لگاتا تھا۔ ہندو اپنی بھاکا، اور عرب و عجم اپنی عربی فارسی بولتے تھے۔ ہاں محلات یا بازاری عوام الناس میں البتہ اسکی گرم بازاری تھی، کہ اس اثنا میں اُسکے ستارۂ اقبال نے اس قدر عروج حاصل کیا کہ دلّی والوں کو بھی اُسکی شعاع کی جھلک سے چکاچوند لگنے لگی۔ یعنی ولی دکنی کا مرتب شدہ دیوان کسی طرح سے جب دلّی میں پہونچا تو یہاں کے لوگوں کو پہلے تو دیکھ کر حیرت سی ہوئی، پھر گل جدید لذیذ کی نئی ترکیب سے دلچسپی اور وابستگی ہونے لگی۔

اُسوقت کسی کو یکایک ترقی کے ساتھ اُسکی کامیابی کا پورا یقین دلانا اگر عجیب نہیں تو ایک تعجب خیز بات ضرور تھی، کیونکہ عربی و فارسی زبانوں کا مدرسوں اور دفتروں پر ایسا سکہ جما ہوا تھا کہ اُردو زبان کا دربونا کسی کے خیال میں بھی نہ آتا تھا۔ مگر اس نے اپنی خود رو اور آزاد زبان ہونے کی ادا اور اپنے طفلانہ خوش آیند حرکات و سکنات کی مقناطیسی قوت سے ولی دکنی کے ذریعہ اُس زمانہ

[۱] یہ در اصل ہمارے وطن کا [illegible] ہے [illegible] معلوم قطب سعدی ہی زیادہ صحیح ہے۔ ملاحظہ ہو اُردوئے قدیم مصنفہ مولوی شمس اللہ قادری۔

کے موزوں طبع اور شوخ طبیعت شاعروں کو کچھ ایسا اپنی طرف متوجہ کر لیا کہ اُنھیں اپنے شفقت
کے ہاتھ اسکے سر پر رکھنے پڑے اور اُنکی مانوس طبیعت نے اُنکو ایسا گرویدہ بنایا کہ قلمے، سخنے، قدمے،
درمے، ہر طرح سے اُسکی پرورش میں مصروف ہو کر اپنے فیضان صحبت کا نیا خلعت بدلنے کو تیار ہو گئے۔
غرضکہ اپنی روانیٔ طبع اور موزونیٔ طبیعت کی بدولت ہر وقت اس اُگے ہوئے پودے
کی آرائش و زیبائش کا خیال مد نظر رکھ کر ولی دکنی کی تقلید میں طرح طرح کے گُل بوٹے لگانے لگے اور
اپنی باریک بین نگاہوں سے وہ وہ صناعیاں پیدا کیں کہ اُنھیں کا حصہ ہو گئیں اور دوسروں کے لیے
تقلید کا سبق چھوڑ گئے۔

اس ہونہار پودے نے پرورش کے حقوق ہمیشہ مد نظر رکھ کر اپنی خدمت کرنے والوں کو بھی
ثمرہ دیا۔ یعنی اس نونہال چمن کے شگفتہ پھول اور گلستان سخن کے درختوں کے پھل بادِ صبا کی نازش
سے شاہی درباروں در خور پاتے ہی جب امرا و اراکین سلطنت کے مشام نازک کو اپنی مہکتی ہوئی
خوشبو سے فائدہ پہونچانے لگے اور اسکی شیرینی سے قوت ذائقہ کے لب بند ہونے لگے، تو اس
باغ کی باغبانی اور رکھوالی کرنے والے اور اسکی خوبیوں سے مدح و ثنا کے گلدستے قصائد کی صورت
میں پیش کرنے مراحم شاہانہ سے فیضیاب ہوتے۔ جب نظم کی دلکش شہرت نے نثر کو بھی اپنے
قدم بڑھانے کے حوصلے ہوئے، تو ایک زمانہ میں دونوں کی مجموعی قوت اور دلیرانہ فتح و ظفر کے
غلغلہ نے اُردو زبان کو بازاری سے خانگی اور عام سے خاص بنا کر عربی و فارسی زبانوں کے
اعضا میں کہ جو تمام مدرسوں اور سرکاری دفاتر میں اپنا قبضہ کیے ہوئے تھی کپکپی پیدا کر دی۔ بقول

آمد چمن میں کون سے رنگیں ادا کی ہے　　کھلی ہوئی ہوا جو نسیم و صبا کی ہے

سلطنت کے ساتھ ساتھ جب زبان کی بھی کایا پلٹ ہوئی اور شاہ عالم کی چشم روشن میں
دنیا تاریک یعنی نیل کی سلائی پھر گئی تو سلطنت دہلی کو بھی زوال ہوتا گیا۔ تمام اہل کمال دلی چھوڑ لکھنؤ
روانہ ہوئے، جہاں آصف الدولہ کی قدردانی سے یہ منزل مقصود کو پہونچے۔ آصف الدولہ کے
بعد سعادت علیخاں کا زمانہ آیا۔ اُنکے بعد غازی الدین حیدر مسند آرائے ریاست ہوئے اور کچھ دنوں
نوابی کرنے پر ۱۸۱۹ء میں لکھنؤ کے بادشاہ کہلائے۔

سرکار کمپنی کو بھی غازی الدین حیدر کے زمانہ میں بڑے بڑے جھگڑوں سے فراغت ہوئی اور
جب ہر طرح سے تسلط ہو کر بادشاہت کی صورت دونوں طرف بندھ گئی تب اس چلتے پرزے اُردو
نے بھی انگریزی عدالت میں اپنے قبضہ و دخل یابی حقیقت کی درخواست دے کر دوسری مروجہ زبانوں پر

نالش دائر کر ہی دی جس کے فیصلہ میں حکم لکھتے وقت آخر ہماری منصف مزاج سرکار انگلشیہ نے اسکی ہر دلعزیزی کی قدر کی اور ۱۸۳۵ء میں عربی و فارسی زبانوں کے کل حقوق اسکے وارث شرعی کو ترکہ میں وراثتاً عنایت فرماکر اسکی قدر دانی و عزت افزائی فرمائی اور تمام ہند کے دفتر حفاظت میں دیدیے گئے۔ پھر کیا تھا ؎

غنچوں کے منہ لگانے سے ایسی ہوا بندھی　　　چاروں طرف چمن میں حکومت صبا کی تھی

اُسوقت مذہبی پیشوا بھی اسکو شفقت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے، مذہبی کتابیں تصنیف و تالیف ہوئیں، قرآن کی تفسیر و ترجمے اُردو زبان میں لکھے گئے ؎

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا　　　آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

میرے خیال میں اُردو زبان کو سب سے پہلے شاعروں کا شکرگزار اور احسانمند ہونا چاہیے کہ جنکی کوشش، توجہ اور قدردانی سے اُردو زبان کہلائی۔ مگر ان شاعروں سے اُسکو اپنی اخلاقی تربیت نہ ہونے کی جو شکایت ہے وہ نہایت درست ہے۔ اور جسکی مثال بالکل اُس بچہ کی سی ہے جو لاڈ پیار میں پرورش پائے اور اپنی سچی تعلیم نہ ہونے کے بُرے نتائج حالتِ شعور میں دیکھ کر اپنے والدین کو اُسکے لیے الزام کا نشانہ بنائے۔ اسی طرح یہ شاعر لوگ بھی اس سے بری الذمہ نہیں ہوسکتے جنھوں نے اُردو کو علمی و اخلاقی خیالات سے دُور رکھکر عاشقانہ غزلیں، جھوٹی تعریفوں کے قصائد، ناپاک خیال کی مثنویاں لکھیں۔ جن کا خاکہ نثر لکھنے والوں نے اپنی تصنیفات میں اُتارا۔ بقول غالب ؎

غلطیہائے مضامیں مت پوچھ　　　لوگ نالہ کو رسا باندھتے ہیں

اور وہی سلسلہ بڑھتے بڑھتے ہمارے زمانہ کے ناول نویسوں کے شرمناک مذاق تک پہونچا ہے۔

شاید اس سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اُردو زبان کو ہندو اور مسلمان دونوں ایک نظر سے دیکھتے اور اسکی قدر کرتے تھے۔ اسی لیے اسکو دونوں قوموں کی مشترکہ زبان ہونے میں ہر طرح کا فخر حاصل تھا۔ مگر خدا جانے اسکی خوبی قسمت یا بدقسمتی سے ایک زمانہ کیوں ایسا آگیا کہ ہندو مسلمان کی دو پارٹیاں کانگریس اور کانفرنس کی صورت میں ہوگئیں اور ایسا غفلت کا پردہ پڑا کہ مخالفت کے نشہ میں آکر اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارنے کو تیار ہوگئے۔ اُردو بیچاری چلاتی رہی کہ ؎

کش خنجر مزن بر سینۂ من　　　تو ئی در دل مبادا بر تو آید

مگر اُسکی فریاد نقارخانہ میں طوطی کی آواز تھی، بھلا اُنکے کانوں تک پہونچتی ہی کیوں؟ اور اگر

پہونچی بھی تو انھوں نے کلیجے پر پتھر رکھکر اسکی دادرسی سے چشم پوشی کی اور اسکے قلع و قمع کرنے میں کوئی
دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔

مسلمانوں کی تو غیرت اور حمیت کے جوش پر اس مخالفت نے ایسا ٹھنڈا پانی ڈالا کہ اپنی
اپنی جگہ پر سرد ہو کر رہ گئے۔ اور زمانہ کے ہاتھوں وہ وقت بھی پہونچ گیا کہ فارسی کی طرح اُردو کی
ہندی، ناگری، کیتھی نے سرکاری دفتروں اور تجارتی کاروبار وغیرہ میں اپنا دخل و قبضہ کرلیا۔
بنگالہ اور بہار میں تو بالکل اسی کی سلطنت ہوگئی، مگر چارہ ہی کیا تھا ؎

سختی جھیلی کڑی اُٹھائی　　اُفتاد جو تھی پڑی اُٹھائی

ممالک متحدہ (آگرہ و اودھ پنجاب) میں بھی اسکے قدم اُکھڑنے ہی کو تھے کہ خدا نے اپنی مہربانی سے
مسلمانوں کی قوم میں ایک ایسا شخص اسکی حمایت میں کھڑا کر دیا کہ جس نے بالکل اپنی ذاتی اور صفاتی
کوشش سے اپنی قوم کو چونکایا اور اُنکے دلوں میں ہمدردی و ولولہ کا جوش پیدا کرکے جمہوری
کوشش سے اپنے کو سپر بنا کر مخالفین کے وار روکنے کو طیار ہوگیا جسکا نتیجہ اُردو زبان کے لیے اتنا
ضرور مفید ہو کر رہا کہ اسکی سرپرستی میں ہندوستان کے ممالک متحدہ میں اُردو زبان سے کسی کو نظر
چار کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

مگر حیف یہ کس کو خبر تھی کہ اسکے حامی سر سید احمد خاں مرحوم کا سایہ اسکے سر سے اُٹھتے ہی
ہندوستان کے اندر، مذکور الصدر حصوں پر بھی اُردو زبان کی زندگی میں انقلاب عظیم پیدا کر دیگا جو آخر
کسی کے روکے نہ رکیگا، مگر اُس مرحوم کی ہمخیال جماعت البتہ اس میں ایک نئی روح پھونک کر اسکے
قائم و دائم رکھنے میں ہر پہلو سے کوشش بلیغ کر چکی ہے اور اپنے ہمخیال کے پیرو ہو کر اس میں اخلاقی،
علمی، و شائستہ خیالات کے پودے لگا رہی، کہ جسکے لیے ہم کو ایسے حضرات کا تہ دل سے شکرگزار
و احسان مند رہنا چاہیے جن کی تصنیفات و تالیفات نے اسکو ملکی و علمی زبان کا خلعت عطا کیے بغیر نہ
نہ چھوڑا۔ سچ ہے ؎ عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد۔ یا یوں کہیے ؎

گلہاے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن　　اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

اس جماعت کے مصنفین میں خاص کر صاحبان ذیل کا ملک اور زبان پر بہت بڑا احسان ہے:-

(۱) شمس العلما جناب مولوی محمد حسین صاحب آزاد۔ آپ کی دیگر تصانیف سے علیحدہ ہو کر صرف
ایک ہی تالیف مسمی "آب حیات" کو لیجیے۔ جس میں مشاہیر شعراے اُردو کے سوانح عمری اور زبان
مذکور کی عہد بعہد ترقیوں اور اصلاحوں کا بیان پانچ سو صفحوں سے زیادہ پر اختتام پایا ہے اور مختلف

عہد کی پراگندہ کڑیوں کو جس احتیاط و صفائی سے جوڑا گیا ہے وہ بیشک اپنی آپ ہی نظیر ہیں، وہ آزاد ہی سی تیز طبیعت کا کام تھا کہ وہ انجام کر گئے - خود اپنی زبان سے خاتمۂ کتاب پر جو کچھ فرما گئے اُسے گویا اپنی نظروں سے دیکھ رہے تھے - واقعی کیا خوب فرماتے ہیں اور کس مزے سے ادا کرتے ہیں ملاحظہ ہو

"پانچواں دَور بھی ہو چکا، مگر سب سوگوار بیٹھے ہیں کہ دَور نہیں ہو چکا، ہندوستان کی پرانی ہمدم یعنی عاشقانہ شاعری ہو چکی، اور اس کی ترقی کا چشمہ بند ہوا، اور اہل مشاعرہ نوحہ خوانی کر رہے ہیں کہ اے صدر نشینو! تم چلے اور حُسن و عشق کے چرچے اپنے ساتھ لے چلے، کیونکہ متاعِ عشق کے بازار تھے تو تمہارے دَم سے تھے، نگارِ حُسن کے سنگار تھے تو تمہارے قلم سے - تمہیں قیس و کوہکن کے نام لینے والے تھے اور تمہیں لیلیٰ و مجنوں کے جوبن کو جلوہ دینے والے - لیکن اجسامِ فانی کی پرستش کرنے والے ہیں جو کہتے ہیں کہ تم گئے اور شاعرے ہو چلے - نہیں نہیں تمہاری تصنیفیں، تالیفیں، حکایتیں اور روایتیں جب تک موجود ہیں، تم آپ موجود ہو - تمہارے فخر کی دستاریں ایسے تحسین و آفرین کے پھولوں سے آبدار ہیں جو ہمیشہ لہلہاتے رہیں گے، اور گلے میں اُن سدا بہار پھولوں کے ہار ہیں جن تک کبھی خزاں کا ہاتھ نہ پہونچے گا -

حیاتِ دوام کا خدائی چشمہ جاری ہے، جسکے کنارے پر عہد بعہد پانچوں جلسے جمے ہوئے ہیں، آبحیات کا دَور چل رہا ہے، چشمہ کا پانی زمانے کے گزرنے کی تصویر کھینچتا ہے، اور موجیں ظاہری زندگی کو الوداع کہتی چلی جاتی ہیں، تمہارے جلسے اپنے اپنے عہد کی حالت خاموشی کی بولی میں بیان کر رہے ہیں، تمہارے مقالات و حالات اُس زمانے کی جیتی جاگتی، بولتی چالتی تصویریں ہیں - گویا بے زبان مورتیں مُنہ سے بول رہی ہیں - خیالی صورتیں اپنی چال ڈھال ایسی بے تکلف دکھا رہی ہیں کہ کوئی زندہ انسان اس طرح کھلے دل سے کام نہیں کرتا - تمہاری زندگی عجب لطف کی زندگی ہے - کوئی بُرا کہے تمہیں رنج نہیں، اچھا کہے تو خوشی نہیں - تمہیں کوئی آزار نہیں دے سکتا - تم سے کسی کو رنج نہیں پہونچ سکتا - اللہ اللہ امن وامان کی دنیا کے لوگ ہو کہ چُپ چاپ، آرام کے عالم میں بخت گزران کرتے ہو - تم میں آواز نہیں مگر رنگارنگ کی بولیاں بول رہے ہو - تم وہ ہو، کہ نہیں ہو، مگر ہو - مر گئے ہو، پھر بھی زندہ ہو - اے کاغذی خانقاہوں کے بسنے والو، تمہاری تصنیفات تمہارے آباد گھر ہیں، جب آنکھیں کھولتا ہوں، تم نقوش و حروف کے لباس پہنے، ہنستے بولتے، چلتے پھرتے نظر آتے ہو، اور ویسے ہی نظر آتے ہو جیسے کہ تھے - زمانہ سالہا سال کی مسافت دور نکل آیا اور سیکڑوں برس آگے بڑھا اور بڑھ جائے گا، مگر تم

اپنی جگہ بدستور قائم ہو، تمہارے اعمال و افعال کے پتلے تمہاری تصنیفیں ہیں، اُنکی زبانی آئندہ نسلوں سے اپنے دل کی باتیں کہتے رہو گے، نصیحتیں کرو گے سمجھاتے رہو گے، غمگین دلوں کو بہلاؤ گے، مردہ طبیعتوں میں جان ڈالو گے، مدھم آوازوں کو چمکاؤ گے، سوتے دلوں میں گدگدی کرو گے، خوشی کو اُداسی کرو گے، اُداسی کو خوشی کر دو گے۔

اے با اقبال گداؤ! اے شاہ نشان خاکسارو! تمہاری نیک نیتی اچھے وقت تمہیں لائی مگر افسوس کہ تمہاری شاعری نے بہت کم عمر پائی۔ قسمت نے تمہیں اچھے سامان اور اچھے قدردان دیے۔ جنکی بدولت جوہر طبعی اور جوش اصلی کو اپنے اور اپنے شوق کے پورا کرنے کے سامان ملے۔ اب نہ وہ سامان ہونگے نہ ویسے قدردان ہونگے۔ نہ کوئی اُس شاخ کو ہرا رکھ سکے گا، نہ تم سے بڑھ کر اُس میں پھل پھول لگا سکے گا۔ ہاں تمہاری لکیروں کے فقیر تمہارے ہی ہجر و وصل اور خط و خال کے مضمون لیں گے، اُنھی لفظوں کو اُلٹیں پلٹیں گے۔ اور تمہارے چبائے ہوئے نوالوں کو منہ میں پھراتے رہیں گے۔

تم نے شہرتِ عام اور بقائے دوام کے ایسے عالیشان محل تعمیر کیے ہیں کہ صدہا سال کی مسافت سے دکھائی دیتے رہیں گے۔ وہ فلک کے صدموں اور انقلاب کے طوفانوں کو خاطر میں نہیں لاتے، اور زمانے کے زلزلوں کو ہنس کر کہتے ہیں کہ بھلا آؤ تو سہی!

اگرچہ زیادہ تر عمارتیں تمہارے حسن و عشق کے جلوس کے لیے ہیں مگر اس میں بھی تم نے ایسے سامان اور مصالح لگا دیے ہیں کہ آئندہ نسلیں جس غرض سے چاہیں گی عمارتیں بنائیں گی اور تمہاری صنعتوں سے بہت کچھ مدد پائیں گی۔ جن پتھروں کو تم نے صنعت کاری اور گلکاری سے تراش کر فقط خوشنمائی کے لیے لگایا تھا، ہم اُسے وہاں سے نکال لینگے، شکریہ کے ساتھ آنکھوں سے لگائیں گے، اور اُس سے کسی ایسی محراب کو زینت دینگے جو اپنی مضبوطی سے ایک ملکی ایوان کو استحکام دے، اور دلوں کو خوشنمائی سے شگفتہ کرے کیونکہ تمہاری لفظوں کی عمدہ تراشیں اور نئی پسندیدہ ترکیبیں، استعارے اور تشبیہیں اگرچہ عاشقانہ مضامین میں ہیں، پھر بھی اگر ہم سلیقہ اور امتیاز سے کام میں لائینگے تو علوم، فنون، تاریخ وغیرہ عام مطالب میں ہمارے اعلےٰ مقاصد اور انداز بیان کے لیے عمدہ معاون اور کار آمد ہوں گے۔ اے ہمارے رہنماؤ تم کیسے مبارک قدموں سے چلے تھے، اور کیسے برکت والے ہاتھوں سے رستہ میں چراغ رکھتے گئے تھے، کہ جہاں تک زمانہ آگے بڑھتا ہے، تمہارے چراغوں سے چراغ جلتے چلے جاتے ہیں، اور جہاں تک ہم آگے

آگے جلتے ہیں تمہاری ہی روشنی میں جاتے ہیں۔ ذرا اُن برکت والے قدموں کو آگے بڑھاؤ کہ میں آنکھوں سے لگاؤں۔ اپنا مبارک ہاتھ میرے سر پر رکھو اور میرے سلام کا تحفہ قبول کرو۔"

جب انصاف پسند ناظرین ذرا غور و تامل سے آزاد مرحوم کی تحریر کو ملاحظہ فرمائیں گے اور موجودہ اُردو زبان اور اُردو شاعری پر ایک تنقیدی نظر ڈالیں گے تو بلا غور و فکر ان چند سطروں کی تصدیق کیے بغیر نہیں رہ سکتے اور بیساختہ سلف کے کارناموں کی داد دیتے رہیں گے۔

اسی طرح حضرت آزاد نے سخندان فارس، قند پارسی، نصیحت کا کرن پھول، دیوانِ ذوق، نظم آزاد، نیرنگِ خیال، دربارِ اکبری وغیرہ میں اپنے زورِ قلم کی کچھ اس طرح پر روانی دکھائی ہے کہ بیساختہ مُنہ سے سبحان اللہ نکل جاتا ہے۔

(۲) اسی جماعت کے **شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد مرحوم** جیسا ادیب اُردو زبان کا کب میسر آتا ہے، جس کی مرأۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت، ایامیٰ، رویائے صادقہ، منتخب الحکایات، وغیرہ تالیف و تصنیف نے ایک عالم کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا ہے۔ خصوصاً ترجمۃ القرآن نے وہ قبولیت حاصل کی کہ جس سے اُنھیں بقائے دوام کی شہرت نصیب ہوئی۔ ان کی اکثر نظمیں اور مفصل حالات انکی سوانح کے دیکھنے سے روشن ہونگے کہ یہ انسان کس دل و دماغ کے ساتھ عالم وجود میں آیا تھا۔ اللہ اللہ! خدا بخشے ہزاروں خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

(۳) اسی عہد کے **شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی** کے روشن کارناموں کو فراموش کر جاؤں تو یہ سخت بے رحمی ہوگی۔ کیونکہ مولانا مرحوم ایک اعلیٰ درجہ کے نثار اور اُردو زبان کے ادیب و بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کی شاعری صرف گل و بلبل یا تعشق کے رنگ تک محدود نہ رہی۔ یہ اپنے وقت کے سعدیٔ ثانی تھے۔ انکا مشہور مسدس اور مناجاتِ بیوہ، حیاتِ جاوید، حیاتِ سعدی، حقوقِ اولاد، دیوانِ حالی وغیرہ اعلیٰ سے اعلیٰ ادبی نمونے پیش کرتے ہیں۔

(۴) ان کے معاصر **شمس العلماء مولوی محمد شبلی نعمانی** کہ جو اپنی قابلیت علمی سے عربی فارسی کے مسلم الثبوت عالم، مشہور آفاق تھے، آپ علمی مشاغل سے دلچسپی رکھنے والوں اور اُردو زبان کے مخصوص ہمدردوں میں سے ایک تھے، اور اسکو علمی زبان بنانے کے لیے دل سے کوشاں ہو کر مختلف زبانوں کے علوم کی کارآمد کتابیں قوم کے لائق و فائق علم دوست و اہل قلم حضرات کے ذریعہ ترجمہ کراتے رہے جسکے لیے ایک خاص انجمن حیدرآباد دکن میں **ترقی اُردو** کے نام سے

نفیس کی قائم کی ہوئی ہے۔ اسکے سکریٹری بھی خود ہی رہے اور نہایت ہمدردی، توجہ اور دلسوزی سے اپنے فرضِ منصبی کو ادا فرماتے رہے۔ آپکی تاریخی نظمیں، تاریخی انکشافات میں کیا کچھ امتیاز رکھتی ہیں آپکی وافی قابلیت نے محققانہ تحقیقات کو اخیر دم تک اپنا فرض سمجھا۔ علاوہ کثیر التصانیف ہونے کے اخیر عمر میں سیرۃ نبوی کے ساتھ وہ تعلق رکھا کہ سیرۃ سیرۃ کہتے روح اعلیٰ علیین میں پہونچی۔ مکاتیب شبلی حصہ دوم میں جناب ایم مہدی حسن صاحب نے اس موضوع پر ایک دلچسپ تحریر لکھی ہے وہ یہ کہ

"تعلقات کی تدریجی رفتار کے ساتھ تحریر کا لب ولہجہ بھی بدلتا گیا ہے، جس طرح مولانا کی تقریر برجستہ اور حشو وزوائد سے پاک ہوتی تھی، پچھلے تذکرے اس طرح کرتے تھے کہ یاران کہن کی بزم سے اٹھکر ابھی آئے ہیں۔ اور باتوں باتوں میں سب کچھ یوں کہہ جاتے تھے گویا واقعات سُنے سنائے نہیں، آنکھوں دیکھے ہیں۔ یہ مادۂ اجتہادی جسے جان ادب کہیے انکی وسیع معلومات کے ساتھ انکی تقریر کا خاصۂ امتیازی تھا۔ انکی شستہ رفتہ اور نہایت پاکیزہ تحریروں میں یہ رنگ اور نکھر جاتا تھا۔ شرابِ محبت تھی جو کھنچ کھنچاکر دو آتشہ ہو جاتی تھی۔ بچ کی تحریروں میں چونکہ اہتمام کو دخل نہیں ہوتا، یعنی اظہار خیال میں یہ صنعت گری طبع کی جگہ صرف آمد جذبات ہوتی ہے۔ اس لیے لٹریچر کا یہ ایک ایسا امتیازی حصہ ہے جو لکھنے والے کے مرتبہ انشا پردازی کی صحیح غمازی کرتا ہے، اچھے اچھے بولنے والوں، بعض چوٹی کے شاعروں کو دیکھا کہ دو سطریں سیدھی سادی نہیں لکھ سکتے، مولانا میں یہ خاص جامعیت تھی کہ جس طرح بولتے تھے اُسی طرح لکھتے تھے اور نہایت خوشخط لکھتے تھے۔" الخ

سچ ہے، حسن کہیں ہو، کسی حیثیت سے ہو، فطرت کا وہ پاکیزہ مظہر ہے جس سے حافظ کی شراب معرفت کی طرح قطع نظر نہیں کی جا سکتی۔ مولانا موصوف ادبی حیثیت سے اسکا صحیح مذاق رکھتے تھے۔ عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ انکی حکیمانہ شوخیاں سرمایۂ ادب ہوتی تھیں۔

ایک جگہ شاعری کی حقیقت پر مولانا کا ایک مضمون نظر سے گزرا جو بلا تکلف اس طرح پر ادا کیا گیا ہے، کہ

"کسی چیز کا بیان جب اس طرح کیا جائے کہ اُس شے کی اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے تو اُس پر شعر کی تعریف صادق آئے گی۔ دریا کی روانی، جنگل کا سناٹا، باغ کی شادابی، سبزہ کی لہک، خوشبو کی لپٹ، نسیم کے جھونکے، دھوپ کی شدت، گرمی کی تپش، جاڑوں کی ٹھنڈ،

صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی، یا رنج، غم، غیظ، غضب، جوش، محبت، افسوس، حسرت
خوشی، ان اشیاء کا اس طرح بیان کیا جائے کہ انکی صورت آنکھوں میں پھر جائے، یا وہی اثر
دل پر طاری ہو جائے، یہی شاعری ہے - ایک اور پیرایہ میں شاعری کی تعریف کیجا سکتی ہے
اور وہ بھی ارسطو کی تعریف کے قریب قریب ہے، دنیا میں جس قدر قدرت کے مظاہر ہیں،
خواہ مادی ہوں مثلاً پہاڑ، بیابان، باغ، دریا، وغیرہ خواہ غیر مادی مثلاً وصل، ہجر، تحسین،
نفرین، ان سب سے دل پر اثر پڑتا ہے اور ہر شخص کے دل پر پڑتا ہے، لیکن اثر کے مراتب
متفاوت ہوتے ہیں، بعض اشخاص پر کم بعض پر زیادہ، اور بعض پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔
جو شخص ان مظاہر قدرت سے عام لوگوں کی نسبت زیادہ متاثر ہو اور اس اثر کو بعینہ ادا
بھی کر سکتا ہو وہی شاعر ہے"

ذیل کی سطور سے پتہ چلتا ہے کہ آپ معمولی واقعات سے عبرت کے بڑے بڑے سبق لیا کرتے اور
تنقید و تحقیق کے جوہر آپ کی فطرت میں داخل تھے - ملاحظہ ہو - فرماتے ہیں :-

۷ مئی ۱۸۹۲ء کو جہاز عدن پہنچا اور کنارے سے کسی قدر فاصلہ پر لنگر انداز ہوا - عدن میں بڑی
دلچسپی یہ ہے کہ سمالی قوم کے بہت سے لڑکے ڈونگیوں پر سوار جہاز کے قریب آتے ہیں اور
جہاز والوں سے انعام لینے کے لیے عجیب عجیب مبتذل حرکتیں کرتے ہیں - کچھ ناچتے گاتے ہیں
کچھ آپس میں مل کر چند بے معنی الفاظ کہتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں - بڑا کمال یہ ہے کہ لوگ
دوانی، چوانی، پیسے، جو کچھ انکو انعام دینا چاہتے ہیں، سمندر میں پھینکدیتے ہیں اور وہ غوطہ
مار کر نکال لاتے ہیں - اکثر انگریز اس تماشے میں مصروف تھے اور آرنلڈ (جو آپ کے ساتھی
تھے) کو بھی اس میں مزا آتا تھا، لیکن میری کچھ اور حالت تھی - چونکہ غلطی سے میرا یہ خیال
تھا کہ یہاں عموماً عرب آباد ہیں، اس لیے یہ طبعی بات تھی کہ میں انکو عزت اور محبت کی نظر
سے دیکھتا، لیکن وہ انعام لینے کے لیے ایسے مبتذل، ناموزوں اور حقیر حرکات کرتے تھے
کہ کسی طرح طبیعت کو گوارا نہیں ہو سکتا تھا - عبرت ہوتی تھی کہ عرب کی اب یہ حالت ہے
کہ غیروں کے سامنے اس قسم کی حرکات سے انکو شرم نہیں آتی - ان خیالات سے بے اختیار
میرا دل بھر آتا تھا، یہاں تک کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بے اختیار زبان سے
نکلا کہ "قم یا عمر"، آرنلڈ پاس تھے میرے تغیر حالت پر انکو خیال ہوا - میں نے دل کی
کیفیت اور اسکا سبب بیان کیا - ایک بار آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور چپ ہو رہے۔

شہر میں جاکر جب میں نے تحقیق کی اور تمام باتوں سے ثابت ہوگیا کہ سمالی قوم عرب نہیں ہے تو
مجھکو کسی قدر تسکین ہوئی !" الخ
ضعف، اُس پر سفر کا عالم، کیونکہ ابھی بستر علالت سے اُٹھے تھے، تاہم نظری جوہر تحقیق وتنقید کے
بغیر تخیت نہ بیٹھا، اور جب سمالی قوم کی حقیقت دریافت کرلی تب ہی تو چین آیا۔ آپ کی ایک
بھی تالیف وتصنیف علمی مباحث وتاریخی واقعات وتحقیقات وتنقیدات سے خالی نہیں لکھی
آپ جیسا بلند پایہ مورخ، شاعر، نثار شاید ہی دنیائے اُردو کو میسر آئے ۔

زبانِ اُردو میں پند و نصائح اور سوانح عمریاں لکھنے کی بنیاد مولانا الطاف حسین حالی ہی
کے ہاتھوں پڑی ۔ حیاتِ جاوید جیسی مبسوط کتاب، مسدس سی مقبول نظم جسکے متعلق خود فرماتے ہیں:
" قوم کے لیے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے، جس میں آکر وہ اپنے خط وخال
دیکھ سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں، کہ ہم کون تھے اور کیا ہوگئے ۔ اگرچہ اس جانکاہ نظم میں جیسی
دشواریاں لکھنے والے ہی کا دل داغ خوب جانتا ہے، بیان کا حق نہ مجھ سے ادا ہوا ہے
نہ ہو سکتا تھا ۔ مگر شکر ہے کہ جس قدر ہوگیا اتنی بھی امید نہ تھی ۔ ہمارے ملک کے اہل ذوق
بلا شبہ اس روکھی پھیکی سیدھی سادھی نظم کو پسند نہ کرینگے، کیونکہ اس میں یا تاریخی واقعات
ہیں یا چند آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ ہے ۔ یا جو آجکل کی حالت ہے اُسکا سچیح صحیح نقشہ کھینچا
ہے ۔ نہ کہیں نازک خیالی، نہ رنگیں بیانی، نہ مبالغہ کی چاٹ ہے نہ تکلف کی چاشنی ہے،
غرض کوئی بات ایسی نہیں ہے جس سے اہل وطن کے کان مانوس اور مذاق آشنا ہوں اور
کوئی کرشمہ ایسا نہیں ہے کہ لاعین رایت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر ۔ گویا اہلِ
دہلی و لکھنؤ کی دعوت میں ایک ایسا دسترخوان چُنا گیا ہے، جس میں اُبالی کھچڑی اور
بے مرچ سالن کے سوا کچھ نہیں ۔ مگر اس نظم کی ترتیب مزے لینے اور واہ واہ سننے کے لیے
نہیں کی گئی، بلکہ عزیزوں اور دوستوں کو غیرت وشرم دلانے کے لیے کی گئی ہے ۔ اگر دیکھیں اور
پڑھیں اور سمجھیں تو ان کا احسان ہے، ورنہ کچھ شکایت نہیں"۔
اردو دنیا میں آپ کی نثر کا اکثر حصہ خشک مضامین پر مشتمل ہے تاہم اپنی شگفتگی و دلآویزی سے مقبول خاص
و عام ہی نہیں بلکہ آئینہ عبرت ہو کر رہیں ۔ اسی مسدس میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ایک قوم کے سچے
خیر خواہ نے مجھ سے کہا ! اور کیوں میں نے اسکی بنا ڈالی اور اُسے تیار بھی کرلیا، ملاحظہ ہو :-

"قوم کی حالت تباہ ہے، عزیز ذلیل ہوگئے ہیں، شریف خاک میں مل گئے ہیں، علم کا خاتمہ ہوچکا ہے، دین کا صرف نام باقی ہے، افلاس کی گھر گھر پکار ہے، پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے، اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے، رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے، جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ امرا جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہونچا سکتے ہیں غافل اور بے پرواہ ہیں، علما جنکو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے محض ناواقف ہیں، ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے سو بہتر ہے۔ ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں۔ اور ساری ناؤ کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہے۔ ہرچند لوگ بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور لکھ رہے ہیں، مگر نظم انسان کو بالطبع مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا تو یہ [illegible] موروثی حصہ ہے۔ قوم کو بیدار کرنے کے لیے اب تک کسی نے نہیں لکھا۔ اگرچہ [illegible] سے کیا ہوا، جو اس تدبیر سے ہوگا۔ مگر ایسے نازک وقتوں میں انسان کے دل پر ہمیشہ دو طرح کے خیالات گزرتے رہے ہیں، ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے، دوسرے یہ کہ ہم کو کرنا چاہیے۔ پہلے خیال کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوا کہ کچھ نہ ہوا، اور دوسرے خیال سے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر ہوئے ؎

ز فیض رست منشین از کشاکش ناامید اینجا　　برنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید اینجا

وہو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمتہ۔ ہرچند اس حکم کی بجا آوری مشکل تھی اور اس خدمت کا بوجھ اٹھانا دشوار تھا، مگر ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی، دل سے نکلی تھی دل ہی میں جا کر ٹھہری۔ برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور باسی کڑھی میں ابال آیا۔ افسردہ دل اور بوسیدہ دماغ جو امراض کے متواتر حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے انھیں سے کام لینا شروع کیا، اور ایک مسدس کی بنیاد ڈالی۔ دنیا کے مکروہات سے فرصت بہت کم ملی اور بیماریوں کے ہجوم سے اطمینان کبھی نصیب نہ ہوا، مگر بہرحال یہ دھن لگی رہی۔ بارے الحمد للہ کہ بہت سی دقتوں کے بعد ایک ٹوٹی پھوٹی نظم اس عاجز بندہ کی بساط کے موافق تیار ہو گئی اور ناصح مشفق سے شرمندہ ہونا نہ پڑا۔ الخ

(باقی آئندہ)　　سید شاہ انیس احمد قادری رزاقی

کپتان آزاد

اردو ادب کے یورپین محسنین میں کپتان آزاد کا نام خصوصیت سے لیا جا سکتا ہے۔ آپ کا نام الگزنڈر ہیڈرلی تھا۔ نسلاً آپ فرانسیسی تھے۔ آپ کے والد مسٹر جیمس ہیڈرلی کو عروس البلاد دہلی کی دلچسپیوں نے اپنا گرویدہ بنا لیا، اور بالآخر انھوں نے وہیں اقامت اختیار کی۔ لیکن آزاد عالم شباب میں اکبر آباد کو مراجعت کر گئے تھے۔ صاحب "خمخانۂ جاوید" کی تحقیقات کے مطابق آپ کی والدہ ایک مسلمان شریف زادی تھیں۔ اور آپ کی پرورش اہل اسلام کے طریقوں پر ہوئی۔ آج کل اس قسم کی شادیاں عنقا کا حکم رکھتی ہیں۔ یہ تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ شوہر ہندی مسلمان ہے اور بیوی کوئی یورپین عیسائی خاتون، لیکن اسکا عکس مشاہدہ میں نہیں آتا۔ اسلیے یہ باور کرنے میں تامل ہوتا ہے کہ ہیڈرلی کی والدہ کوئی شریف مسلمان خاتون ہوں۔ لیکن محض یہی وجہ اس خیال کے رد کر دینے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی کیونکہ اسکی تائید دیوان سے بھی ہوتی ہے جس میں "خاں صاحب محمد حیات خاں ماموں خود" اور "نظام الدین خاں برادر خود" کی مدح میں قصائد موجود ہیں۔ کلام کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ہیڈرلی کو مسلمانوں کے طرز معاشرت سے واقفیت تامہ حاصل تھی۔ ملاحظہ فرمائیے

چہلم کو عیادت کے لیے وہ مری آئے — آزاد ٹھکانا بھی ہے اس بے خبری کا؟

صبح تک سب جاگتے ہیں تشکو سو سکتا ہے کون — نالۂ پرشور سے میرے ہے گھر گھر رت جگا

پہلے شعر کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ چہلم کی رسم سے واقفیت ہونا کوئی خاص بات نہیں، لیکن یہ امر قرین قیاس نہیں ہے کہ ایک فرانسیسی شخص کو رت جگے کی رسم سے واقفیت ہو جائے جب تک کہ اس کو ملکی سوسائٹی سے کوئی خاص تعلق نہ ہو۔

ہیڈرلی ایک باوضع، زندہ دل، بذلہ سنج، یار باش، اور ہمدرد نوجوان تھے۔ علاوہ شاعری کے فن طب میں بھی دستگاہ بہم پہونچائی تھی۔ علاج کرنے کے ساتھ ہی مریضوں کو دوا بھی اپنے پاس سے مفت دیتے تھے۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ کے بعد تلاش معاش کی ضرورت پیش آئی۔ ملازمت بھی انکے شایان شان ریاست الور میں مل گئی، جہاں آپ فوج کے کپتان مقرر ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے الور کے علاوہ ریاست جھجر سے بھی آپ کا تعلق رہا۔ فرماں روائے جھجر کی شان میں ایک قصیدہ آپ سے یادگار ہے۔ اسکے علاوہ بعض اشعار میں بھی جھجر کا ذکر ہے۔ مہاراجہ جیاجی راؤ سندھیا کی مدح

میں بھی ایک قصیدہ آپ کی تصنیف سے ہے۔ لیکن یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کو سندھیا کے دربار سے کبھی واسطہ رہا تھا یا نہیں۔

ہیڈرلی کو آغاز شباب ہی سے شعرگوئی کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ آپ نے نواب زین العابدین خاں عارف کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مرزا غالب سے بھی بذریعہ مراسلت و مکاتبت اصلاح لی تھی۔ لیکن منشی عبدالغفور خاں نساخ (صاحب "سخن شعرا") اور لالہ سری رام (مؤلف "خمخانۂ جاوید") دونوں ہیڈرلی کو عارف کا شاگرد بتاتے ہیں۔ آپ کا تخلص آزاد تھا مگر گاہے گاہے اپنے نام کے جزوِ اول "الک" کو بھی تخلص کی جگہ باندھ لیا کرتے تھے۔

آپ کے بھائی مسٹر طامس ہیڈرلی نے جو ریاست بھرتپور میں ڈپٹی کلکٹر تھے، آپ کا دیوان مرتب کر کے ۱۸۶۳ء میں مطبع احمدی آگرہ سے شائع کرایا۔ جس میں ایک تمہید طامس ہیڈرلی کی لکھی ہوئی اور ایک دیباچہ جو منشی شوکت علی (یکے از احباب آزاد) کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے شامل ہیں۔ یہ دیوان اب بہت کمیاب ہے۔ شاذ و نادر خوش نصیب افراد کے پاس اُسکے نسخے موجود ہوں تو ہوں۔

افسوس کہ آزاد کی عمر نے وفا نہ کی، اور ۷ رجولائی ۱۸۶۱ء کو جبکہ اُسنے دورِ حیات کی صرف ۳۲ بتیس بہاریں دیکھی تھیں، اس باکمال نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

آزاد نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ چنانچہ دیوان میں مسدس، قصائد، قطعات، غزلیں اور تاریخیں سب شامل ہیں۔ اور ہر صنف میں آزاد کی طبع رسا کے جوہر نمایاں ہیں۔ لیکن میں اسوقت دوسری اصناف سے قطع نظر کر کے محض اُنکی غزلوں سے بحث کروں گا۔ ممکن ہے کہ آزاد بزمِ سخن کے صدر نشینوں میں جگہ نہ حاصل کر سکیں، لیکن پھر بھی عام سطح سے بہت بلند ہیں۔ آزاد نے بعض مشہور شعرا کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں، لیکن اُنکا مقصد اساتذہ کے کلام سے مقابلہ کرنا نہیں ہے، اور نہ وہ اس غرض سے پڑھی جانی چاہییں۔ اساتذہ کے کلام سے قطع نظر کر کے دیکھیے کہ ایک ایسا شخص جسکے لیے اُردو ایک اکتسابی زبان کی حیثیت رکھتی ہے، کتنے صاف اور پُرلطف شعر کہہ سکتا ہے۔

اُردو شاعری کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ شاید ہی کوئی شاعر ایسا گزرا ہو جسکے یہاں عامیانہ خیالات اور رکیک جذبات نہ پائے جاتے ہوں۔ اُردو نظم کے باوا آدم ولی سے لیکر فخر متاخرین مرزا داغ تک تقریباً سب کے سب اس مرض میں مبتلا ہیں۔ اور خدائے سخن میر تقی نے تو اس

نوعیت کی نمایاں کر دی ہے۔ ہمارے نزدیک ہزار خوبیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ آزاد کا دامن اس قسم
کے بیہودہ رنگوں سے پاک ہے۔ اُسکے یہاں آپ ایسے اشعار نہ پائیں گے جن کو سن کر ذوق سلیم کانوں
میں انگلیاں دے لے۔

بعض حضرات کے نزدیک تصوف کی چاشنی اور فلسفہ و حکمت کے حقائق اگر شعر میں نہ پائے
جائیں تو وہ شعر نہیں۔ آزاد ایسے لوگوں سے متفق نہیں اور نہ اُن کا دیوان اس قسم کے ناظرین کے
لیے کوئی سرمایۂ لطف مہیا کر سکتا ہے۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ غزل اس قسم کی چیزوں کی متحمل نہیں
ہو سکتی۔ خود غالب جیسے قادر الکلام شاعر کو اس راستہ کی دقتوں سے متاثر ہو کر کہنا پڑا تھا،

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل　　　کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

آزاد کے نزدیک "غزل" کے معنی ہیں "سخن با معشوق گفتن"۔ اور وہ اسکا سختی سے پابند ہے۔ وہ
محض اپنے جذبات کا اظہار صفحۂ قرطاس پر کرتا جاتا ہے اور بس۔ اُسکے اشعار "واردات قلب
کی ایک مختصر روداد" ہوتے ہیں! اور یہی حقیقت شاعری ہے۔ بقول آزاد

شاعری کیا ہے اک احساس تو ذہین وجود　　　دل کے جذبات کا اظہار بہ تائید قیود

ایسے اشعار جن میں تصوف کے کسی مسئلہ کو نظم کیا گیا ہے آزاد کے یہاں خال خال ہیں۔ لیکن جہاں ہیں
نہایت خوب ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے مسئلۂ وحدۃ الوجود

عیاں ہے سب میں کہاں ہے مخفی کب اُسکا جلوہ نقاب میں ہے
قصور اپنی نگاہ کا ہے وگرنہ کب وہ حجاب میں ہے

ہے وحدت وہی دیر و حرم میں جلوہ آرا ہے　　　ازل سے محو ہوں جسکے جمالِ حیرت افزا کا

"جمالِ حیرت افزا" کی ترکیب کتنی خوبصورت ہے۔ حسن کا کمال یہی ہے کہ دیکھنے والے کو
متحیر کر دے۔

"قیمت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہے اُسکا"

وہ عالم ہے یہاں تیرے گلِ رخسار کی قیمت　　　چمن میں غنچہ لیکر مشت زر نکلا تو کیا نکلا

عشق حقیقی پابندیِ مذہب سے آزاد ہے

مسجد و دیر میں پھرتے ہیں مسلماں آزاد　　　دل مرا کیوں نہ چلے گبر و مسلماں کے لیے

آزاد کا کلام صاف شستہ، پُر اثر اور بامزہ ہے۔ آورد اور تکلف نام کو نہیں ہے محض
آمد ہی آمد ہے۔ رفعت خیال اور پاکیزہ بول چال کے نمونوں کی کمی نہیں۔ طبیعت کی شوخی اور

رنگینی نے لطفِ کلام کو دوبالا کر دیا ہے۔ ایک عمدہ شاعر کے لیے زبان پر پوری قدرت کا ہونا ضروری ہے آزاد میں یہ صفت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ یہ دیکھ کر اور بھی حیرت ہوتی ہے کہ اُردو آزاد کے لیے اپنی زبان نہ تھی۔ سنگلاخ زمینوں میں صاف شعر کہہ لینا آسان نہیں۔ دشوار گزار ردیفوں اور قافیوں میں زبان کے لطف اور شگفتگی کو برقرار رکھنا معمولی شاعر کا کام نہیں ہو سکتا۔ ذیل کے اشعار پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ آزاد ایسے مواقع پر کس عمدگی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتا ہے۔

ہو گیا کچھ کششِ دل میں اثر آپ سے آپ — آ گئے کل وہ لیکایک مرے گھر آپ سے آپ
کوئی باعث نہ کوئی وجہ نہ موجب نہ سبب — کھنچ گیا ہم سے بتِ رشکِ قمر آپ سے آپ
سوکھنا غم سے مرے حق میں ہوا ہے مرہم — ہو گئے خشک مرے زخمِ جگر آپ سے آپ
سارے عالم میں نہ کیونکر مرا غم ہو روشن — چرخ فانوس ہے اور آہ ہے فانوس میں شمع
پاس آئے تو جلے دُور ہو بیتاب رہے — سر دھنا کرتی ہے پروانے کے افسوس میں شمع

جدتِ خیال ملاحظہ فرمائیے۔ شمع کی لَو کی جنبش کو سر کا دُھننا قرار دیا ہے۔

ملٹن کے نزدیک ایک اچھے شعر میں تین باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ سادگی، جوش اور اصلیت۔ آزاد کے بیشتر اشعار اس معیار پر پورے اُتریں گے۔

جب مصیبت آ پڑے جز صبر بن آتا نہیں — تو گرفتارِ قفس پھڑکا پھڑک کر رہ گیا
جیتا نہ ایک دم بھی رہوں ہجرِ یار میں — مجبور ہوں کہ موت نہیں اختیار میں
آج دشمن اگر خراب نہیں — کیا زمانے میں انقلاب نہیں!
کی فقیروں کی بھی اغیار نے بندی آزاد — اب درِ یار پہ کیا خاک رسائی ہو گی

مبالغہ اگرچہ جزوِ شاعری سمجھا جانے لگا ہے لیکن کوئی مستحسن چیز نہیں۔ آزاد نے کہیں کہیں اس عمدگی سے غلو کو نباہا ہے کہ باید و شاید۔

بچا ہاں چھٹنے نہ جن سے مرہم جلے نہ جن سے — اُن میں جلن نہ ہو گی وہ داغِ غم نہ ہوں گے

عاشق کی لاغری بیشتر شعرا کا تختۂ مشق رہی ہے۔ غالب کا شعر ہے

لاغر اتنا ہوں اگر تو بزم میں جا دے مجھے — میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

آزاد نے بھی اسی مضمون کو نظم کیا ہے۔ اسلوبِ بیان قابلِ التفات ہے۔

غموں سے گھل کے نہ کچھ تیرے خستہ تن میں رہا — رہا تو کچھ یوں ہی دھوکا سا پیرہن میں رہا

دونوں کے یہاں غلو ہے۔ گو ہر صاحبِ نظر کہہ سکتا ہے کہ آزاد کا شعر زیادہ لطیف ہے۔ "کچھ یوں ہی سا دھوکا

گریزاں کفر و دیں سے ہم ہیں آزاد عالم میں — نہ پہونچی ہاتھ تک تسبیح اور زنار گردن تک

عشق پر کسی کا زور نہیں

میری شامت تھی جو زلفوں میں کسی کی پھنسا — آ پڑی ہیں یہ بلائیں مرے سر آپ سے آپ

اگر پاس جان ہے تو ہو لے عاشق ہیچ

جان تم اپنی بچاؤ گے کہاں تک آزاد — یا مرو عشق میں یا عشق کا دعوے چھوڑو

آزاد کے کلام میں خامیاں بھی ہیں اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اسلیے کہ وہ آدمی تھے فرشتہ نہ تھے۔ کہیں کہیں نامانوس، غیر فصیح، بلکہ غلط الفاظ استعمال کر گئے ہیں۔

اے سپہر ہم سے گھٹایا نہ کرو تم — چاندی ہو گر ہر کوئی طالب ہے کھری کا

از بسکہ خوفناک ہوں جور فلک سے میں — ڈرتا ہوں آسمان سمجھ کر حباب کو

"خوفناک" اردو میں "ڈراؤنے" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

جبکہ جوش اٹھا خم دل میں شراب عشق کا — آبلہ دل کا ابھر کر آبگینہ بن گیا

شاعر کا مقصود آبگینہ سے شراب کا شیشہ ہے۔ آبگینہ کے معنی شیشے کے ضرور ہیں، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے "شراب کے شیشہ" کے معنی میں آبگینہ استعمال نہیں ہوتا۔

کہیں کہیں محاورہ میں بھی تصرف کیا ہے جو جائز نہیں

جس قدر روتے گئے دونا ہوا سوز جگر — آب اشک چشم گریاں اُسپہ روغن ہو گیا

اس شعر میں ایک تو "روتے گئے" کے ساتھ "دونا ہوتا گیا" ہونا چاہیے تھا۔ دوسرے "روغن" کا لفظ غیر مناسب ہے۔ محاورہ ہے "آگ پر تیل کا کام دینا" تیل کی جگہ "روغن" کا استعمال جائز نہیں۔

تنگی ہے سیکشی کی بدولت جنوں نہیں — کپڑے گلے کے بک گئے فصل بہار میں

شعر نہایت اچھا ہے۔ لیکن آج کل کے محاورہ کے مطابق "گلے" کی جگہ "بدن" ہونا چاہیے۔

بعض بعض جگہ معنوی نقائص بھی موجود ہیں

بزم میں اُٹھتے ہی اُنکے روئے روشن سے نقاب — جام ہے سورج تو مہتاب مینا بن گیا

چاند سورج سے کسب نور کرتا ہے اور جام مینا سے بھرا جاتا ہے۔ اس لیے مینا کو مہتاب اور جام کو سورج کہنا درست نہیں۔ اسکے علاوہ سورج کے سامنے چاند بے فروغ ہو جاتا ہے، اس لیے سورج اور چاند دونوں کا ایک جگہ جمع کرنا لطافت سے خالی ہے۔

بعض اشعار ایک عاشق کی شان سے بعید ہیں

تم اپنی جو صورت مجھے دکھلاؤ تو آؤں	کیا گھر میں تمھارے در و دیوار کو دیکھوں

معشوق کی طلبی پر چاہیے تو یہ تھا کہ عاشق سر کے بل دوڑا ہوا جاتا، یہاں اُلٹی شرائط پیش کی جا رہی ہیں -

لے کے دل دین بھی لے لو مجھے جیتا چھوڑ دو	نہ پڑو جان کے پیچھے مرا پیچھا چھوڑ دو

اس شعر میں روزمرہ کا لطف ضرور ہے مگر ع - ہیچ عاشق سخنِ تلخ بمعشوق نہ گفت - عاشق سے یہ توقع نہیں ہوسکتی کہ وہ راہِ عشق میں جان کو عزیز رکھے گا - اور پھر دین کو دیکر جان بچانا بھی کوئی اچھا کارنامہ نہیں -

آپ کے کلام میں رعایت لفظی اور تلازمہ بھی پایا جاتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ رعایت لفظی شعر کے لیے حُسن بھی ہے اور قبح بھی - اگر کسی جگہ بیساختگی سے استعمال ہوجائے تو لطف دوبالا ہوجاتا ہے ورنہ شعر الفاظ کا گورکھ دھندا بنکر رہ جاتا ہے - اس میں اختلافِ مذاق کی گنجائش ہے - زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ تلازمہ شعر کے محاسنِ ضروریہ میں شمار ہوتا تھا - اب بھی ایک طبقہ ایسا موجود ہے جو اسکا دلدادہ ہے - بہرحال ہماری رائے میں اشعار ذیل تلازمہ کی کوئی اچھی مثال نہیں ہوسکتے

تو زنگ مرا مثلِ طلا اور بھی چمکا	ان شعلہ رخوں نے مجھے از بسکہ تپایا
یوں غیر کا دل بٹھائیں گے ہم	محفل سے تری اُٹھائیں گے ہم
تو پھول ہوکے تمھارے گلے کا ہار ہوں میں	سبک جو کرکے مجھے تم نے کردیا ہلکا
ہیں شوخیاں غضب تری شرم و حیا کے ساتھ	سب پالیا بدن کے چُرانے کو دیکھ کر
کھانے کو داغ پینے کو خونِ جگر ملے	قانع ہوں اُسپہ عشق میں جو خشک و تر ملے
میں ہوں دیوانہ مرے کھانے کو پتھر چاہیے	قرص نانِ مہ فلک ناحق دکھاتا ہے مجھے
جو پھٹے جاتے ہیں مجھسے مری صحبت والے	میں تو وحشی ہوں گراں ہے [illegible] خاصیت سبب

آپ نے آزاد کے کلام کے نقائص بھی ملاحظہ فرمائے اور محاسن بھی - غالباً آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ محاسن خامیوں پر غالب ہیں - اور بحیثیت مجموعی آزاد بزمِ شعرا میں ایک عمدہ نشست کے مستحق ہیں -

محمد اظہار الحسن صدیقی

بی-اے-ایل-ایل-بی

سیرت (کیرکٹر)

صحیح معنوں میں شریف انسان

وہ چیز جو ایک ملک کو بلند مرتبہ بنا دیتی، وہ جو اُسکو قوت بخشتی، وہ جو اُسکو پُروقار بنا دیتی، وہ جو اُسکے اثر کو پھیلا دیتی، اُس کا اخلاقی اقتدار وجود میں لاتی اور اُس کی عزت کی کارفرمائی متیقن کرتی ہے، وہ جو لاکھوں انسانوں کے دلوں کو مسخر کرتی اور مغرور اقوام کو سرنگوں ہونے پر مجبور بناتی، اور وہ جو کہ آلۂ اطاعت، سرچشمۂ رفعت، سچا تاج و تخت اور ایک قوم کا عصائے شاہی ہے، ایک ریاست ہے۔ لیکن یہ ریاست حسب و نسب کی نہیں، یہ ریاست فیشن کی نہیں، اور نہ محض اعلیٰ قابلیت کی ریاست ہے بلکہ یہ ریاست سیرت کی ہے۔ اور یہی ایک انسان کا سچے معنوں میں خاندانی طغرائے امتیاز ہے۔
(ڈائس)

زندگی کا تاج اور اُسے چار چاند لگانے والی سیرت ہے۔ سیرت ہی ایک انسان کی افضل ترین ملک ہے۔ یہ بذات خود ایک مرتبہ ہے اور خیر طلبی عامہ میں بمنزلہ ایک ریاست کے ہے، جو ہر حیثیت کو پُروقار اور سوسائٹی میں ہر جگہ کو ارفع بنا دیتی ہے۔ اسکی قوت دولت سے زیادہ موثر ہے۔ اور بغیر شہرت کے رشک کو اُکسائے ہوئے یہ تمام اعزاز حاصل کرتی ہے۔ یہ اپنے میں ایک اثر رکھتی ہے، جو ہمیشہ مؤثر ہوتا ہے کیونکہ سیرت نتیجہ ہے مسلم الثبوت شرافتِ نفس، غیر متزلزل راستی اور استقلال کا۔ یہ ایسی خوبیاں ہیں جو شاید بہ نسبت اور خوبیوں کے کہیں زیادہ بنی نوع انسان کے عام عقیدہ اور احترام پر کارفرما ہیں۔

سیرت، انسانی فطرت کی بہترین صورت ہے۔ وہ ایک اخلاقی نظام ہے جو انسان میں متشکل ہے۔ پختہ سیرت والے سوسائٹی کے لیے نہ صرف بطور ضمیر کے ہیں بلکہ ہر اعلیٰ منتظم حکومت میں اُسکی بہترین نیت عمل کے [illegible] ہوتے ہیں۔ کیونکہ خصوصیت کے ساتھ یہ اخلاقی خوبیاں ہی ہیں جو دنیا پر کارفرما ہیں۔ یہاں تک کہ جنگ میں بھی نپولین کہتا تھا، اخلاقی خوبی بمقابلہ جسمانی خوبی کے وہی فوقیت رکھتی ہے جو دس کو ایک پر حاصل ہے۔ اقوام کی قوت، جفاکشی، محنت، تہذیب، سب کچھ انفرادی سیرت پر مبنی ہوتی ہے، اور

سنہری زندگی میں امن وامان کی ساری بنیاد اس پر قائم رہتی ہے۔ قوانین اور تمام ادارے Institution اسی کی پیداوار ہیں۔ قدرت کی میزان عدل میں افراد، اقوام، اور نسلیں اتنا ہی پائیں گی جتنے کی وہ مستحق ہیں سب کچھ کسی کو ہرگز نہیں ملیگا۔ اور جس طرح سے نتیجہ کا پتہ سبب سے لگتا ہے اسی طرح بلاشبہہ جس قسم کی سیرت لوگوں میں ہوتی ہے ویسے ہی اُسکی مناسبت سے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

اگرچہ ایک شخص نسبتاً بہت کم شائستگی، کمتر قابلیت و دولت رکھتا ہو، تب بھی اگر اُسکی سیرت خالص اور کھری ہے تو وہ ہمیشہ ایک اقتدار کا مالک ہوگا، چاہے وہ اقتدار کارخانہ کے اندر ہو یا صرافہ میں، منڈی کے متعلق ہو یا سینٹ سے۔ ۱۸۰۱ء میں کیننگ نے دانشمندی سے لکھا تھا

"اقتدار و اقتدار پر پہونچنے کے لیے میرا راستہ پختہ سیرت کی راہ سے ہوکر گزرے گا، میں دوسرا راستہ نہیں آزماؤں گا۔ اور میں پوری اُمید کے ساتھ یقین کرتا ہوں کہ یہ راستہ اگرچہ جلد سے جلد منزل پر نہیں پہونچاتا، لیکن پہونچاتا ضرور ہے۔"

آپ ایک صاحب فراست شخص کی تعریف کرسکتے ہیں لیکن قبل اسکے کہ آپ اُسپر اعتماد کریں کچھ اور بھی درکار ہوتا ہے، اس لیے ایک مرتبہ لارڈ رسل نے ایک صداقت سے پُر جملہ میں اپنا خیال یوں ظاہر کیا تھا:-

"انگلستان میں جماعت کی یہ فطرت ہے کہ وہ فائق الذہن Genius اصحاب کی مدد کی طلبگار ہوتی ہے لیکن وہ پختہ سیرت کے اصحاب کی رہنمائی پر چلتی ہے۔"

اسکی مخصوص مثال فرانسس ہارنر آنجہانی کی زندگی ہے۔ وہ ایسا شخص تھا جسکے متعلق سیڈنی اسمتھ نے کہا کہ "دس احکامات" اُس کے چہرہ پر ثبت تھے۔ لارڈ کاک برن نے کہا کہ وہ قابل قدر اور مخصوص روشنی جس سے ہر صحیح الدماغ نوجوان کو اُسکی (فرانسس ہارنر) سوانحعمری گراں دی گئی یہ ہے کہ "وہ ۳۸ سال کے سن میں انتقال کرگیا، مگر عامۃ الناس میں جو اقتدار اُسے حاصل تھا وہ کسی دوسرے عام شخص کو نصیب نہ ہوا۔ وہ ممدوح تھا، عزیز تھا، سب کو اُسپر اعتماد تھا، اور بجز کمینے اور سنگدل لوگوں کے سب اُسکے ماتم گسار تھے۔ اس لیئے اعلیٰ خراج تحسین کبھی کسی دوسرے متوفی ممبر کو پارلیامنٹ میں نہیں دیا گیا۔"

اب ہر نوجوان کو یہ دریافت کرنے دیجیے کہ یہ کس طرح حاصل ہوا۔ کیا کسی رتبۂ بلندی کی وجہ سے؟ وہ ایڈنبرا کے ایک سوداگر کا لڑکا تھا۔ کیا دولت کی وجہ سے؟ خود اُسکے پاس یا اُسکے کسی رشتہ دار کے پاس

ضرورت سے زاید کبھی چھ پنس کا ایک سکہ بھی نہیں رہا۔ کیا کسی عہدہ کی وجہ سے؟ وہ ایک ہی عہدہ
پر رہا اور وہ بھی صرف چند سالوں تک۔ اور وہ کوئی مقتدر عہدہ نہ تھا۔ بلکہ اُسکی تنخواہ بہت قلیل تھی۔
کیا غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے؟ اُسکی قابلیت اعلیٰ نہ تھی۔ وہ غیر معمولی ذہن بھی نہ رکھتا تھا۔ بلکہ
ہوشیاری اور آہستہ خرامی کے ساتھ اُسکا واحد مطمح نظر صاحب صدق وصفا ہونا تھا۔ کیا طراری
کی وجہ سے؟ اُس کی تقریر پُرسکون اور صحتِ مذاق سے مملو ہوتی اور اُس طراری سے بالکل پاک ہوتی
جو لوگوں کو خوف زدہ کر دیتی ہے یا راہ راست سے دُور ہٹا لے جاتی ہے۔ کیا طلسم اطوار کی وجہ سے؟
اُسکے اطوار محض مناسب اور پسندیدہ تھے۔ پھر کس چیز کی یہ سب کچھ کار فرمائی تھی۔ محض عقل سلیم
جاں فشانی، اعلیٰ اصول اور ایک نیک دل کی جو ایسی خوبیاں ہیں کہ اُنکے حصول سے کسی بہتر
ساخت کے دماغ کو نا اُمید ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ صرف اُسکی قوتِ سیرت تھی جس نے اسکو
بلندی پر پہونچا دیا۔ اور یہ سیرت فطرت سے اس کو ودیعت نہیں ہوئی تھی بلکہ کسبی تھی اور اُسکی تعمیر مخصوص
علی صفات Elements سے نہیں ہوئی تھی۔ دار العوام میں بہت سے اشخاص قابلیت اور
طراری میں اُس سے کہیں زیادہ تھے، لیکن ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ جو اخلاقی جواہر اُس میں مجتمع تھے
اُسکی بنا پر ہزاروں میں سے کسی کو اُس پر فوقیت حاصل نہ تھی۔ اور نہ اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے
پیدا ہوا تھا کہ معتدل قوتیں تہذیب اور نیکی کے سوا کسی دوسری چیز کی امداد کے بغیر اسوقت بھی جبکہ
ان کا اظہار خدمت عوام کی زندگی کے مجادلہ و مقابلہ اور رشک وحسد کے درمیان کرنا ہو کیا کیا کر سکتی ہیں

فرانکلن اپنی اس کامیابی اور کامرانی کا جو اُسے بحیثیت ایک خدمتگزار عوام کے حاصل ہوئی
اپنی اعلیٰ قابلیت یا قوتِ گویائی پر انحصار نہیں رکھتا جو اُسکی مشہور صداقت سیرت کے مقابلہ میں
دو ہی وجہی تھیں۔ اُسکا بیان ہے کہ

" ساتھی باشندگان پر میری ساکھ اسی وجہ سے تھی۔ میں محض ادنیٰ مقرر تھا، کبھی طراری کے
ساتھ نہیں بولا۔ اپنے الفاظ کے انتخاب میں مجھے بڑی رکاوٹ ہوتی۔ صحت زبان شاید ہی
کبھی نصیب ہوئی ہو، تب بھی میں عموماً بات منوانے Carried my point
میں کامیاب رہا "

سیرت ہی علیٰ اور ادنیٰ طبقہ کے انسانوں میں اعتماد پیدا کرتی ہے۔ روس کے شاہنشاہ
نکولس اول کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُسکی ذاتی سیرت ایک دستور حکومت کے برابر تھی۔ دوران
جنگ نپولین میں شہنشاہ فرانس میں ایسا تھا کہ اُس نے اپنے محل کے دروازے بالکل کھلے رکھے

اور اسکے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسکی ذاتی سیرت ایک فوجی رسالہ سے زیادہ تحفظ وامن کی ضامن تھی۔

سیرت قوت ہے

اصلی معنوں میں صحیح یہ ہے کہ سیرت قوت ہے' بہ نسبت اسکے کہ علم کو قوت مانا جائے۔ دماغ بغیر دل کے، ذہانت بغیر اطوار کے، چالاکی بغیر نیکی کے سب اپنے اپنے طور پر قوتیں ہیں جو صرف مائل بہ شر ہیں۔ ہم کو اُن سے لطف یا نصیحت حاصل ہوسکتی ہے لیکن بعض اوقات اُن کی تعریف و توصیف کرنا ایسا ہی دشوار ہے جیسا کہ کسی جیب کترنے والے کی تیزدستی یا کسی راہزن کی شہسواری کی داد دینا۔

سچائی، صداقت، نیکی ایسی خوبیاں ہیں جو ہر انسان کے ساتھ وجود پذیر نہیں ہوتیں، بلکہ یہ انسانی سیرت کی روح ہیں یا جیسا کہ زمانہ سلف کے ہمارے ایک مصنف نے کہا ہے "یہ روح نیکی کے ساتھ بمنزلہ ایک پیدائشی خادمہ کے ہے جو بغیر کسی وردی without livery کے اسکی مطیع و فرمانبردار ہوتی ہے۔ وہ شخص جو اِن خوبیوں کا مالک ہے اور ساتھ ساتھ قوت ارادی بھی رکھتا ہے' اپنے اندر ایک ایسی قوت رکھتا جو ناقابل مدافعت ہے' وہ نیکی کرنے کے لیے قوی ہے' وہ شر کا مقابلہ کرنے کے لیے قوی ہے' وہ مشکلات اور مصیبت برداشت کرنے کے لیے قوی ہے۔ جب اسٹیفن کلونہ اپنے کمینہ حملہ آوروں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوگیا تب اُن سب نے اُس سے طنزاً پوچھا کہ اب تمہارا قلعہ کہاں ہے؟ اپنا ہاتھ اپنے دل پر رکھتے ہوئے اُس نے جواب دیا "یہ ہے"۔ اُسکا یہ بہادرانہ جواب تھا۔ مصائب ہی میں ایک صاحب صدق وصفا کی سیرت انتہائی تابناکی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے اور جب اور سب کچھ بے سود ثابت ہوتا ہے تو وہ اپنی درستی اور جرأت پر قدم جماتا ہے۔

وہ اخلاقی دستور العمل جس پر لارڈ ارسکن جیسا شخص جو کھرے آزاد اصول اور مخصوص وابستگی صداقت کا مالک تھا، عامل تھا، اس لایق ہے کہ ہر نوجوان کے دل پر منقش ہو۔ وہ بیان کرتا تھا کہ میرے اوائل شباب کا یہ اولین حکم و مشورہ تھا کہ مجھے ہمیشہ وہی کرنا چاہیے جسکو میرا ضمیر ایک فرض بتائے، اور نتائج کو خدا کے سپرد کردوں۔ والدین کے اس سبق کی یاد اور مجھے بھروسہ ہے کہ اس کی مشق بھی قبر میں لیجاوں گا۔ میں اب تک اِن پر عامل رہا ہوں' اور میرے پاس کوئی وجہ نہیں کہ میں شکایت کروں کہ ان کی پابندی میرے لیے کسی عارضی قربانی کی باعث ہوئی ہے۔ برخلاف اسکے میں نے اپنے لیے اس کو شاہراہ سرسبزی و دولت پایا، اور یہی راستہ اپنے بچوں کو گامزن ہونے کے لیے دکھاؤں گا"۔

اعلیٰ سیرت کا حصول بطور ایک اعلیٰ ترین مقصد حیات کے ہر شخص کا فرض ہونا چاہیے۔ خود وہ

وہ کوشش ہی جو مناسب ذرایع سے اسکے حاصل کرنے میں درکار ہوتی ہے انسان کو قوت جد و جہد بہم پہونچاتی ہے اور اسکا نظریہ مردمی manhood جیسے جیسے بلند ہوگا اُسکی نیت عمل کو استقلال اور حرارت پہنچائیگا ۔ یہ بہتر ہے کہ ہم زندگی کا معیار بہت بلند رکھیں چاہے اُسکو پورے طور سے حاصل نہ کرسکیں ۔ ڈسرائیلی کا بیان ہے کہ "وہ نوجوان جو اوپر نہیں دیکھتا نیچے دیکھے گا ۔ اور وہ ہمت جو بلند پرواز نہیں اسکی قسمت میں شاید زمین پر رینگنا ہے" ۔ جارج ہربرٹ کی یہ دانشمندانہ تحریر ہے کہ "اپنے اطوار کی جگہ نیچی رکھ اور اپنے منصوبے بلند رکھ ، تجھ کو اس طرح سے منکسر اور صابر رہنا چاہیے جیسے ہمت میں پستی نہ ہو ۔ جسکا ہدف آسمان ہے وہ بلند نشانہ لگانے گا ، بہ نسبت اُسکے کہ جسکا ہدف ایک درخت ہو" جسکا معیار زندگی و خیال بلند ہے وہ بہ نسبت اُسکے کامیاب رہیگا جسکا کوئی معیار نہیں ۔ اِل اسکاٹ لینڈ کا مقولہ ہے کہ "سنہری خوشہ کی خوشہ چینی کرو ، پھر ممکن ہے تم کو اُسکی ایک آستین مل جائے" ہر وہ شخص جو بہترین نتائج کے لیے کوشاں ہوتا ہے اُس مقام سے جہاں سے وہ چلا تھا کچھ آگے پہونچنے میں ناکامیاب نہیں ہو سکتا ۔ اور اگر نتیجہ برآمد شدہ مقصود سے کم رہ گیا ہو تب بھی اُبھرنے کی کوشش ہی بذات خود مستقلاً منفعت بخش ہو کر رہیگی" ۔

سیرت کے لیے قول و فعل کی صداقت بمنزلہ استخوان پشت ہے اور راستی سے وفادارانہ وابستگی اسکی مخصوص ترین خصوصیت ہے بہترین شہادت جو سر رابرٹ پیل آنجہانی کی سیرت کے بارے میں ملتی ہے وہ تھی جو ڈیوک آف ولنگٹن نے دار الامرا میں اس اعلیٰ مدبر کی وفات کے چند روز بعد (اپنی تقریر میں) دی تھی ۔ لارڈ موصوف نے یوں خطاب کیا تھا "رؤساء عظام ۔ آپ سب نے سر رابرٹ پیل کی اعلیٰ اور پُر عظمت سیرت محسوس کی ہوگی ۔ پبلک زندگی میں عرصہ تک میرا اور متوفی کا ساتھ رہا ہے ۔ ہم دونوں عرصہ تک اپنے بادشاہ کی مجلس شوریٰ میں رہے ہیں اور عرصے تک مجھے اُنکی نجی دوستی کا فخر حاصل رہا ہے ۔ اُن سے ملاقات کے زمانہ میں کسی دوسرے شخص کو نہیں جانتا تھا جسکی راستبازی و انصاف پر مجھے زیادہ بھروسا رہا ہو ، یا جس میں میں نے بہ نسبت اُنکے بہبودِ خلق کے لیے خدمت کی زیادہ غیر متزلزل خواہش پائی ہو ۔ اُس ساری مدت میں جبکہ مجھے اُن سے واسطہ رہا ، مجھے کوئی ایسا موقع نہیں معلوم جس میں اُنھوں نے سچائی اور صداقت سے نہایت درجہ لگاؤ ظاہر نہ کیا ہو ، اور اپنی تمام زندگی میں مجھے ذرہ برابر بھی اس بات کا گمان کرنے کی وجہ نہ معلوم ہوئی ہو کہ اُنھوں نے کوئی بات بیان کی ہو جس کی حقیقت کا اُنھیں یقین کامل نہ ہو اور اس مدبر کی یہ عالی منش صداقت ہی تھی جس میں بلا شبہ اُسکے اثر و اقتدار کا راز بڑی حد تک مضمر تھا ۔

ویسے ہی بنو جیسے کہ تم ظاہر ہوتے ہو

قول و فعل دونوں میں صداقت ہوتی ہے، جو درستی سیرت کے لیے از بس ضروری ہے۔ ایک انسان کو واقعی وہی ہونا چاہیے جو وہ ظاہر ہوتا ہے یا جیسا وہ ظاہر ہونا چاہتا ہے۔ جب ایک امریکی بھلے مانس نے گرانولی شارپ کو لکھا کہ اُسکی اعلیٰ نیکیوں کے احترام میں اُس نے اپنے ایک بچہ کا نام اُنکے نام پر (گرانولی شارپ) رکھا ہے تو شارپ نے یہ جواب دیا کہ

"آپ سے میری یہ التماس ہے کہ آپ اُس بچے کو اُس خاندان کا، جسکا نام آپ نے اُسکو دیا ہے، ایک مقبول مقولہ سکھا دیں (اور وہ یہ ہے) ہمیشہ کوشش کرو کہ واقعی وہی بنو جیسا کہ ظاہر ہونے کی تم کو خواہش ہے۔ اس مقولہ پر جیسا کہ میرے والد نے مجھے بتایا کہ اُنکے والد نے نہایت توجہ اور انکساری سے عمل کیا اور اس وجہ سے اُنکا خلوص بحیثیت ایک سادہ اور ایماندار شخص کے اُنکے پرائیوٹ (خانگی) اور پبلک (عامہ) سیرت کا امتیاز خصوصی رہا۔"

ہر شخص جو اپنی آپ عزت کرتا ہے اور دوسروں کی آبرو کی قدر و قیمت جانتا ہے اس مقولہ کو عملی جامہ پہنائیگا۔ جو کچھ کرنے کی تجویز کریگا اُسکو ایمانداری سے کریگا، اور اپنے عمل کو بہترین سیرت سے مملو کریگا۔ کبھی کوئی چلتا ہوا کام نہ کریگا بلکہ اپنی صداقت اور احساسِ ضمیر پر فخر کریگا۔ ایک مرتبہ کرام ویل نے برنارڈ ایک چست و چالاک لیکن کسی قدر غیر محتاط وکیل (قانون داں) سے کہا کہ

"میں سمجھتا ہوں کہ تم تھوڑے زمانے سے اپنے اطوار میں بہت چوکنے ہو رہے ہو لیکن اس پر بہت زیادہ بھروسہ مت کرو۔ جودت تم کو دھوکا دے سکتی ہے لیکن صداقت کبھی نہیں۔"

اُن اصحاب کو جنکے اقوال و افعال میں صریح تضاد ہوتا ہے، کوئی عزت حاصل نہیں ہوتی۔ اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اُس میں کچھ وزن نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ سچ بھی جو وہ بیان کرتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُنکے لبوں سے گزر کر جھلس گیا۔

سیرت صادقہ ہمیشہ سچا اثر رکھتی ہے، چاہے وہ پوشیدہ ہو یا لوگوں کی نظروں کے سامنے۔ اُس بچے کی تربیت عمدہ تھی جسنے اس سوال پر کہ جب کوئی دیکھنے والا نہ تھا تو اُس نے کچھ ناشپاتیاں کیوں نہ (اپنی) جیب میں رکھ لیں، جواب دیا تھا کہ

"ہاں، وہاں (دیکھنے والا) تھا۔ میں وہاں خود اپنے آپ کو دیکھنے والا تھا۔ اور یہ میرا ارادہ کبھی نہیں ہے کہ میں خود اپنے تئیں ایک غیر ایماندارانہ حرکت کرتے دیکھوں۔"

ایک سادہ اور صحیح مثال اصول یا ضمیر کی جو کہ سیرت پر جاری و ساری ہوتی اور اُسکے نجی تحفظ کی ضامن

ہوتی ہے۔ یہ محض ایک اثرِ مجہول نہیں بلکہ ایک قوتِ معروف ہے جو کہ زندگی کو منظم رکھتی ہے۔ ایسا اصول سیرت کو ساعت بہ ساعت اور روز بروز منتقل کرتا ہے اور وہ ایک ایسی قوت کے ساتھ نشو و نما پاتا ہے جو ہر لحظہ برسرِ کار رہتی ہے۔ بغیر اس مؤثر قوت کے سیرت مصئون نہیں بلکہ ہمیشہ ترغیباتِ نفس Temptations سے مغلوب ہو جانے کے خطرے میں ہے اور نفس کے ہر ایسے غلبہ کے بعد ہر کمینہ یا غیر ارادانہ فعل چاہے وہ کیسا ہی ہلکا ہو، ذاتی پستی و ذلت کا موجب ہوتا ہے۔ یہ کوئی بات نہیں کہ عمل کامیاب رہا یا ناکامیاب رہا، ظاہر ہو گیا یا پوشیدہ رہا۔ گنہگار اب وہی پہلا شخص نہ رہا، بلکہ دوسرا ہے۔ اب اس کا تعاقب ایک پوشیدہ بےچینی، ذاتی لعنت ملامت زیادہ تمام کار فرمائی جس کو ہم ضمیر کہتے ہیں کرتی ہے جو کہ گنہگار کا ناگزیر انجام ہے۔ (سیموئل اسمائیلس)

(ترجمہ)

نیاز احمد صدیقی

خود اپنے عکس کو اپنے مقابل دیکھنے والے
ذرا آنکھیں تو کھول او نقشِ باطل دیکھنے والے

حقیقت کو حقیقت کے مقابل دیکھنے والے
مجھے بھی دیکھ میری ہستیِ دل دیکھنے والے

یہ محفل ہے، یہاں ہیں رنگِ محفل دیکھنے والے
ارے بیگانہ بنکر جانبِ دل دیکھنے والے

دکھادوں حسنِ بیتابی مگر پھر خوف آتا ہے
مرا دل ہی نہ بن جائیں مرا دل دیکھنے والے

شہادت انتقامِ عشق کی صورت بدلتی ہے
سنبھلنا، ہاں سنبھلنا رقصِ بسمل دیکھنے والے

ترے جلووں کو دیکھیں اور مرے دل کی طرف دیکھیں
کہاں ہیں اتصالِ موج و ساحل دیکھنے والے

ترے کوچے میں آ کر فخر سمجھے ہیں اسیری کو
زمیں سے آسماں تک وسعتِ دل دیکھنے والے

مری آتش نوائی کا بھی کچھ اندازہ فرمائیں
اسی محفل میں ہونگے نبضِ محفل دیکھنے والے!

شہیدانِ محبت سے لڑا آنکھیں نہ لے ناصح
یہی وہ ہیں جنھیں کہتے ہیں قاتل دیکھنے والے

ادھر آ ہر قدم پر حسنِ منزل تجھ کو دکھلادوں
"فلک کو یاس سے منزل بمنزل دیکھنے والے"

کمالِ بےحسیِ شوق پر بھی اک نظر ڈالیں
مری ہر سانس میں اک محشرِ دل دیکھنے والے

کسی اک نقطۂ موہوم ہی کی شرح تو کر دیں
کتابِ عشق کے گہرے مسائل دیکھنے والے

حقیقت بیں نظر میں ہر تجلی اک حقیقت ہے
وہ خود باطل ہیں جو ہیں نقشِ باطل دیکھنے والے

نہیں معلوم کیا ہے، مکان و لامکاں کیسے
سما جا تو بھی او گنجائشِ دل دیکھنے والے

نہنگ و خوفِ طوفاں ہی جگر آغوشِ مادر ہے
وہ کوئی اور ہونگے امنِ ساحل دیکھنے والے

جگر مرادآبادی

سُلطان عالم واجد علی شاہ

اودھ کے بدنصیب آخری تاجدار کے حالات روز بروز پردۂ خفا میں آتے جاتے ہیں اور اُنکے بدنام کرنے اور ہر بداخلاقی کو اُنکے سر تھوپنے کی جو کوششیں روز بروز زیادہ کامیاب ہوتی جاتی ہیں خصوصاً ہمارے موجودہ نام نہاد مورخین جو مسلمان حکمرانانِ ہند کے عہد کو ہر طرح بُرا دکھانا چاہتے ہیں، اُنکے خنجرِ ناز کے لیئے واجد علی شاہ سے زیادہ آسان کوئی قربانی مل نہیں سکتی - میں اس مضمون میں بادشاہ مرحوم کی زندگی کا بہت ہی مختصر خاکہ کھینچتا ہوں -

واجد علی شاہ ۱۸۱۹ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے - کچھ ہوش سنبھالا تو امجد علی شاہ نے نواب امداد حسین خاں کو انکا اتالیق مقرر کیا - سِن تمیز کو پہونچے تو نواب عالم آرا بیگم سے شادی رچائی گئی - پابند شرع باپ نے واجد علی شاہ کو بھی علماء کی صحبت میں رکھ کے اپنا سا بنانا چاہا تھا، اور یہ رنگ ایک حد تک واجد علی شاہ پر چڑھا بھی تھا، جو جیسے جیسے دن گئے کھلتا گیا، مگر امجد علی شاہ کا اس میں کچھ زور نہ چلا کہ وارث تاج و تخت فرزند کا فطری رجحان عشرت پسندی اور فنون طرب کی طرف تھا - اگرچہ باپ کی تاکید سے لکھنے پڑھنے کی تعلیم بھی اچھی خاصی تھی لیکن موسیقی کا شوق غالب تھا - جب امجد علی شاہ نے دنیا کو خیرباد کہی تو نواب امین الدولہ نے کرنل رچمنڈ رزیڈنٹ کو خبر انتقال پہونچائی - رزیڈنٹ مع ڈاکٹر لوگن و نواب امین الدولہ کے داخل محلسرا ہوئے اور بادشاہ کی نعش پر آئے - دوشالہ اُٹھوا کر دیکھا تو فی الحقیقت انتقال ہو چکا تھا - وہاں سے گلستان ارم (کوٹھی) میں آکر بیٹھے - جب خبر وحشت اثر سلطان عالم کو پہونچی سنتے ہی عجب حالت بیقراری سے برآمد ہوئے، دونوں طرف خواص بازو تھامے ہوئے، متصل اشک چشم حق بیں سے جاری تھے - بیقراری دمبدم بڑھتی جاتی تھی - اسی حال سے زرد کوٹھی میں آکر بیٹھے - اس عرصے میں میر مہدی علی خاں نے عرض کیا کہ کپتان ہانکس استقبال کو آتے ہیں - مہاراجہ بال کرشن نے مسودہ فرمان جلوس رزیڈنٹ کو سنایا بعد چند دقیقے کے آمد آمد سواری بادشاہ کی دھوم ہوئی - سواری کا بوجہ زینے سے ہو کر گزرا - بادشاہ کمرے میں بداخل ہوئے - رزیڈنٹ سے معانقہ ہوا اور وسطی کمرے میں تشریف فرما ہوئے - ایک ساعت کے بعد برگیڈیر جانسن چھاؤنی کی منڈیاؤں سے آئے، رزیڈنٹ انھیں بھی کمرے میں لیگئے - اسکے بعد واجد علی شاہ تخت رواں پر سوار ہو کر بارہ دری میں داخل ہوئے - پہلے خاص کمرے میں جا کر دو رکعت نمازِ شکرانہ پڑھی - پھر تخت پر کھڑے ہوئے - مجد الدولہ کشتی میں تاج لائے - رزیڈنٹ نے اپنے ہاتھ سے تاج سر پر رکھکر کہا کہ "اب

واجد علی شاہ بادشاہ اودھ ہوے"۔ بعد اسکے بادشاہ نے تخت پر جلوس فرمایا۔ پہلے نواب
امین الدولہ نے نذر پیش کی۔ بادشاہ نے پانچ اسم سادات حسنی دستخط فرمائے۔ سامنے مبارک باد کا
غل ہوا۔ ناچ ہونے لگا۔ انگریزی بینڈ بجنے لگا۔ شلک سلامی سر ہوئی۔ شہر میں شادی ہوئی۔ ایک ساعت
کے بعد بادشاہ تخت سے اُترے۔ رزیڈنٹ اور برگیڈیر نے تخت رواں تک پہونچایا۔ بادشاہ سوار
ہوے۔ روشن چوکی بجنے لگی۔ محلسرا میں داخل ہوے۔ اکثر ملازمین قدیم و جدید کو خطابات شاہی
عطا ہوے۔ بادشاہ نے اپنے والد ماجد کی تجہیز و تکفین کے لیے ایک لاکھ روپے منظور فرمائے۔
نواب امین الدولہ وزارت سے مستعفی ہوے اور نواب سید علی نقی خاں وزیر اعظم مقرر ہوے۔ اُس
وقت سے بادشاہ نے کل امور سلطنت ان پر چھوڑ دیے تھے۔

چونکہ ماہ ذیقعدہ میں سلطان عالم کی ولادت ہوئی تھی، اس لیے اپنے عہد میں ذیقعدہ
کو سال کا پہلا مہینہ قرار دیا اور اسکا نام ماہ واجدی قرار دیا۔ اور اسی طرح سال کے بارہ مہینوں
کے نام مقرر کیے۔ ماہ واجدی، ماہ محمدی، ماہ اختری، ماہ سکندری، ماہ حسینی، ماہ اثنا عشری،
ماہ داؤدی، ماہ صنوبر، ماہ مراتب، ماہ منصوری، ماہ سلیمان، ماہ نبی۔

سلطان عالم نے نہایت ہی مستعدی اور دانشمندی سے حکمرانی شروع کی۔ خدا نے بادشاہ
کو حُسن و جمال کے ساتھ ذہانت و طباعی کے زیور سے آراستہ کیا تھا۔ علمی قابلیت بھی اچھی تھی۔
نہایت وجیہ تھے اور اُنکے مردانہ حُسن کی دُور دُور تک شہرت تھی۔ شہ زوری کا یہ عالم تھا کہ روپیہ
چُٹکی سے مَل کر اُسکے نقش مٹا دیتے اور دبا کر گولی بنا دیتے۔ بیدار مغزی کی یہ حالت تھی کہ امجد علیشاہ
کے جنازے پر راجہ جوالا پرشاد حاضر ہوے تو آپ نے یہ حکم قضا شیم نافذ فرمایا کہ "معتوب سرکار را
از احضار چہ سروکار اگر مناسب باشد مواخذہ سازند"۔ بلحاظ فصاحت و بلاغت یہ جملہ کس قدر بلیغ
و سنجیدہ ہے، ارکان دولت کے حالات سے بھی واقفیت ظاہر ہوتی ہے۔ یہ سُن کر تمام ارکانِ
دولت کے کان کھڑے ہوگئے، کہ اگر بادشاہ کی بیدار مغزی کا یہی عالم ہے، تو ہمارا بازار گرم ہونے سے
رہا۔ انتظام سلطنت سے غافل کرنے کی غرض سے ہر طرح کے عیش و عشرت کا سامان فراہم کر دیا۔
قوت شہوانی کو ہیجان میں لانے کے لیے کُشتے کھلائے گئے۔

واجد علی شاہ کی سلطنت کا آغاز تو اس عنوان سے ہوا کہ نوجوان بانکے بادشاہ کو عدالت گستری
اور اصلاح فوج کی طرف غیر معمولی توجہ تھی۔ طلوع صبح سے تین بجے دن تک ایک دم کو بھی استراحت
نہ فرماتے۔ بلکہ ملکی معاملات کاغذات و دیگر مقدمات میں ہمہ تن مصروف رہتے۔ بادشاہ کی سواری

کے آگے [illegible] سوار [illegible] راہ میں جو ستغیث عرضی دیتا اُن صندوقچوں میں داخل کر دی جاتی اور خود سلطانِ عالم اُن عرضیوں پر حکم احکام صادر فرماتے - اس سے اہلکاروں کو خوف اور رعایا کو تقویت ہوتی تھی - ایک جدید محکمہ بادشاہ سلامت نے فرعنوں کے مقدمات فیصل کرنے کو کھولا - اودھ میں تھانے مقرر کیے، سررشتۂ اخبار مقرر کیا، سرحدی پولیس کے سواروں اور پیادوں کی جمعیت بڑھائی، زراعت کی اصلاح میں ہر امر سے زیادہ تاکید فرمائی، آراستگیِ فوج میں توجہ فرمائی تو خود قواعد لینا شروع کی تعلیم فوج کا اس قدر خیال تھا کہ بنفسِ نفیس، منہ میں چار گھڑی رات سے گھوڑے پر سوار ہو کے جاتے اور گھنٹوں دھوپ میں کھڑے رہکر اُنکی قواعد اور فنونِ جنگ میں مشاقی دیکھتے اور باکمال سپاہیوں کو انعام سے سرفراز فرماتے - فوج کو فارسی لفظوں میں قواعد سکھایا کرتے تھے - فوجی قواعد کے لیے خود ہی فارسی اصطلاحات اور کلمات مقرر کیے، "راست رو" "پس بیا" "دست چپ بگرد" - چند روز بعد جوان حسین عورتوں کی ایک چھوٹی فوج مرتب کی گئی اور اُنکو بھی اِنھیں اصطلاحوں میں قواعد سکھائی گئی - یہ عورتیں کلکتہ میں بھی موجود تھیں - اُنکی وردی بہت بانکی اور دلکش تھی - اُنکے ہاتھوں میں کرچیں رہا کرتیں اور وہ ترک سوازنیاں کہلاتی تھیں - فوج کو جنگی قواعد اور قلعہ بندی کی لڑائیاں ایسی سکھائیں کہ بہت جلد قابلِ قدر ہو گئیں - اب ہر قسم کے باجے بھی جمع ہو گئے جو دل بڑھانے کے زبردست آلے ہیں - بادشاہ نماز کے بڑے پابند تھے: قواعد لے رہے ہیں، وقتِ نماز آیا، علیحدہ ہو گئے، فوراً دریا کے کنارے سجادہ بچھ گیا، نماز پڑھی، فوجی لباس جسم پر ہے - کبھی کوئی سپاہی گرا، یا اُسے چوٹ آئی، تو خود پاس تشریف لیگئے، شفقت فرمائی، انعام میں اشرفیاں دیں - غرضکہ علاوہ ضروری رسالوں اور پلٹنوں کے بہت سی پلٹنیں اور توپخانے تھے جو ہر وقت تیار رہتے تھے - جب بادشاہ ہوا خوری کو سوار ہوتے تو ایک ضرب چاندی کی توپ بھی ہمراہ رہتی - توپیں ایسی ہوائیں جنکا گولہ بارہ کوس جاتا تھا -

جب لارڈ ہارڈنگ لکھنؤ تشریف لائے سلطانِ عالم نے فوج کی قواعد دکھائی - رمنہ میں فوج آراستہ ہوئی - پوری لڑائی کا نقشہ کھنچ گیا - گورنر جنرل نہایت متحیر ہوئے - رخنہ اندازانِ سلطنت نے جب سرگرم حکمراں کی یہ کیفیت دیکھی تو فوج کی طرف سے رفتہ رفتہ دل پھیرنا اور عیش و نشاط کی طرف مائل کرنا شروع کر دیا - حاشیہ بوسان بزم باتوں باتوں میں کبھی یہ بھی کہہ اُٹھتے تھے "قبلۂ عالم کس غنیم پر حملہ کرنے والے ہیں" اب فوج پر توجہ موقوف فرمائیے - رزیڈنٹ کو یہ ناگوار تھا اور اُنکی طرف سے بار بار شکایت پہونچی تو مجبوراً وہ فوج کی جانب سے بے پروا ہو گئے - جن لوگوں نے خواہ مخواہ رزیڈنٹ کے کان بھر دیے اُنھوں نے سچ یہ ہے کہ بڑی نمک حرامی کی -

واجد علی شاہ پر سرکار کمپنی کی جانب سے صرف بد انتظامی کی تہمت لگائی گئی۔ اودھ کے بارے میں بدنظمی ملک گیری یا لارڈ ڈلہوزی پالیسی کا بہانہ قرار دے دیگئی، جسکو بعد کے تمام معاملہ فہم انگریزوں نے بھی تسلیم کرلیا، اور وہ پالیسی ناکام سمجھ کے ہمیشہ کے لیے موقوف کردی گئی۔ لیکن اپنی غلطی محسوس ہو جانے کے بعد بھی جبر نقصان نہ کرنا، مظلوم کے آنسو نہ پونچھنا اور اپنے ہاتھوں کا خون نہ دھونا ایک ایسا امر ہے جو انگریزی گورنمنٹ ہی سے نہ ہوسکا۔ خود واجد علی شاہ لکھتے ہیں کہ ۱۸۵۶ء میں اہالی سرکار کمپنی نے زبردستی اور بے انصافی کی راہ سے ملک اودھ پر قبضہ کرلیا، آج تک انتظام کے بہانے سے کبھی کسی کا ملک نہیں چھینا گیا تھا۔ غالباً واجد علی شاہ اس بارۂ خاص میں اپنی آپ ہی مثال دنیا میں چھوڑ گئے ہیں۔ اگر بدانتظامی ہوتی تو ملک کی آبادی گھٹ جاتی، رعایا پریشان ہوتی تو ملک کی آمدنی کم ہو جاتی، غلہ گراں ہو جاتا۔ حالانکہ عہد واجدی میں سلطنت کی آمدنی اسی قدر رہی جتنی کہ پچیس سال سے برابر چلی آتی تھی۔ غلہ نہایت ارزاں تھا۔ علاوہ بریں بادشاہ، رزیڈنٹ کی مرضی کے مطابق تحصیلدار نوکر رکھتے تھے۔ بعد ازاں بادشاہ نے تخفیف کی طرف توجہ فرمائی تو رزیڈنٹ اسکے بھی شاکی ہوئے۔ یہ بھی عجب تماشہ کی بات تھی کہ جب بادشاہ انتظام کرتے تو رزیڈنٹ شکایت کرتے تھے، اور پھر خود ہی بدنظمی کا الزام دیتے تھے۔ ساری خرابی ارکان دولت اور عہدہ داروں کی نالائقی، بددیانتی اور کمزوری سے ہوئی۔ انکو مالی اور ملکی کاموں کا تجربہ نہ تھا۔ نالائق مصاحبین اور ملازمین نے بادشاہ کو خوشامد سے غفلت میں رکھا اور اپنے فائدہ کے لیے سلطنت کو تباہ کیا۔ عجیب و غریب بات یہ ہے کہ ملک کی بدنظمی بیان کرتے وقت سب کچھ جانتے تھے اور بادشاہ کو صلاح نیک دیتے وقت کچھ نہ جانتے تھے۔ آخر کار وہ نااتفاقی جو عرصے سے شاہ اودھ اور رزیڈنٹ میں چلی آتی تھی اسکے نتیجے ظاہر ہونے لگے۔

۱۸۴۹ء میں رزیڈنٹ سلیمن نے اودھ کا دورہ کیا اور مراسم و ضوابط قدیمہ کے خلاف رعایائے اودھ سے عرضیاں لے لے کر بادشاہ کے نام احکام اور تجویزیں لکھیں۔ اکثر تحصیلداروں کو سندیں عطا کیں تعلقداروں سے ملاقاتیں کیں اور اُن کے تحائف قبول کیے مگر ترکاری اور میوے جو دستور قدیم کے مطابق بادشاہ کی طرف سے ڈالی کے طریقے پر بھیجے جاتے تھے اُن کا لینا موقوف کردیا۔ الغرض روابط و مراسم سابقہ کو کلیتہً موقوف کردیا۔ اور انجام یہ ہوا کہ جنرل سلیمن اور جنرل اوٹرم کی ۱۸۵۵ء کی رپورٹوں کی بنا پر بدنظمی کا الزام بادشاہ کے سر آہی گیا۔

اول سال جب بادشاہ تخت نشین ہوئے یہ منظور ہوا کہ تمام علاقجات قلمرو سلطانی حضور تحصیل ہو جاویں۔ زمیندار اور تعلقدار اپنے وکلا کی معرفت زرآمدنی داخل خزانۂ سلطانی کیا کریں۔ ناظم اور چکلہ دار

موقوف ہو جائیں، اس لیے کہ یہ علاقہ پر جا کر زیادہ ستانی اور تنگ طلبی کرتے ہیں، بعیت تباہ ہوتی ہے، نقصان سرکار بھی ہوتا ہے۔ لیکن اہلکاروں نے کہ اُنکے حاصلات لاکھوں پیسے کے جاتے تھے، اس حکم کو جاری نہ ہونے دیا۔ غرض کسی طرح انتظام کی چول نہ بیٹھی۔ اور آخر کار سرکار کمپنی نے ملک اودھ کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ لیکن غور طلب یہ امر ہے کہ اگر بدنظمی کے وہ الزامات جو بادشاہ پر لگائے گئے تھے صحیح بھی ہیں، تو ایسٹ انڈیا کمپنی کو، جو تجارت کرنے کو ہندوستان میں آئی تھی، دیگر ممالک کی اصلاح کا ذمہ دار کس نے بنایا۔ اور اگر یہ مان لیا جائے کہ غلبہ اور قوت سے یہ حقوق کسی جماعت یا حکومت کو قدرتی طور پر خود ہی مل جایا کرتے ہیں، تو پہلا سوال یہ ہے کہ بجائے ملک پر قبضہ کرنے کے انتظامات کی اصلاح کیوں نہ کی گئی۔ تا سابق یہ حکم جاری ہو سکتا تھا کہ واجد علی شاہ انتظام مملکت نہیں کر سکتے لہذا اُنکی زندگی بھر آیندہ تمام اختیارات رزیڈنٹ یا گورنمنٹ کے مقرر کیے ہوئے کسی قابل ہندوستانی عہدہ دار کے ہاتھ میں رہیں گے۔ یہ بھی مناسب نہ معلوم ہوا تو اسکا کیا جواب ہے کہ مجرم تو اکیلے واجد علی شاہ تھے، اُنکے جرم کی سزا اُنکے سارے خاندان بلکہ سارے ملک اودھ کو کیوں دی گئی۔ کمپنی کے عہدہ دار نواب وزیر علیخاں اور مرزا جان کو اس سے پیشتر معزول کر کے ایک دوسرے رُکن خاندان شاہی کو بادشاہ مسند کر چکے تھے، اسی طرح اس موقع پر بھی واجد علی شاہ کو حکومت سے ہٹا کے اُنکے کسی بیٹے یا بھائی کو بادشاہ بنا سکتے تھے۔ کیا یہ خاندان اپنے سابقہ حقوق دوستی و وفاداری کے لحاظ سے ایسے ہی سلوک کا مستحق تھا؟ سچ یہ ہے کہ واجد علی شاہ کو بدنام کرنا اور اُن کے منہ میں سیاہی لگانا صرف ایک بہانہ تھا۔

عہد واجدی میں یہاں کی علمی ترقیاں یہاں کا تمدن بہتیرے مقامات سے کہیں اچھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ لکھنؤ اُنکے عہد میں ہندوستان کی آنکھ کا تارا تھا۔ مشہور سیاح ناظق ایرانی امیا والہ وشیدا ہوا کہ اُس نے دنیا بھر کی بادشاہت پر لکھنؤ کی فقیری کو ترجیح دی، اور ان الفاظ میں سوادِ غربت کا دَم بھرنے لگا "گدائی لکھنؤ بہ سلطنت، ربع مسکوں فوقے دارد"

عام طور پر مشہور ہے کہ واجد علی شاہ کو دربار کے اطبا نے تباہ کیا۔ بادشاہ پر جب امراض تبخیر و مراق کا غلبہ ہوا اور اطبائے حاذق وشیرانِ معرب نے دل و دماغ کے لیے تفریح و عیش علاج تجویز کیا، تو آپ مشاغل عیش و عشرت میں مصروف ہوئے۔ ایسا مرض بادشاہ کو لاحق ہوا کہ اطبائے حاذق نے تجویز کیا کہ بادشاہ فکر بندوبست مملکت میں توجہ کم کریں، ورنہ باعثِ علالت شدید ہوگا۔ کتب تاریخ میں لکھا ہے کہ خفقان و مراق کی وجہ سے واجد علی شاہ سلطنت کے کاموں پر متوجہ نہ ہوئے۔

بادشاہ کو تحیّر قلبی و دماغی کا عارضہ ہو گیا تھا، اور آخرکار نوبت خفقان و مراق کو پہونچ گئی - چونکہ اس عارضہ میں غم وہم اور فکر و تردد نہایت مضر ہے اس لیے اطبا کی یہ رائے ہوئی کہ جہاں تک ہو سکے عیش و سرور میں رہیں اور کوئی کام ایسا نہ کریں جس سے قلب و دماغ پر زور پڑے یا فکر و تردد لاحق ہو -

چونکہ انتزاعِ سلطنت انھیں کے عہد میں ہوا اس لیے تمام اہلِ الرائے کے ہدفِ سہام اور نشانۂ ملامت وہی بن گئے اور قریب قریب تسلیم کر لیا گیا کہ زوالِ سلطنت کا باعث وہ تھے، لیکن جس زمانہ میں اُنکی سلطنت کا خاتمہ ہوا ہے اُس وقت ہندوستان کی اور تمام حکومتیں دنیا سے مٹتی جاتی تھیں پنجاب میں سکھوں کا اور دکن میں مرہٹوں کا دفتر کیوں اُلٹا؟ حالانکہ وہ بہادر اور زبردست اور ہوشیار مانے جاتے ہیں - دہلی میں مغل شاہنشاہی کا اور بنگالہ میں نواب ناظم بنگالہ کا استیصال کیوں ہوا؟ حالانکہ اُن میں اتنی طفلانہ مزاجی نہ تھی جتنی کہ لکھنؤ کے ارکانِ سلطنت میں بتائی جاتی ہے - مذکورہ چاروں درباروں میں کوئی واجد علی شاہ نہ تھا - اصل یہ ہے کہ اس عہد میں اِدھر اہلِ ہند کی غفلت و جہالت کا پیمانہ چھلکنے کے قریب پہونچ گیا تھا، اور اُدھر دولتِ برطانیہ کی قوت اور برٹش قوم کی عاقبت اندیشی، قابلیت، جفاکشی، اپنی کوششوں اور اپنی اعلےٰ تہذیب و شائستگی کا ثمرہ پانے کی روز بروز مستحق ثابت ہوتی جاتی تھی - غیر ممکن تھا کہ دانایانِ فرنگ کی ذہانت و طباعی، خوش تدبیری و باضابطگی ہندوستان کی جہالت و خود فراموشی پر فتح نہ پاتی - زمانہ نے ساری دنیا میں تمدن کا رنگ اختیار کیا تھا، اور پکار پکار کے ہر ایک قوم سے کہہ رہا تھا کہ جو اس مذاق میں میرا ساتھ نہ دیگا، مٹ جائے گا - زمانہ کے اس ڈھنڈھورے کی آواز ہندوستان میں کسی نے نہ سُنی اور سب مٹ گئے - انھیں مٹنے والوں میں اودھ کی سلطنت بھی تھی، جسکے زوال کا الزام غریب واجد علی شاہ کو دینا خلافِ تحقیق ہے - اُن غریب کی حالت یہ ہو گئی تھی ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردۂ   باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

واجد علی شاہ نے نواب مرزا شوق کی مثنویوں کو دیکھا، اور چونکہ خود شاعر تھے، لہٰذا اس رنگ کو اختیار کر کے اپنے عنفوانِ شباب کی صد ہا رندانہ بے اعتدالیوں کو خود ہی موزوں کر کے ملک میں پھیلا دیا - اور اخلاقی دنیا میں اقراری مجرم بن گئے - میں سمجھتا ہوں کہ بادشاہ تو بادشاہ، وزرا و امراء میں بھی شاذ و نادر ہی ایسے گزرے ہونگے جنھوں نے عنفوانِ شباب میں اپنی شہوت پرستی کی ہوسوں کو جی بھر کے نہ نکال لیا ہو -

یہ بادشاہ اس قدر رحم دل اور رقیق القلب تھا کہ باوجود قدرت اس سنِ شباب میں کسی کے

ساتھ بے رحمی نہیں کی۔ نہ کسی مخالف کو ظلم سے ستایا، نہ کسی کی جان لی۔ باوجود اس سلطنت اور جاہ و حشمت اور شباب کے اس بادشاہ میں غرور و نخوت نام کو نہ تھا، جس سے ہزاروں میں بھی کوئی امیر خالی نہیں ہوتا۔ جیسے یہ بڑی صفتیں خداداد تھیں ویسے ہی غفلت اور عیش کا عیب بھی تھا۔ مگر وہ اپنی ذات کے واسطے تھا۔ بے عیب ذات خدا کی ہے۔ یہ بادشاہ اپنی ذات سے عادل تھا، کسی موافق یا مخالف، امیر یا یگانہ کے ساتھ عدل میں رعایت نہیں کی۔ یوں ہندوستانی سرکار کے اہلکار جو اپنے کام کے مالک اور محول علیہ ہوتے تھے۔ اگر انھوں نے کوئی حق تلفی کی تو انکا قصور کیا ہے۔

باوجود حسن پرستی کے کسی کی عورت پردست درازی اور زبردستی نہیں کی۔ شوہردار عورت کو سامنے نہ آنے دیتے تھے۔ حق پرستی اور خدا ترسی کا یہ عالم تھا کہ حکم تھا اگر نماز صبح کے وقت بیدار نہ ہوں تو پانؤں کھینچ لو، پانی چھڑک دیا کرو۔ تلاوت قرآن برابر فرمایا کرتے تھے۔ ہر سال پانچ لاکھ روپیہ صرف زکوٰۃ کے نکلتے اور جناب میرن صاحب قبلہ کے پاس تقسیم کو بھیجے جاتے۔ مزاج کی یہ کیفیت تھی کہ ہر فرد بشر کے سلام کا جواب دیتے۔ خوش خلقی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے اور نرمی کے ساتھ تکلم کرتے تھے۔ غرض زمانہ بھر کی خوبیاں اُنکی طبیعت میں نہایت حسن کے ساتھ راسخ تھیں۔ حافظ جلیل حسن صاحب جلیل رسالۂ تذکیر و تانیث میں لکھتے ہیں کہ حضرت اختر ہمہ گو ہمہ داں تھے۔

ایک روز بادشاہ کی سواری جا رہی تھی، ایک عورت نے سرِ راہ آکر فریاد کی کہ میری لڑکی کو جو نہایت حسین ہے، ایک زمیندار نے زبردستی چھین کر اپنے گھر میں ڈال لیا ہے۔ یہ سُن کر بادشاہ کے بدن میں لرزہ پڑ گیا اور فرطِ غضب سے زبان میں لکنت پیدا ہوگئی۔ فوراً دادرسی پر آمادہ ہوگئے۔ وہ لڑکی چھینوا کر اُس ضعیفہ کو دلوا دی اور ظالم زمیندار کو کافی سزا دی۔ اسی طرح ابراہیم خاں کا باغ جو ایک موضع میں تھا، اور بجز اُسکے اُنکی اور کوئی وجہ معاش نہ تھی۔ اتفاقاً وہ موضع نواب خورد محل کی جاگیر میں دیدیا۔ داروغہ بیگم صاحبہ نے اُس باغ پر جبریہ قبضہ کرلیا۔ ابراہیم خاں نے بادشاہ کے سامنے واویلا کی۔ خورد محل نے ضبطیِ باغ کی بابت زور دیا، مگر آپ نے فرمایا کہ امر عدالت میں ہرگز رعایت نہ ہوگی، اور زر و جاگیر مرحمت ہو جائے گی۔ آخر کار حقدار کو کامیاب فرمایا۔ سلطان عالم کو بذاتِ خاص ہمیشہ عدل گستری ملحوظ خاطر رہی۔ تا مدعلم و آگاہی انصاف رسانی میں کبھی دریغ نہ کیا۔ مہاراجہ مان سنگھ کی دختر برج راج کنور کی شادی بابو نرسنگھ نرائن سے عہد واجدی میں ہوئی، بادشاہ نے ایک موضع مسلّم جہیز میں عنایت کیا۔ جسکی معافی دولت برطانیہ

نے بھی منظور فرمائی ہے اور اب تک اُس پر قبضہ ہے۔ بادشاہ اس لڑکی کو اپنی لڑکی سمجھتے تھے۔

منشی امیر اللہ تسلیم فوجِ شاہی میں ملازم تھے، عہدِ واجدی میں انکی پلٹن توڑ دی گئی تو یہ بیکار ہو گئے۔ انھوں نے ایک منظوم عرضداشت خوشخط لکھ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کی۔ بادشاہ نے اُسپر یہ حکم لکھا۔

"تسلیم اے خوشنویس و اے خوشگو ہر دو فن یکیست و ہر دو نکو
اسم تو مندرج بدفتر شد بست و دو روپیہ مقرر شد"

چنانچہ ان کا تیس روپیہ ماہوار مقرر ہو گیا۔ شاہِ اودھ اگر سچ پوچھیے تو شاہِ سخن تھے۔ انکی سخن فہمی اور سخن سنجی اس درجہ کی تھی کہ آج تک لوگ اُنکے حالات سُن کر متحیر ہو جاتے ہیں۔ پھر اسکے ساتھ یہ.... بھی خیال کرنا چاہیے کہ اُس زمانہ میں وہ شعرائے زمانہ اور اہلِ سخن کے ملجا و ماویٰ تھے، بڑے بڑے اساتذۂ سخن اور اعلیٰ درجہ کے نازک طبع شعراء کے کلام کو اُنکی زبان سے سُن چکے تھے۔ کسی کی نسبت اُن کی زبان سے ایک لفظ کا نکل جانا بھی اعلیٰ ترین ریویو کا حکم رکھتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اودھ کے تمام سابق فرماں رواؤں میں علمی قابلیت میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ بادشاہ شعرا کی بہت قدر کرتے تھے۔

واجد علی شاہ کو موسیقی کا بھی نہایت درجہ ذوق تھا۔ اس میں ترقی کرتے کرتے بہت بڑے نائک بن گئے تھے۔ بڑے بڑے اُستاد گویّے اُن کی اُستادی کے قائل تھے اور اُن کے سامنے کان پکڑتے تھے، اور بڑے مشہور گویّے بھی اُنکے سامنے اُستادی میں پورے نہیں اُترتے تھے۔ موسیقی میں تو بادشاہ کا جواب ہی نہ تھا۔ ایسا کمال تھا کہ سیکڑوں کلاونتوں کے ہاتھ میں ناڑے بندھوا دیے۔ تُقی خاں جس نے کلکتہ میں بڑی شہرت حاصل کی تھی، اُسکی آواز اس بلا کی دلفریب تھی کہ کسی طوائف کا رنگ بھی اُس کے سامنے نہ جم سکتا تھا۔ وہ مٹیا برج میں آدھی رات کو کسی کے یہاں گا رہا تھا۔ بادشاہ نے آواز سُنی تو بیتاب ہو گئے۔ اور بڑے ذوق و شوق سے بُلوایا۔ وہ سمجھا کہ میری قسمت کھُل گئی۔ مگر بادشاہ نے اُسکا گانا سُنا تو کہا اِسکی آواز ہی آواز ہے، گانا نہیں جانتا۔ اپنے عہد میں اُنھوں نے اس علم کو بہت ترقی دی۔ خود ستار ایسا بجاتے کہ روتے لوگ ہنس پڑتے اور ہنستے رو دیتے۔ لَے اس قدر رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھی کہ پاؤں کا انگوٹھا سوتے میں بھی لَے پر چلنے لگتا۔ اسی کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ فنِ رقص میں بھی کامل مانے جاتے۔ لَے داری میں کوئی اعلیٰ درجے کا گویّا بھی بادشاہ کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اِسکو قدرت کی دین کہنا چاہیے۔ ناچ میں بادشاہ کا اُستاد دُرگا پرشاد کتھک، اور شاگرد بندادین بتایا جاتا ہے، مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ کو ناچ میں صرف اتنی بصیرت حاصل تھی کہ اگر کوئی شخص ناچ میں اور اُسکی گت میں غلطی کرتا، تو خود ہاتھ اُٹھا کے بتا دیتے کہ یوں نہیں یوں ناچو۔ یہ جو مشہور ہے کہ بادشاہ خود

ناچا کرتے تھے، بالکل غلط ہے۔ وہ نہ کبھی لکھنؤ میں ناچے اور نہ مٹیا برج میں۔ معتبر ڈھاریوں سے جو سالہا سال بادشاہ کے ساتھ رہے، اسکی تصدیق ہوتی رہی ہے جسکی صحت میں مطلق شبہ نہیں ہو سکتا۔ اور بادشاہ کے ناچنے کی جتنی تصویریں دکھائی جاتی ہیں اور لندن تک پہونچ گئی ہیں، سب فرضی، مصنوعی اور جھوٹی ہیں۔ یہ منجملہ اُن کارستانیوں کے ہیں جو رزیڈنٹ نے بادشاہ کے بدنام کرنے کے لیے اختیار کی تھیں۔ انتزاعِ سلطنت کے وقت جہاں اکثر شاہزادے، وہ خاندانِ شاہی کے نامور افراد اُنکے مخالف بنائے گئے، اور اُن کی واقعی اور غیر واقعی بُرائیاں طشت از بام کی گئیں، وہاں ناچنے کا الزام بھی اُنکے سر تھوپ دیا گیا۔ جو کچھ قیصر باغ کے میلوں کے موقع پر مشہور رہے، اُسکی اصلیت یہ ہے کہ بادشاہ ناچتے نہ تھے بلکہ کھیلتے تھے۔ تاریخوں میں ہندوستان میں کئی مسلمان بادشاہ موسیقی کے کامل اُستاد بتائے گئے ہیں، مگر میں نہیں سمجھتا کہ اُن میں سے کسی کو بھی اتنی اعلیٰ معلومات حاصل ہوں جتنی واجد علی شاہ کو حاصل تھیں۔ جن ڈھاریوں کی بادشاہ تک رسائی تھی وہ وہی تھی جو موسیقی میں پورا کمال رکھتے تھے۔ ہاں گانے میں البتہ انہماک اور ناچ دیکھنے کا بے انتہا شوق تھا۔ مگر اس میں بھی کبھی کلکتہ کی کسی بازاری طوائف کا مجرا نہیں دیکھا۔ اپنے اِس شوق کو پورا کرنے کے لیے اُنھوں نے ممتوعات کے مختلف گروہ اور طائفے بنا لیے تھے۔ ہر طائفے کو خاص انداز اور خاص قسم کا ناچ سکھایا جاتا۔ ایسے متعدد طائفے تھے، مثلاً نتھ والیاں، جھومر والیاں، لٹکن والیاں، نقل والیاں، رادھا منزل والیاں وغیرہ۔ ان سب کی تعلیم پر ڈھاڑی مقرر تھے، جو دونوں وقت تعلیم دیتے۔ بادشاہ کو جب ناچ دیکھنے کا شوق ہوتا، انھیں طائفوں کو جن میں سے اکثر بڑی خوبصورت، بانکی اور بڑی جان عورتیں تھیں، بلوا لیتے۔

ایک مرتبہ کوٹھی اسد منزل میں بادشاہ نے پندرہ روز کا جشن کیا تھا۔ کوٹھی کے ہال میں بادشاہ پلنگ پر تکیے پر جھکے بیٹھے رہتے، گرد ناز آفریں ممتوعات کا جھرمٹ ہوتا، جو فرش پر بیٹھی رہتیں۔ اور سامنے ممتوعات کے طائفے باری باری آکر مجرا کرتے۔ کسی سے بھاؤ یا گت میں کوئی غلطی ہو جاتی تو اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بتا دیتے۔ غضب کا طبلہ بجاتے تھے۔ اور بھاؤ غضب کا بتاتے تھے۔ جب کسی سے غلطی ہوتی اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے آنکھ سے بتا دیتے۔ ٹھمری ایسی کہی کہ ہندوستان میں کسی نے نہ کہی تھی۔ بادشاہ نے نئی نئی راگنیاں ایجاد کیں جنکے نام اپنی طبیعت داری سے جوگیا، کنٹر، جوہی، بادشاہ پسند وغیرہ رکھے۔ اور اچھی نہ تھی، اور کسی قدر گراں گوش بھی تھے۔ موسیقی پر کتابیں تصنیف کیں۔ مثلاً ناجو، بنی، دُھن وغیرہ۔ محرم کی ساتویں تاریخ آسمانی کوٹھی سے بادشاہی مہندی اٹھتی۔ اس میں معمول تھا کہ تقریباً ایک گھنٹہ تک خود گلے میں تاشہ ڈال کے بجاتے، بڑے بڑے نامور اور مشہور نوحے گلوں میں ڈھول ڈال کر ساتھ دیتے۔

بادشاہ ایسی صفائی، سُبکی اور خوش اسلوبی سے اور ایسی خوشگواری کے انداز سے تاشہ بجاتے کہ دھاڑی
واہ واہ کے نعرے بلند کرتے اور نہ جاننے والے بھی حیران و ششدر رہ جاتے۔ مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں صاحب
موجودہ تعلقدار محمود آباد نے مٹیابرج میں اپنی آنکھوں سے بادشاہ کو تاشہ بجاتے دیکھا ہے، جسکا لطف
آج تک انکو نہیں بھولا۔ سب سے پہلا اُردو ڈراما اندرسبھا ہے، جسکو امانت نے عہد واجدی میں تصنیف
کیا تھا۔ یہ ڈراما موسیقی دار کا سیدھی ہے۔ اندرسبھا نہ تو واجد علی شاہ کے حکم سے لکھی گئی، نہ اُسکا کھیل کبھی
قیصر باغ میں ہوا اور نہ کبھی بادشاہ اُس میں شریک ہوئے۔ بادشاہ کا راجہ اندر بننا بالکل بے اصل ہے۔
اُنھوں نے رہس میں کبھی کنھیا کا پارٹ بھی نہیں کیا۔ البتہ وہ مختلف پارٹ مختلف لوگوں کو تقسیم کر دیتے
تھے۔ چونکہ قیصر باغ کا ذکر آگیا ہے، اس لیے ہم کسی قدر اُسکے بارے میں بھی لکھتے ہیں۔ اس عالیشان
اور یادگار زمانہ عمارت کو سلطان عالم نے اسّی لاکھ روپیہ میں تیار کروایا تھا، جو پہلے کے مقابلہ میں اب
ایک کھنڈر کی سی حالت میں ہے۔ اسی قیصر باغ میں واجد علی شاہ نے نہایت پُرلطف میلہ کیا تھا جس
میں تین روز تک مسلسل اسّی ہزار وابستگانِ دامنِ دولت کو طعام خوشگوار عطا ہوا۔ بنیاد اس میلہ کی
یہ تھی، کہ واجد علی شاہ کی چھٹی کی آرزو پر اُن کی ماں نے لڑکپن میں جوگیا لباس پہنایا تھا، اس کی
سالگرہ اسی لباس سے ہوتی تھی۔ بادشاہ نے اپنے عہد سلطنت میں میلہ قرار دیدیا۔ قیصر باغ کے قریب
ایک بڑا بھاری سایہ دار درخت تھا، اُسکے نیچے گرداگرد سنگ مرمر کا ایک نفیس گول چبوترہ بنایا گیا تھا۔
جس پر قیصر باغ کے میلوں کے زمانے میں جہاں پناہ جوگی بنکے اور گیروے کپڑے پہن کے آتے اور دھونی
رما کے بیٹھتے۔ اس میلہ میں پبلک کو بھی قیصر باغ میں آنے اور جہاں پناہ کی عشرت پرستیوں کی بہار دیکھنے
کا موقع مل جاتا۔ بادشاہ نے سری کرشن جی کا رہس دیکھا تھا اور سری کرشن جی کی معشوقانہ وش عاشقی
اس قدر پسند آگئی تھی کہ اُس رہس سے خود اپنا کھیل ڈراما کے طور پر ایجاد کیا تھا۔ اُس میں ناچ
رنگ کی محفلیں گرم ہوتیں، موتیوں کو جلا کے بھبھوت رمائی جاتی، اور فقیری میں بھی شاہی کے
کرشمے نظر آتے۔ واجد علی شاہ کو رہس سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ میلہ میں شریک ہونے
کی عام اہل شہر کو اجازت ہو جاتی، مگر اس شرط سے کہ گیروے کپڑے پہن کے آئیں۔

لوگ خواہ مخواہ کو بدنام کرتے ہیں کہ بہشتنیں اور مہترانیاں واجد علی شاہ کی بیوی تھیں، مگر جو
لوگ ایسا کہتے ہیں وہ سخت مغالطہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ بادشاہ اپنے ہاتھ
سے آبدست نہیں لیتے تھے، لہٰذا کبھی گز جمالستین یا نین سُکھ کی لنگی سے آبدست کرایا جاتا، جسکو وہ
عورتیں ادھر اُدھر کھینچتیں۔ اس خدمت پر ایک بہشتن اور ایک بھنگن مقرر تھی۔ اور چونکہ ان پر

ستر ظاہر کرنا پڑتا تھا، لہذا بادشاہ نے ان دونوں کو متوعات میں داخل کرکے پہلی کو آب رساں بیگم اور
دوسری کو مصفّٰے بیگم کا خطاب دیدیا تھا - بادشاہ نے کبھی حرام نہیں کیا اور نہ کسی نامحرم عورت کو اپنے
سامنے آنے دیا - چنانچہ خدمت میں جتنی عورتیں رہتی تھیں وہ قبلہ و کعبہ کے سامنے آتیں اور قبلہ و
کعبہ تحقیق و تنقیح کے بعد اُنکے ساتھ متعہ کا صیغہ پڑھ دیتے تھے چھوٹے چھوٹے والیان ملک کی نسبت
سنتا ہوں کہ ملازمین و رعایا میں سے جسکے گھر میں چاہتے ہیں بلا تکلف زنانے میں گھس جاتے ہیں -
اور کہا جاتا ہے کہ بادشاہ اور فرماں روا سے کسی کو پردہ نہ کرنا چاہیے - واجد علی شاہ کو زندگی بھر
اس سے احتیاط رہی -

واجد علی شاہ شیعہ مذہب رکھتے تھے، اور اپنے مذہب کے پورے پورے پابند تھے - لیکن
اُنکے مزاج میں تعصب مطلق نہ تھا - بلکہ ہمیشہ فرمایا کرتے "میری دونوں آنکھوں میں سے ایک شیعہ ہے
اور ایک سُنّی" اہلکار اور عہدہ دار زیادہ تر اہل سنت میں سے تھے - ایک بار دو شخصوں میں مذہبی
اختلاف پر مارپیٹ ہوگئی، بادشاہ نے دونوں کی معزولی کا حکم دیا - بلکہ اپنے یہاں ممنوع الملازمت کردیا
اور فرمایا "ایسے لوگوں کا میرے یہاں گزر نہیں ہوسکتا" - آخر آخر میں بادشاہ کی ایک کتاب میں بعض
ایسے ناگوار الفاظ چھپ گئے تھے جن پر کلکتہ کے سُنّیوں میں بڑی شورش ہوئی - مگر اس سے لوگ واقف
نہیں ہیں کہ وہ الفاظ اصل کتاب میں نہیں، بلکہ دوسروں کی تاریخ یا تقریظ میں تھے - اور بادشاہ کو
جیسے ہی اطلاع ہوئی، بغیر کسی تحریک کے معافی مانگنے پر تیار ہوگئے - بادشاہ نہایت ہی متواضع اور
منکسر المزاج تھے، اور وضع میں بے حد سادگی تھی - حافظ جمال الدین کلکتہ کے علمائے اہل سنت میں
ایک مشہور بزرگ تھے، جن کی مسجد ناخداؤں کی مسجد کے آگے آج بھی خوب رونق پر ہے - گنڈے
تعویذ بھی کیا کرتے تھے - چنانچہ اُنھوں نے کسی کے ذریعہ سے بادشاہ کو پیام دیا کہ "اگر آپ سُنّی مذہب
اختیار کرلیں، تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ سلطنت آپ کو واپس مل جائیگی" - لیکن بادشاہ یہ سُنکر بہت
برہم ہوئے اور فرمایا "میں ایمان فروش نہیں ہوں" -

موسیقی کے سوا اور تمام حیثیتوں سے بادشاہ بڑے متقی و پرہیزگار اور پابند شرع تھے - کبھی
نماز قضا نہ ہوتی - رمضان میں تیسوں روزے رکھتے - اور محرم نہایت خلوص عقیدت سے بجالاتے -
محرم کی چوتھی تاریخ امام باڑے میں اپنا مرثیہ پڑھتے - افیون، شراب، یا اور کسی قسم کا نشہ زندگی
بھر نہیں پیا - حرام مطلق نہیں کرتے تھے - غیر ممتوعہ عورت کی صورت تک دیکھنا گوارا نہ کرتے -
تین سو ساٹھ بیگمات تھیں، اور اُن میں سے کوئی ایسی نہ تھی جسکے ساتھ از روئے شرع شریف

متعہ نہ ہوگیا ہو۔ کبھی کسی عورت کے ساتھ جبراً متعہ نہیں کیا۔ بیشک ممتوعات کی کثرت تھی، اور بادشاہ پر جو فردِ جرم لگائی گئی ہے اُس میں سب سے زیادہ سنگین یہی جرم تصور کیا جاتا ہے۔ اس پر کوئی شرعی الزام تو آ ہی نہیں سکتا، اس لیے کہ بادشاہ مذہب شیعۂ اثنا عشریہ کے پیرو تھے، لہذا اُنکے اعتقاد میں متعہ بغیر کسی حد اور قید کے شرعاً جائز تھا۔ اب رہا یہ کہ اخلاقی اور تمدنی حیثیت سے بادشاہ کو اتنی عورتوں سے متعہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اسکی حالت یہ ہے کہ بادشاہ نہایت ہی محتاط اور پرہیزگار تھے، اور اُنھیں ایک گھڑی کے لیے بھی گوارا نہ تھا کہ کسی نامحرم عورت پر اُنکی نظر پڑے۔ گر شاہی محل تھا، جس میں پیش خدمتوں، محلداروں، مغلانیوں، مکان داریوں، یہاں تک کہ کھشتنوں اور خاکروبوں کے ایک گروہ کثیر کے موجود رہنے کی ضرورت تھی۔ ممتوعات میں چند ہی تھیں جنکے ساتھ خلوت گاہ میں داخل کرنے کی غرض سے متعہ کیا گیا ہو ورنہ سب کی سب خدمتگارنیاں تھیں لیکن چونکہ متعہ ہو جاتا، لہذا جائز تھا کہ اُن میں سے کوئی پسند آئے تو خلوت میں بلالی جائے۔ معترضین نے اس بارے میں بادشاہ کی حالت پر غور نہیں کیا، اس لیے کہ ممتوعات کی کثرت تو اُن کے اتقا اور پابندیِ شرع کی دلیل تھی۔ اور اتقا بھی ایسا، جیسا معمولی مسلمانوں میں بھی کم دیکھا گیا ہے بہت سے اگلے بادشاہوں کی نسبت آپ سُنتے ہیں کہ اُنکے محل میں چند بیویوں کے ساتھ ہزاروں کنیزیں بھری ہوئی تھیں۔ اور اب بھی اگرچہ بردہ فروشی ممنوع اور جائز کنیزوں کی فراہمی کا سلسلہ مسدود ہوگیا ہے، گر ہندوستان کے مسلمان والیانِ ملک کے محل اور زنان خانے اُسی طرح بجد عورتوں سے بھرے ہوے ہیں۔ جنکے جائز و ناجائز ہونے کا کبھی اُنھیں خیال بھی نہیں آتا۔ لہذا واجدعلیشاہ نے شرعی حیلہ کی نگہداشت کے ساتھ اپنا شوق پورا کیا، تو کون اعتراض کرسکتا ہے؟

بادشاہ اپنے عزیزوں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کرتے تھے۔ حکم دیدیا تھا کہ میری لڑکیوں کی شادی میرے غریب عزیزوں، خصوصاً نیشاپوریوں میں کی جائے۔ انتقال کرنے سے چار یا پانچ سال پیشتر ناچ گانے سے توبہ کرلی تھی۔ یہی نہیں، بلکہ تمام ممتوعات اور محلات کو تحریری اطلاع دے دی تھی کہ جسکا دل چاہے میرے یہاں رہے اور جس کا دل چاہے چلی جائے، میں خوشی سے اجازت اور آزادی دیتا ہوں۔

بادشاہ کو مرغوں، بٹیروں، لووں اور مینڈھوں کی لڑائی کا شوق ضرور تھا، مگر اتنا نہیں کہ اُسی میں منہمک رہیں۔ نواب مدار الدولہ سید علی نقی خاں بہادر سُہراب جنگ وزیر اعظم کی کوٹھی واقع مٹیا برج میں مرغوں کی پالی ہوتی تھی، جس میں کلکتہ کے انگریز اپنے مرغ لاکے لڑاتے، مگر بادشاہ پالی

میں کبھی نہ گئے۔ انھوں نے دراصل بدکے کبھی بازی نہیں لگائی اور وہ جوئے سے سخت متنفر تھے۔
اپنے بزرگوں کے سن ملازمین کا ادب واحترام کرتے تھے۔ غذا بہت ہی سادی پسند تھی۔

بادشاہ کی طبیعت عشق ومحبت کی طرف مائل تھی۔ خود بھی بڑے حسین وخوبرو تھے اور غضب
کی خوبصورتی پائی تھی۔ صفائی، پاکیزگی، اور ایجاد واختراع میں طبیعت یکتائے زمانہ تھی۔ بادشاہ کا
دماغ ایسا نازک اور صحیح واقع ہوا تھا کہ بعض باتوں پر لوگوں کو حیرت ہو جاتی۔ ہر فن کے کاملین بادشاہ
کے زمانے میں موجود تھے اور بادشاہ ہنرمندوں کے قدرداں تھے۔ علم کی اچھی خاصی ترقی تھی، جسکا پتہ
اُسوقت کے مصنفین کی تصانیف سے چلتا ہے۔ سلطان عالم کی اخلاقی حالت یہ تھی کہ نہایت حق پسند،
راست گو، رعایا پرور، عالی ظرف، حلیم وبردبار تھے۔ وہ عمر بھر جھوٹ نہیں بولے۔ سخی ایسے تھے کہ
اب تک لوگ اُنھیں اور اُنکی جود وسخا کو یاد کرکے روتے ہیں۔ ملنے جلنے میں بادشاہ کی وضع وگفتگو
ایسی سادی، بھولی اور دلکش ہوتی کہ جو ایک بار مل لیتا اُسے دوبارہ ملنے کی زندگی بھر تمنا رہتی۔ زبان
ایسی شیریں وفصیح اور دل میں جگہ کرنے والی تھی کہ سننے والے کا جی چاہتا کہ جان فدا کردے۔ افسوس
کہ اُنکی زبان اُنھیں کے ساتھ قبر میں دفن ہوگئی۔ اُنکی نظموں اور تحریروں میں جو زبان ہے وہ اُنکی
بولنے والی زبان نہیں ہے۔ اُسوقت تک عام قاعدہ تھا کہ تحریر میں لوگ فارسی اور عربی کی بندشوں
کو جگہ دینا فصاحت سمجھتے تھے، اُسکا کچھ نہ کچھ اثر تعلیم کی بدولت واجد علی شاہ پر بھی تھا، لہذا اُنکی تحریر
ویسی نہ ہوتی جیسی تقریر تھی۔ کبھی کسی شخص سے ناراضی کی حالت میں بھی سخت کلامی نہیں کی۔ جب کسی
سے ناراض ہوتے چپ ہو جاتے۔ اگر کسی سے کوئی حرکت خلاف مزاج ہو جاتی تو بجائے خفا ہونے کے
ادب آموزی فرماتے۔ کسی ادنیٰ خدمتگار اور پیش خدمت کو بھی اُنھوں نے گالی نہیں دی۔

فارسی ادب وانشا میں بادشاہ بڑے بڑے منشیوں کے مدمقابل تھے۔ اُردو مادری زبان تھی۔
عربی میں بقدر فارسی ادب داں کے بصیرت رکھتے جسکا ثبوت اُنکی تصانیف ہیں۔ ہندوستان میں اتنی
تصانیف کسی بادشاہ کی نہیں جتنی واجد علی شاہ کی ہیں۔ اگرچہ شاہی مطبع جو مٹیا برج میں قائم تھا،
اُنکی تصانیف کو مسلسل شائع کرتا رہتا مگر بہت سی کتابیں اب تک نہیں چھپیں۔ واجد علی شاہ کی
تصانیف دیکھی جائیں اور اُنکی اعلیٰ قابلیت پر نظر ڈالی جائے تو یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ اس
لیاقت وقابلیت کے بادشاہ کم گزرے ہیں۔ فارسی میں ایسا کمال تھا کہ پلنگ پر لیٹے لیٹے دو دو
تین تین مسجع ومقفیٰ خطوط لکھدیتے، جنکی عبارت ابوالفضل وطاہر وحید کی انشاپردازی پر چشمک
زنی کرتی۔ اُردو کی صاف اور سادی نثر بھی نہایت اچھی لکھتے تھے۔ شاعر تھے اور شاعری سے

طبیعت و نغزی لگاؤ تھا۔ آختر تخلص کرتے تھے۔ ایسا موزوں طبع شخص لوگوں نے بہت کم دیکھا ہوگا۔ بے تکلف اور ایسی سہولت سے اشعار موزوں کرتے کہ معلوم ہوتا نثر لکھ رہے ہیں۔ ہوچے پر سوار سلطان خانے سے امام باڑہ سبطین آباد کو جا رہے تھے۔ دو محررساتھ تھے۔ ایک کو مرثیہ کے بند اور دوسرے کو سلام کے اشعار جو عبد اکبر و میں تھے تصنیف کرکے لکھواتے جاتے تھے۔ مگر دونوں میں سے کسی کا قلم رُکنے نہ پاتا تھا۔ ایک شعر لکھ چکتے کہ بادشاہ دوسرا شعر لکھوا دیتے، اسی طرح چھ بند اور پورا سلام لکھوا دیا، اور مسافت شاید دو ڈیڑھ فرلانگ سے زیادہ نہ تھی۔ آخر زمانے میں بادشاہ فارسی نثر کی کتاب محبوب القلوب کا ترجمہ اُردو نظم میں کر رہے تھے اور شام سے دس بجے رات تک بلا ناغہ ترجمہ کرتے رہتے۔ بادشاہ کی نظر اصل کتاب پر اور اُسکے بعد اپنے لکھنے کے اصل صفحے پر برابر پڑتی رہتی اور قلم بالکل نہ رُکتا۔ اسکا پتہ بھی نہ چلتا کہ موزوں کرنے کے لیے کچھ غور کرتے ہیں۔ فارسی پڑھی اور ساتھ ہی بے تکلف ترجمہ کے اشعار لکھنے لگے۔ دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا کہ گویا اُس کتاب کی نقل کر رہے ہیں۔ یہ کتاب شاید پوری نہ ہونے پائی تھی کہ انتقال کر گئے اور وفات کے بعد گورنمنٹ کے لوگوں نے جہاں اور سب چیزوں پر قبضہ کیا وہاں اُس مسودہ کو بھی اُٹھا لیگئے۔ پھر نہیں معلوم اُسکا کیا حشر ہوا۔ دیگر بادشاہوں اور امراء کی نسبت عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ اُنکے تصانیف دوسروں کے لکھے ہوئے ہیں، بادشاہ کے یہاں اسکا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ وہ سب شعرا کو اپنا شاگرد بناتے اور خود اُنکے اُستاد تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ ایک حرف یا نقطے میں بھی تغیر کر سکے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ بادشاہ کے مطبوعہ کلام میں اَوروں کے منتخب کلام کی سی حالت نہیں ہے بلکہ جا بجا لغزشیں ہیں یا ذم کے پہلو نکل آئے ہیں جن پر بادشاہ کی نظر نہیں پڑی، اور پھر کسی کی مجال تھی کہ اُسکی اصلاح کرے؟ مثنوی کے انداز سے فارسی میں ایک کتاب میں اپنا اور نواب وزیر السلطان کا مقابلہ اس شان سے کیا ہے کہ میں آفتاب ہوں تو وہ ماہتاب ہیں۔ چنانچہ ایک مصرعہ ہے "اگر او سُہا اختر من بچرخ" لکھتے لکھتے رَو میں آکے لکھ گئے ع "سخن مثل فوّارہ در نہر او" اور ساتھ ہی یہ چھپ بھی گیا۔ وزیر السلطان اسکو پڑھتے اور خفیف ہوتے۔

بادشاہ کو عمارت کا بھی بڑا شوق تھا۔ غالباً اپنی ذات سے کسی تاجدار نے اتنی عمارتیں اور باغ نہ بنوائے ہوں گے جتنے واجد علی شاہ نے اپنے کم وقت میں بنوائے۔ شاہجہاں کے بعد اس بارۂ خاص میں اگر کسی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ اس ستم زدہ شاہِ اودھ کا نام ہے۔ انکی عمارتوں اور باغوں کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں علم ریاضی میں بھی دخل تھا۔ لکھنؤ میں اُنھوں نے جتنی عمارتیں بنوائیں اُن میں سے اکثر ڈھ گئیں، صرف قیصر باغ اور سبطین آباد کی عمارت باقی ہے۔

سلطان عالم کی طبیعت تناسب و زیبائی پسند واقع ہوئی تھی۔ کوئی بھونڈی اور غیر متناسب چیز بادشاہ کی نظر کو گوارا ہی نہ تھی۔ نازک مزاجی اس درجہ کی تھی کہ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ عمارت اہتمام سے بنوائی تیاری کے بعد کج یا بدنما نظر آئی اور اسی وقت کھڑے کھڑے مالیوں کو بلوا کے اپنے سامنے کھدوا ڈالی اور پھر بنوائی۔ باغوں میں ایسی ایسی نئی خوشنما اور جدت طرازی کے انداز سے خود بادشاہ روشیں نکالتے کہ بڑے بڑے قابل انجنیر اور معزز انگریز آکر دیکھتے تو عش عش کر جاتے اور پوچھتے کہ یہ ڈیزائن کس کی نکالی ہوئی ہے۔ جب سنتے کہ خاص بادشاہ کی تجویز ہے، تو حیرت میں رہ جاتے، اور کہتے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ڈرائنگ اور ڈیزائن بنانے کے بہترین اُستاد ہیں۔

بادشاہ کی طباعی کا اصلی جوہر اُنکے دیے ہوئے خطابوں سے اور اُنکے احکام سے کھلتا ہے جو عرضداشتوں پر صادر ہوتے۔ عورتوں، مردوں، جانوروں، درختوں، کوٹھیوں، باغوں کو ہزاروں خطاب دے ڈالے۔ ان خطابوں کی خوبی اور تناسب اوسوقت معلوم ہو سکتا ہے جب وہ اشخاص یا وہ چیزیں سامنے ہوں جنکو وہ خطاب دیے گئے ہیں۔ خطاب دینا دراصل ایک ادبی فن ہے جو بادشاہوں کے لیے مخصوص ہے۔ مگر اس فن میں جو کمال واجد علی شاہ کو حاصل تھا، شاید دنیا کے کسی تاجدار کو حاصل نہ ہوگا اول تو اُنھوں نے اس قدر زیادہ خطاب دیے جتنے شاید کسی بادشاہ نے نہ دیے ہونگے۔ پھر خطاب اور خطاب پانے والوں میں جو تناسب ہوتا تھا اُس کی شاید اور لوگوں کو حس بھی نہ ہوگی۔ بادشاہ کے حافظہ کی قسم کھانا چاہیے، جس شخص یا جس چیز کو ایک بار خطاب دیدیا، پھر جب کبھی وہ نظر کے سامنے آیا اُسی خطاب سے یاد کیا۔ اوروں کے لیے اتنے خطابوں کی فہرست یاد رکھنا دشوار ہے۔ عرضداشتوں پر حکم لکھنا، علاوہ معاملہ فہمی کے اُنکے زمانہ کا بہت بڑا ادبی فن تھا۔ توقیعات کسریٰ اسی فن کی خاص کتاب ہے جو صرف بادشاہوں کی تعلیم کے لیے تالیف کی گئی ہے۔ احکام لکھنے میں بادشاہ کی معاملہ فہمی کی یہ کیفیت تھی کہ منصرم الدولہ اُس عہد کے اول درجہ کے صاحب قلم مشہور تھے۔ خوبصورت اور مقفیٰ و مسجع عبارت اور لوگ بھی لکھتے ہیں، مگر منصرم الدولہ کی یہ حالت تھی کہ ہر معاملہ کو اس طرح پیچیدہ کر کے کچھ اس انداز سے لکھتے کہ بادی النظر میں عرضی گزار کی خواہش سے انکار کرنا غیر ممکن نظر آتا، یا اور بہت سی ایسی غرضیں ایک میں ملا دیتے کہ ایک کے ساتھ سب منظور ہو جائیں، مگر بادشاہ نے کبھی ایسا نہ کیا کہ دھوکے میں آکے ایک کے ساتھ کوئی دوسری بات منظور کر دی ہو، ہمیشہ تمام پہلوؤں کو سمجھ کے حکم لکھتے۔ اور منصرم الدولہ اس بات کے قائل ہو جاتے کہ بادشاہ میری بات کی تہ تک پہونچ گئے یہ تو معاملہ فہمی کی حالت تھی۔ اسکے ساتھ شرح دستخط کے الفاظ ایسے خوبصورت اور فصیح ہوتے کہ

پڑھنے میں ہر شخص کو لطف آتا۔ افسوس اگر بادشاہ کے ایسے احکام کسی نے جمع کیے ہوتے تو آج اس
فن کی ایک ایسی کتاب مرتب ہو جاتی جو توقیعات کسریٰ سے کہیں زیادہ بکار آمد ہوتی۔ محلات عالیات
کی جانب سے جو خطوط بادشاہ کے پاس جاتے وہ تودہ نامے کہلاتے۔ یہ بجائے عرضی کے خط کی صورت
میں رنگین کاغذ پر ہوتے۔ عبارت کا رنگ عاشقانہ ہوتا اور ان میں قدیم فارسی مذاق کی عبارت آرائی
ہوتی۔ فقرے مقفیٰ و مسجع اور تشبیہات و استعارات سے بھرے ہوتے اور ان میں سے اکثر بڑے
بڑے قابل منشیوں کے لکھے ہوے ہوتے۔ بادشاہ انکا جواب اس وضع و انداز اور اسی رنگ
عبارت میں دیتے۔ اگر تودہ نامجات اور بادشاہ کے سوالوں کا کوئی مجموعہ آج موجود ہوتا تو نظر
آسکتا کہ لکھنؤ نے نثر اردو کی اصلاح میں کیسی کوشش کی اور کس درجہ کامیابی حاصل کی۔

بادشاہ کی نازک دماغی اور نفاست پسندی کی یہ حالت تھی کہ کلکتہ میں گیس کی روشنی کو دور
سے دیکھ کر پسند کیا تھا۔ حکم ہوا کہ تمام کوٹھیوں میں گیس کی روشنی کیجائے۔ گیس کا سلسلہ مٹیا برج تک
نہ تھا۔ لہذا تقریباً تین لاکھ کے صرف سے مرصع منزل کے پھاٹک کے باہر ایک فرلانگ سے کم
مسافت پر گیس کا کارخانہ بڑے اہتمام سے قائم کیا گیا اور بہت جلد تیار ہو گیا۔ باغات شاہی میں چاروں
طرف گیس کی لالٹینیں قائم ہو گئیں۔ پہلے ہی دن روشنی ہوئی اور بادشاہ حسب معمول گاڑی پر سوار
ہو کر گشت کو نکلے تو فرمایا "بھئی یہ روشنی تو آنکھوں میں گھسی جاتی ہے" اور گشت کو ملتوی کر دیا۔ دوسرے
دن لالٹینوں پر سبز شیشے چڑھا دیے گئے۔ دوسری رات کو بادشاہ گشت کو نکلے تو سبز شیشوں کو دیکھکر
خوش ہوے۔ مگر وہیں بگڑ گئے ہونگے کہ یکایک ناک بند کر لی اور فرمایا اس میں تو بڑی بو آتی ہے،
میں ایسی روشنی سے درگزرا۔ اسد منزل میں بادشاہ نے ایک جشن کیا تھا، اسکے ایک بڑے ہال
کے درمیان چاندی کے پلنگ پر بیٹھے تھے، گرد بیسیوں متاعیوں کا جھرمٹ تھا اور سامنے مجرا ہو رہا تھا
کہ یکایک بیٹھے بیٹھے بادشاہ نے ناک سکوڑی۔ داروغہ اشتیاق السلطان اٹھ کے پوچھنے لگیں،
"اے جہاں پناہ، کیا ہوا؟" فرمایا "چمپے کے پھول کی بو آتی ہے، جو مجھے ناگوار ہے"۔ کہا گیا
"چمپا یہاں کہاں؟" پھر متاعیوں کی تلاشی لی گئی تو ایک متاعی جو پندرہ بیس گز کے فاصلہ پر بیٹھی
تھی، اسکے کان میں چمپے کا پھول نکلا۔ تمام دیکھنے والوں کو حیرت ہو گئی۔

یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ سابق مہاراجہ بنارس جنھوں نے بادشاہ کو کلکتے جاتے وقت اپنا
مہمان کر لیا تھا اور حق عقیدت ادا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی، پرنس آف ویلز کے دربار میں
شریک ہونے کے لیے کلکتے آئے، تو وہاں نواب وزیر السلطان سے ملے اور بادشاہ کے ملاحظے میں

پیش کرنیکے لیے اپنی ایک عرضداشت اُنکو دی اور زبانی کہا "میں اپنی حقیقی سرکار جہاں پناہ ہی کو سمجھتا ہوں، لہذا مجھے جتنی مسرت اُنکے یہاں باریابی میں ہوگی اور کسی بات میں نہیں ہوسکتی۔ اسکے علاوہ میرے پاس چند قیمتی جواہرات بادشاہوں کے قابل ہیں، چاہتا ہوں کہ اُنھیں بادشاہ کی نذر کر دوں"۔ وزیر السلطان نے اُن سے ملادینے کا وعدہ کرلیا۔ اور اُن کی عرضداشت جس میں اسی قسم کے خیالات ظاہر کیے گئے تھے، ملاحظے میں بھیجدی۔ پھر خود حاضر ہوکر عرض کیا کہ مہاراجہ کو باریابی کی بڑی تمنا ہے۔ اور اُن جواہرات کا لالچ دیا جن کے نذر کرنے کا مہاراجہ نے زبانی وعدہ کیا تھا۔ بادشاہ نے ہوں ہاں کردی۔ اور وزیر السلطان یہ سمجھ کر کہ بادشاہ قبول کرلیں گے، واپس آئے۔ مگر جب مہاراجہ کی وہ عرضداشت دستخط ہوکر واپس آئی تو اُسکی پیشانی پر لکھا تھا "حسب دستور سابق وزیر السلطان بہادر ملاقات نماید"۔ شاہی میں معمول تھا کہ باہر کے راجہ مہاراجہ اور تعلقدار جو ملنے آتے انھیں صرف وزیر السلطنت کی باریابی نصیب ہوتی۔ اسی بنا پر بادشاہ نے عرضداشت پر یہ حکم لکھا۔ دیکھتے ہی وزیر السلطان کے ہوش اُڑ گئے، اور دوسرے روز جاکر عرض کیا کہ جہاں پناہ نے مہاراجہ کی بڑی دلشکنی فرمائی۔ ارشاد ہوا کہ "وزیر السلطان، مہاراجہ بنارس کے مجھ پر بڑے حقوق ہیں، اور میں اُس سے ضرور ملتا، مگر کہتے ہو کہ وہ کچھ جواہرات نذر کرنا چاہتا ہے۔ اب خیال کرو کہ اگر میں اُسکی نذر لوں تو ضرور ہے کہ اُس سے زیادہ قیمت کا خلعت بھی اُسے دوں۔ مگر اب میرے پاس رکھا کیا ہے جو اُسے دوں۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ اُسکی ملاقات کو ایک اچھے عنوان سے ٹال دیا جائے"۔

کلکتے میں لکھنؤ کی منتخب صحبت کا لطف ہمیشہ بادشاہ کو ملتا رہا۔ علما، شعرا، اتقیا، بذلہ سنج، اہل کمال حاضر دربار رہتے۔ نظم ونثر کا انکی بزم میں اس قدر چرچا تھا کہ تحریر در کنار تقریر میں مجال نہ تھی کہ کسی کی زبان سے کوئی غلط یا خلاف محاورہ لفظ نکل جائے۔ بادشاہ مرحوم کی کس کس بات کی تعریف کیجائے۔ مختصر یہ کہ ہمہ صفت موصوف تھے۔ اب کاہے کو ایسا ہر دلعزیز تاجدار پیدا ہوگا۔

مندرجہ بالا عبارت میں ہم نے سلطان عالم مرحوم کی زندگی کا بہت ہی مختصر خاکہ کھینچکر ناظرین کے سامنے پیش کردیا ہے، اور جو کچھ لکھا ہے وہ معتبر ذرائع سے لکھا ہے۔[1] رسالۂ نگار بابت ماہ نومبر ۱۹۲۹ء میں "سیاح کی ڈائری" کی سرخی سے ایک مضمون شایع ہوا ہے جس میں صدہا تاریخی غلطیاں ہیں

[1] علاوہ دیگر کتب کے مندرجہ ذیل کا حوالہ دیا جاتا ہے:۔ ٹیپو گپ کا جواب (منتخب واجد علی شاہ) تواریخ نادر العصر۔ قیصر التواریخ جلد دوم۔ افضل التواریخ۔ تاریخ اجودھیا۔ بوستان اودھ۔ تاریخ اودھ نجم الغنی خاں جلد پنجم۔ گذشتہ لکھنؤ۔ چمنستان مظفر۔ تاریخ ادب اردو۔

ہیں اسوقت ادبی اور معاشرتی نکتہ چینیوں سے بحث نہیں، لیکن جو کچھ واجد علی شاہ کے بارے میں لکھا ہے
اسکے متعلق بے تامل کہا جاسکتا ہے کہ وہ سراسر غلط ہے۔ وہ جھوٹ ہی نہیں بلکہ سفید جھوٹ ہے۔ واجد علیشاہ
کے وقت میں اچھوتیوں کے رواج کا کوئی ثبوت نہیں۔ اگر اس مضمون کا کچھ گڑھا گڑھایا قصہ ہے بھی تو
وہ شاہ نصیرالدین حیدر کے عہد سے متعلق ہے نہ کہ واجد علی شاہ کے زمانے سے۔ خواہ مخواہ ایسے لچر، رکیک
اور لغو امر کا واجد علی شاہ سے منسوب کرنا اُنکی انتہائی اہانت ہے۔ کسی کتاب سے ثابت نہیں ہوتا کہ
سلطان عالم مرحوم ایسے ناجائز اور سفیہانہ امور میں حصہ لیتے تھے۔ سلطان عالم ایسے بیگناہ اور ستم زدہ
تاجدار پر اتنا بڑا جھوٹا الزام لگانا اخلاق و شرافت سے حد درجہ بُعد اور غیرت و حمیت سے غایت درجہ
بے نیازی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ یہ کہنا کہ واجد علی شاہ ...... کسی نہ کسی امام زادے کو (سونی شبیہ، چینی کی مورت یا گڑیا
کی صورت میں) جنا کرتے تھے"، یا یہ لکھنا کہ "کنچنیوں یا ترون اور کسبیوں کے ساتھ مل کر" سلطان عالم
رقص کیا کرتے تھے صریح بہتان و افترا ہے۔ کسی معتبر تاریخ میں واجد علی شاہ کے بارے میں ایسے واقعات
نہیں ملتے۔ یہ کل عبارت دل سے گڑھ کے لکھی گئی ہے اور سراسر جھوٹا الزام بادشاہ مرحوم پر لگایا ہے
اور صاف ظاہر ہے کہ مضمون نگار کو تاریخ اودھ سے کوئی مس ہی نہیں ہے۔ جو بیہودہ واقعات بادشاہ
سے منسوب کیے گئے ہیں وہ شاہ موصوف کے خواب و خیال میں بھی نہ آئے ہونگے۔ ہم اُن صاحب
کو جنھوں نے سیاح کے پردہ میں اپنے دل کے جلے پھپھولے پھوڑے ہیں متنبہ کرتے ہیں کہ وہ آیندہ ایسا
اہانت انگیز، بے اصل اور لغو مضمون تحریر کرنے کی جسارت نہ کریں، ورنہ کیا عجب ہے جو اولادِ
واجد علی شاہ میں سے کوئی اُن پر ہتک حرمت کا دعوے کر دے اور پھر اُنکو لینے کے دینے پڑ جائیں۔
سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے ناپاک، چھچھورے اور جھوٹے واقعات تصنیف کرنے میں کیا مصلحت ہے
اور کونسا فائدہ اور فخر و افتخار حاصل کرنا ہے۔ بعض اڈیٹروں کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے رسالہ کی اشاعت
بڑھانے کے لیے ایسے فضول واقعات لکھ دیا کرتے ہیں جنکی کوئی اصلیت نہیں ہوتی، اور اسکا نتیجہ یہ ہوتا
ہے کہ بحث و مباحثہ کا بازار گرم ہو جاتا ہے، اور پبلک اُس رسالہ کی طرف تھوڑے زمانے تک متوجہ
رہتی ہے اور باقی خیر صلاح۔ نگار کو واجد علی شاہ میں عیوب کے سوا اگر کوئی خوبی نظر نہ آئی تو یہ کوئی
تعجب خیز امر نہیں۔ کیونکہ ہر شخص کو بُرا کہنا اُس کا شعار رہے۔

جان عالم واجد علی شاہ کا عہد حکومت مجبوریوں کا دلخراش کن دفتر ہے۔ اہل دل جب دیکھے گا
تو لہو کے آنسو روئے گا۔ ان کے لیے اُن کی تخت گاہ میدان قیامت بن گئی تھی۔ ایک طرف
کمپنی بہادر کی بازپرس، دوسری طرف اپنے اعضا و جوارح کی دشمنی، ایسا دل شکن منظر ہے جسپر

اصلاحِ سخن

مرتبہ کرمی محمد عبدالعلی صاحب شوق سندیلوی پر اس قدر کافی اور اس درجہ بلند تبصرے ہو چکے ہیں کہ اب انکی تعداد میں نہ اضافہ کی ضرورت ہے نہ گنجائش، تاہم میری یہ رائے ضرور ہے کہ ایسے بے نظیر مجموعہ پر ایک مستقل، عمیق اور مبسوط نظر کی جائے، تاکہ اس نازک اور اہم مبحث پر جسکو یہ تالیف بحیثیت مجموعی پیش کرتی ہے، ادبی فرصت میں علمی توجہ کی جاسکے۔ مگر یہ لایق لوگوں کا کام ہے، میری یہ چند سطریں محض اشتہاری حیثیت سے ہیں!

اس تالیف عجیب کی ترتیب یہ ہے کہ ابتدائی میں صفحات تعریب، دیباچہ، مقدمہ اور التماس پر مشتمل ہیں! اس سلسلہ میں مقدمہ، جو ادیب بے نظیر استاد المعظم جناب سلطان حیدر صاحب جوش کے قلم معجز رقم کی فکر بلیغ کا نتیجہ ہے، خصوصیت کے ساتھ قابل تذکرہ ہے! یہ مقدمہ بجائے خود ایک مستقل اور بلند چیز ہے اور دنیائے ادب کے لیے ایک مایۂ ناز اضافہ!! اسکے بعد مؤلف کی چودہ غزلوں پر کم و بیش تین درجن اساتذۂ حاضرہ کی اصلاحوں کا سلسلہ ہے جسکی ترتیب میں یہ اہتمام مدنظر رکھا گیا ہے کہ ایک صفحہ پر جلی قلم سے اصلی غزل لکھی ہے، پھر اسی غزل کا ہر شعر دوسرے صفحات پر جلی قلم سے لکھا ہے، حاشیہ پر مصلحینِ سخن کے تخلص، اور تخلص کے محاذ میں اصلاح! نقوش اصلاح بجنسہٖ بلا کسی ردو بدل کے پیش کیے گئے ہیں، اس سلسلہ کے بعد اساتذہ کے جو خطوط نکاتِ ادبیہ کا گنجینہ نظر آئے وہ بھی ضمیمہ کے طور پر آخر کتاب میں درج ہیں۔

اس مجموعۂ نادر و لطیف کی حیرت انگیز دل آویزی کا راز، ناقدانِ سخن کے قلم سے ایک ہی شعر پر حد درجہ مختلف اور متضاد اصلاحوں میں مضمر ہے! اور اس لحاظ سے اگرچہ ان اصلاحوں کی خصوصیات کو محصور کرنا قریب قریب محال ہے، ہم کو اصلاح کی تین مختلف صورتیں نظر آتی ہیں (۱) ایک صورت تو اصلاح کی وہ ہے جس سے اصلی شعر میں لفظی یا معنوی ترقی پیدا ہوتی ہے۔ (۲) دوسری صورت وہ بلندیٔ فکر ہے جو اصل شعر کو متبذل اور پست کر دیتی ہے۔ اور (۳) تیسری کیفیت وہ اُستادانہ ستم ظریفی ہے جسے اصل شعر کے ساتھ بجز قافیہ پیمائی کے کوئی بعید تعلق بھی نہیں۔ مثلاً مؤلف کا حُسن مطلع ہے:

(۱) یوں ترے عشق میں انگشت نما ہو جانا ۔۔۔ آج پورا تھا مقدر کا لکھا ہو جانا ۔۔ مط

حضرت آرزو کے ذرا سے تصرف نے شعر کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا، فرماتے ہیں

میری تقدیر کو چمکا کے بتا دیگا ہلال — یوں ترے عشق میں انگشت نما ہو جانا

حضرت ناطق کی مندرجۂ ذیل اصلاح بھی کس قدر پاکیزہ ہے

شہرتِ عشق کی معراج ہے، مانندِ ہلال — تیرے بدنام کا انگشت نما ہو جانا

یہ دونوں اصلاحیں اپنی اپنی جگہ پر خوب ہیں، مگر فن کے اعتبار سے حضرت آرزو کی اصلاح کا پایہ یقیناً بلند تر

اب ایک نازک خیال کہنہ مشق کی اصلاح سے بھی لطف حاصل کیجیے

بزمِ اغیار میں اُس بت کا تقاضا ہو جانا — جاں نثاروں کا ہے انگشت نما ہو جانا

" انگشت نمائی " کی پھیر کے علاوہ باوجود کافی غور کے شاگرد اور اُستاد کے شعر میں کوئی مناسبت مجھے نظر نہیں آتی۔ باوجودیکہ اصلاح از سرتاپا نیا تخیل پیش کرتی ہے، جسکو اصلاح کہنا گناہ ہے، تاہم شعر میں کوئی بلندی نہیں پیدا ہوئی!

(۲) ساتھ پروانوں کے جل جل کے دلِ شمع نصیب — داخلِ ملتِ اربابِ وفا ہو جانا

دو اُستاد اس شعر کو صحیح بتاتے ہیں، آٹھ سخنور اس میں قلم لگانے کی ضرورت نہیں سمجھتے، مگر ایک استاد یہ فرماتے ہیں " اصلاحوں کو دیکھ لیا کیجیے کہ معنی بھی دیتی ہیں یا نہیں، 'شمع نصیب' کچھ معنی نہیں دیتا " فقط قلم زد۔ ایک دوسرے اُستاد کو بھی ترکیب صحیح معلوم ہوتی ہے مگر بلحاظ معنی وہ بھی اسکو مہمل قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ رقم طراز ہیں " جب حرماں نصیب وہ ہے جسکے نصیب میں حرماں ہو، تو شمع نصیب وہ ہے جس کے نصیب میں شمع ہو " !

اب معلوم نہیں کہ متذکرۂ صدر دو کم درجن [illegible] نقادانِ سخن اور اُستادانِ فن کی رائے صحیح ہے! مؤخر الذکر مصلحین کی۔ شاگرد غریب کیا کرے، کس کی رائے کو صحیح سمجھے اور کس کے فیصلہ کو غلط قرار دے اور کیوں ؟؟ بقول غالب مرحوم، جس طرح انبیاء اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعۃ تھے، اسی طرح عصر حاضرہ کے تمام اساتذہ شریعتِ شاعری کے پیغمبران اولوالعزم ہیں، اور اُن کے خلاف کچھ کہنا ایمان میں تزلزل پیدا کرنا ہے! شمع نصیب یقیناً مہمل ترکیب ہے اور جن حضرات نے اس سقم کو نظر انداز کر دیا اُنکی لغزش ہرگز اس قابل نہیں کہ نظر انداز کر دی جائے۔ معنی کے لحاظ سے شعر یقیناً پست تھا، چنانچہ ایک صاحب نے اسکو کیسا بلند فرمایا

منہ سے کہنا تو ہے آسان، بہت مشکل ہے — داخلِ ملتِ اربابِ وفا ہو جانا

کس خوبی سے شاگرد کی مشکل آسان فرمائی ہے!!

(۳) آخری وقت بھی کیا ساتھ نباہا دل نے   روٹھنا اُنکا، اِدھر دَم کا خفا ہو جانا

معلوم نہیں فن شاعری میں کون سی صنعت ہے کہ شاگرد کے شعر اور اُستاد کی اصلاح میں بجز ہم قافیہ ہونے کے اور کوئی رشتہ یا رابطہ نہ ہو! مندرجۂ ذیل اصلاح میں اس صنعت کے اہتمام کو ملاحظہ فرمائیں

پھر اسی طرح سے کرتا ہے بالا دل کو   پھر اسی طرح سے اک بار خفا ہو جانا

اس شعر کے متعلق حسب ذیل ارشادات بھی کس قدر دلچسپ اور خوب ہیں:-

(۱) دَم کا خفا ہو جانا کیا؟ (۲) آخری وقت کون کس سے روٹھتا ہے، اُس وقت تو ضرور رحم آجاتا ہے۔ (۳) دَم کا خفا ہو جانا یعنی مرگ مستعمل نہیں بلکہ اسکے معنی انقباض نفس، دَم گھٹنے کے ہیں! عجیب تماشہ ہے کہ ان نقائص کے باوجود تین حضرات اسی شعر پر صاد بناتے ہیں، اور پچھ مسلمہ اساتذہ ضرورتِ اصلاح نہیں دیکھتے!!

(۴) خوبرویوں سے کہیں کرکے محبت اے شوق   نہ خدا کے لیے محصورِ بلا ہو جانا

پہلے جناب آرزو کی لاجواب اصلاح ملاحظہ فرمائیں! ع پھیر قسمت کا ہے اُس زلف کی الفت اے شوق!!

اسی مقطع کی مندرجۂ ذیل فصاحتِ اصلاح اور شگفتگیِ الفاظ کُند سے کُند طبیعت میں انشاء اللہ گُدگُدی پیدا کر دیگی، اور یہی حاصلِ اصلاح ہے:-

دام ہے دام حسینوں کی محبت اے شوق   دیکھنا "یار" نہ محصورِ بلا ہو جانا

"یار" کا نگینہ اس قدر عجیب تصرف ہے کہ توبہ بھلی!!!

(۵) زباں سے اُف نہ کرنا شمع ساں جل جلکے مرجانا   بالآخر رفتہ رفتہ حدِ ہستی سے گزر جانا   ص ۳۸

اس شعر کی اصلاح کا سہرا بھی حضرت آرزو کے سر ہے۔ اُسی قافیہ اور ردیف میں اصل شعر کو تھوڑے لفظی تغیر سے کس درجہ بلند کر دیا

طریقِ شمع ہے اپنی جگہ جل جل کے مرجانا   نہ بڑھنا اک قدم اور حدِ ہستی سے گزر جانا

اسی شعر کی مندرجۂ ذیل اصلاح بھی اعلیٰ اور نازک ہے، البتہ عام دماغ کے احاطۂ ادراک سے بہت بلند!

تپ الفت چڑھی تو ہے نتیجہ اسکا مرجانا   یہ کیا دریا ہے؟ جسکا سہل ہو چڑھ کر اُتر جانا

اس اُتار چڑھاؤ کی کیفیت کو کسی ماہر علم موسیقی سے پوچھیے!!

(۶) یہ نشاں پائے گئے گم شدہ دیوانوں کے   ٹکڑے کچھ آئے ہیں صحرا سے گریبانوں کے   ص ۱۳۸

اس غزل کے متعلق لسان العصر حضرت اکبر مرحوم کی رائے تھی "یہ غزل نہایت عمدہ ہے! داد دیتا ہوں! الفاظ سبک، بندش چست، قوافی میں احتیاط، خدا ایسی طبیعت مبارک کرے"۔

مگر ایک دقیقہ رس بزرگ مندرجۂ صدر مطلع کی اصلاح میں فرماتے ہیں " نشان کس نے پائے اور

گریبانوں کے ٹکڑے کون لایا؟ بالکل مبہم ہے۔ شگفتگی اور فصاحت نہیں، حشو بھی ہے"۔

ایک دوسرے مستند خوش فہم اصلاح فرماتے ہیں

ٹکڑے کچھ آئے ہیں صحرا سے گریبانوں کے   اور کچھ کھوج تو چلتے نہیں دیوانوں کے

اگر اب بھی شعر میں کوئی "پوچ" بات باقی رہ گئی ہو تو یہ شعر کی شومیِ تقدیر!!!

(۷) ایسی کیا خوشخبری لائے ہوا کے جھونکے   دل مسرت سے اچھلنے لگے دیوانوں کے

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بفضلہ ایک کم دو درجن اساتذہ کے حضور میں یہ شعر اصلاح کے لیے گزرا گیا ہے۔ منجملہ اس تعدادِ کثیر کے صرف ایک محترم کی نظرِ جُز رس اس عیب تک پہونچی کہ "خوشخبری" میں "ی" غلط ہے، "خوش خبر چاہیے' خوش خبری بے معنی لفظ ہے"۔ یہی دقیقہ شناس پھر ارقام فرماتے ہیں "مسرت کی وجہ نہیں بتائی گئی، نہ یہ بتایا گیا کہ خوش خبر کیا ہے۔ بہرحال شعر بے تکا ہے"۔!!!

اسی شعر پر ایک دوسرے نازک دماغ مضموں آفریں کی اصلاح، اصلاح کے صحیح مفہوم کی کس درجہ آئینہ دار ہے۔ ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے

میں وہ دیوانہ ہوں مجنوں بھی مجھے کہتا ہے   قبلۂ و کعبہ گر آپ ہیں دیوانوں کے

مجنوں کی زبان سے دیوانوں کے قبلہ و کعبہ ہونے کی سند!!! کس غضب کی تلاش ہے!

لطیف بود حکایت دراز تر گفتم۔ اس لیے محض ایک نمونہ اور

(۸) ہے کبھی جامہ دری اور کبھی بخیہ گری   جوش وحشت میں یہ دو شغل ہیں دیوانوں کے   ص۱۴۰

اس شعر کی مندرجۂ ذیل اصلاح دیکھ کر میں تو اِن اُستاد کی تائیدِ غیبی کا غائبانہ کلمہ گو ہوں۔ فرماتے ہیں

وجد کرتے ہیں بیاباں میں بگولے لاکھوں   عُرس ہوتے ہیں بڑی دھوم سے دیوانوں کے

شاگرد کے شعر کو کیا سنوارا ہے، سبحان اللہ! سبحان اللہ! اصلاح کیا، معجز نمائی ہے! واقعی،

ایں سعادت بزورِ بازو نیست + تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!!

صرف یہی نہیں کہ فرداً فرداً اشعار کی اصلاح میں یہ متضاد کیفیات جلوہ گر ہوں، بلکہ پوری کی پوری غزلوں پر رائے قائم ہونے میں بھی یہی بندوبست نظر آتا ہے! "اب اپنا دلِ تنگ ہے زندانِ تمنا" ص۱۴۲

ایک دعا گو رقمطراز ہیں "یہ غزل آپ نے خوب کہی ہے۔ بارک اللہ تعالیٰ فی عمرکم"۔ ایک دوسرا قلمِ فیض رقم یوں گہر بار ہے "تمنا کی ردیف والی غزل اصولِ فن سے بہت ہیچ ہوئی تھی۔ ایسی ردیفوں کی غزلیں سوا فضول تصنع کے لطیف نہیں ہو سکتیں"۔ ایک تیسری تراوشِ قلم ہے "اکثر شعر بے تُکے ہیں۔ طبیعت بیحد محظوظ ہوئی۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"۔

سطورِ بالا میں محض چار اور چار آٹھ اشعار کی اصلاح سے جستہ جستہ مناظر پیشکش ناظرین کیے گئے ہیں! جب گنتی کے اشعار میں اختلافات کی یہ افراط اور اصلاح کا یہ رنگ ہے تو ساری کتاب کس قدر مختلف اور رنگا رنگ اصلاحوں کا گلدستہ ہوگی!!! قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔

السنۂ موجودہ کی ارتقائی تاریخ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر زبان اپنے مدارجِ تکوین میں قواعد و ضوابط کی قید سے مستغنی ہے! لیکن ابتدائی مدارج طے کرنے کے بعد اصول و قوانین کی پابندی اُسکی بقا اور توسیع کے لیے لازمی اور لابدی! یہ کلیہ مسلمہ اور متفقہ ہے کہ کوئی زبان پابندیِ اصول و قواعد کے بغیر واقعی زبان نہیں بن سکتی! اگر دنیا کی کسی زبان کے قیام اور وسعت کے لیے ایک معیار اور ضابطہ کی ضرورت ہے تو اُردو کے لیے بدرجہ اولیٰ بلکہ بدرجہ اتم!!

مکرمی عبدالعلی شوق کی تالیف اگر نظرِ انصاف سے دیکھا جائے، تو بڑی ضروری اور وقت کی چیز ہے! ایک ایسی تالیف جو ہمارے نقائص کا آئینہ ہو! ایک ایسا مجموعہ جو ہم کو ہمارے معائب سے آگاہ کرتا ہو! اور ایک ایسا گلدستہ جو ہماری زبان کے لیے ایک معیار اور ضابطہ کی ضرورت پر تیز روشنی ڈالتا ہو (عام اس سے کہ عرفِ عام میں اسے اصلاحِ سخن کہیں یا اصلاح المصلحین) ازبس قابلِ قدر اور لائقِ تحسین ہے۔ اس تالیف کا مولف فی الحقیقت اپنی ندرتِ خیال، ثباتِ قدم، اور خدمتگزاری زبان کے لیے مستحقِ مبارکباد ہے!!!

محمد صادق حسین بی اے۔ (علیگ)

کعبے سے دُور سامنے کوئے بتاں کے ہیں
ہم دل سے پوچھتے ہیں ارادے کہاں کے ہیں

سجدے کی آرزو ہے قریب آستاں کے ہیں
تیور بُرے ابھی سے ترے پاسباں کے ہیں

صیاد پھر جلا نہ گا مند سے قفس کے پاس
تنکے جلے ہوے جو مرے آشیاں کے ہیں

اُنکے مزار دیکھنے والے بھی رو دیے
مارے ہوے جو اُس نگہِ جانستاں کے ہیں

سینے میں سوز، دل میں ہے کاوش، جگر میں درد
جتنے کرم یہ ہم پہ ہیں اک مہرباں کے ہیں

سب پر طوافِ کوئے خرابات فرض ہے
جتنے مُرید حضرتِ پیرِ مغاں کے ہیں

ایمان کی یہ ہے وہ بڑے خوش نصیب ہیں
سجدے نصیب جنکو ترے آستاں کے ہیں

مشکل ہے میرے ٹوٹے ہوے دل کا جوڑنا
سمجھو تو پہلے کون سے ٹکڑے کہاں کے ہیں

مُنہ پھیر کر چلے ہیں جگر اُن سے پوچھ لو
دل خاک میں ملا کے ارادے کہاں کے ہیں

حکیم جگر صدیقی زمیندار بہوال

امین الدولہ پارک میں

(۲)

شبابِ ترکِ موالات

امین آباد اور امین الدولہ پارک اُس سرزمین پر تعمیر ہوئے ہیں، جہاں کسی زمانے میں نواب امین الدولہ کا باغ تھا۔ اسکی بنا ایسے مبارک وقت ڈالی گئی تھی کہ اُس وقت سے اسوقت تک یہ جگہ آباد چلی آتی ہے۔ میں کسی دوسرے موقع پر دکھلا چکا ہوں کہ لکھنؤ میونسپلٹی نے دونوں پارکوں کی کس بے دردی سے قطع و برید کر دی ہے۔ لیکن ناظرینِ سطور ہذا میں سے بہتوں کے پیش نظر وہ نقشہ ہوگا جو قطع و برید سے قبل تھا۔ درمیان کی فراخ سڑک کی طرف دونوں پارکوں میں لوہے کا جنگلا لگا ہوا تھا، اور اس جنگلے سے ملے ہوئے کشادہ چبوترے یا پلیٹ فارم تھے۔ بکثرت لوگ ان چبوتروں پر شام کو آکر ٹہلتے تھے اور سڑک پر گزرنے والے ہجوم خلائق کے گوناگوں تغیرات کا نظارہ کرتے تھے۔ آپ کسی دن یہاں آکر کھڑے ہوتے، مختلف اقوام اور مختلف ملکوں کے لوگوں کا نظارہ یہاں سے کرتے۔ چینی اپنے ڈھیلے پتلون اور سوتی لاٹوپی میں، مدراسی اپنی مخصوص پگڑی میں، عرب جبہ و دستار میں، پستہ قد نیپالی، برہنہ سر بنگالی، صافے باز پنجابی، خوبرو گجراتی اور پارسی، "داڑھی باز" سکھ، اور تقوے شکن بلوچنیں ——— ان میں سے کچھ ہیں جو ان چبوتروں سے سڑک پر گزرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کسی دن کابلیوں کا ناچ آپ یہاں سے دیکھتے، کسی دن سکھوں کے گرنتھ صاحب ادھر سے گزرتے، کبھی محرم کے تعزیے، علم اور براق آپ کو نظر آتے۔ دسہرے کا عظیم الشان جلوس، دیوالی کی نظر فریب روشنی، محفلِ میلاد کا رنگین جشن، یہیں سے دیکھتے ہیں.... آتا تھا۔ محمد علی اور شوکت علی اپنے ایامِ زریں میں اسی طرف سے جلوس میں نکلے تھے۔ ۱۹۱۶ء کے کانگریس کے زمانے میں اینی بسنٹ اور تلک، جناح اور مزمدار کے جلوس بھی اسی جانب سے گزرے تھے۔ راجہ غلام حسین خان کی [illegible] جنگی موت پر لکھنؤ نے قومی ماتم کیا تھا، اسی طرف سے نکلا تھا۔ اور نواب سلیمان قدر کی لاش جب کربلا جا رہی تھی، شاہی تزک و احتشام سے اسی جانب سے نکلی تھی اور نواب امین الدولہ کے باغ کی سرزمین نے شاہی ماہی مراتب کو شاید آخری سلام کیا تھا۔

ادھر شام ہوئی کہ طرح طرح کی خوشبوئیں مشام جاں کو معطر کرنے لگیں۔ کوئی تنبولی کی دوکان پہ
لائی کا شربت پیتا تھا۔ کوئی پاکیزہ پان والوں سے لذیذ گلوریاں خریدتا تھا۔ گنیش گنج کی طرف کے ٹکڑ
پر ریوڑیوں کی دوکان پر جم غفیر لگا رہتا تھا۔ کہیں سے لیلیٰ کی انگلیاں اور مجنوں کی پسلیاں فروخت ہونے
کی صدا کانوں میں آتی تھی۔ کہیں سے گلاب گنڈیریوں کی آواز کانوں کو سنائی دیتی تھی۔ میوہ فروشوں کی
دوکانیں رنگا رنگ میووں سے بھری رہتی تھیں۔ تربوز کی سرخ پھانکیں "من قاش فروش دل صد پارہ خویشم"
کا مشہور مصرعہ یاد دلاتی تھیں۔ اور خربوزوں کی خوش ترتیب ڈھیریاں لکھنؤ کی نفاست کا نقشہ آنکھوں
کے سامنے پیش کرتی تھیں۔

سورج غروب ہوا، اللہ اکبر کی صدا کانوں میں آتی۔ تھوڑی دیر میں وحدت، سادگی، اخوت،
مساوات، اور فوجی تنظیم کا دلکش نظارہ آپ کے سامنے تھا۔ کیا زمانہ تھا اور کیا دن تھے۔

تارکین موالات کا جب "خروج" ہوا ہے اسکے شباب کے زمانے میں ان پارکوں اور انکے دربانوں
کی رش نے اہم حصہ لیا۔ اُس زمانے میں ——— اور اسکے بعد اب تک ———
امین آباد کا جنوبی چوراہا اخبار فروشی کا مرکز تھا۔ سارے ہندوستان کے اخبارات یہاں فروخت ہوتے
تھے۔ اخبار فروشوں کی صدائیں بعض اوقات در اصل مضحکہ خیز ہوتی تھیں لیکن اُسوقت وہی صدائیں لوگوں
کے دلوں میں گھر کر لیتی تھیں۔ جس خبر سے حکومتِ وقت یا اُسکے موالاتیوں کی تذلیل ہوتی تھی۔ کان اُنکے
سننے کے منتظر رہتے تھے۔ لوگ ایسی خبروں کو اس حقارت آمیز مسرت سے سنتے تھے گویا اپنے غنیم کی شکست
خوردہ فوج کا حال سن رہے ہیں۔ جن لوگوں کو اُن ایام کی یاد ہے اُنکو خیال ہوگا کہ "پنڈت ملک نرائن
کی کرکری" اور "چلتے چلاتے شاہزادہ نے ایک شیر مار لیا" کی صدائیں سن کر عوام کس قدر معنی خیز
فاتحانہ مسرت کا اظہار کرتے تھے۔

اخبار فروشوں کے گروہ سے آپ بمشکل نکلے تھے کہ تصاویر فروشوں نے آگھیرا۔ برہنہ مہاتما گاندھی،
پابزنجیر محمد علی و شوکت علی، مجسمۂ استقلال ابو الکلام، صاحب جبروت تلک، باوقار سی آر داس، متبسم
موتی لال، اور بے نقاب بی اماں ——— آج اگر آپ کو یہ تصاویر دکھلائی جائیں، کوئی خاص
بات نہ، یا اگر آپ ان کی جانب نگاہ بھی نہ اٹھائیں گے اور اگر دیکھیں گے بھی تو اُن میں بے اعتدال شوخ
رنگوں کا استعمال دیکھ کر آپ مصور کی مبتدیانہ کاوشوں پر ہنسیں گے۔ لیکن اُسوقت یہی تصاویر سیاسی
موقلم سے کھینچی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ مہاتما کی عریانی، محمد علی اور شوکت علی کی قید خانے کی پوشاک اور تلک
کی پیشانی کی شکنوں میں اہل ہند کی سیاسی جد و جہد کی داستان نظر آتی تھی۔

اخبار فروشوں کے بعد کتب فروشوں کا مجمع تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر چھوٹی چھوٹی نظمیں فروخت کرتے تھے جن میں یا تو اُس زمانہ کے واقعات یا اُس زمانہ کے سیاسی رہنماؤں کے حالات رجزیہ پیرایہ میں نظم کیے جاتے تھے۔ ان کتب فروشوں میں سے بعض دو ایک بند اور بعض پوری پوری نظمیں بڑے جوش و خروش سے گا کر سُناتے تھے۔ اِن نظموں میں عروض و قافیہ، نازک خیالی یا شاعرانہ رنگینی کا بہت کم خیال کیا جاتا تھا۔ تاہم انکے موزوں کرنے والے نفسیاتِ ترغیب اور اجتماعیات سے عملی واقفیت رکھتے تھے۔ گو اُنکے طرز بھدے، کنایے بے ڈھنگے، شوخی بے معنی، بندشِ الفاظ ڈھیلی ڈھالی ہوتی تھی لیکن اُنکے زود فہم فقرے، سستی ظرافت، بیباک واقعہ نگاری عوام کو بہت پسند تھی۔ ان میں سے ایک نظم کا ایک شعر بہت ہی مشہور اور اُس زمانے میں مقبول تھا۔ وہو ہذا

بولیں اماں محمد علی کی　　"جان، بیٹا، خلافت پہ دیدو"

مذکورۂ بالا "شعر" کو دیکھیے۔ "اماں" "جان، بیٹا" کے ٹکڑے اور "دیدو" میں "دال" کا غیر موسیقی تواتر کانوں کو کیسے ناگوار گزرتے ہیں اور ذرا اپنے حافظۂ سامعی پر زور دیکر اُس لہجہ اور لحن کو خیال میں لائیے جس سے یہ "شعر" گایا جاتا تھا اور "دیدو" کے پہلے ٹکڑے کے تلفظ (بروزن دے بمعنی شراب) پر غور کیجیے۔ یہ انتہائی بدمذاقی نہیں تو اور کیا ہے۔ لیکن اُس زمانہ میں شخصی دل و دماغ معطل تھے ہر شخص اجتماعی آنکھوں سے دیکھتا تھا، اجتماعی کانوں سے سنتا تھا، اور اجتماعی دماغ سے غور کرتا تھا اس قسم کے اشعار عوام سے خراجِ تحسین وصول کرتے تھے اور بڑے بڑے تارکین موالات جن کی خوش مذاقی کا میں کبھی قائل نہ تھا، اِن پر سر دُھنتے تھے۔

کتب فروشوں کے گروہ سے اور آگے بڑھیے، شاہی چوراہے پر پولیس کانسٹبل کا جو اسٹینڈ تھا ——— اور اب بھی ہے ——— اُس پر آئے دن نئے نئے اشتہارات تارکینِ موالات کی جانب سے چسپاں ہوتے تھے۔ اُنکے پڑھنے کو جوق جوق لوگ آتے تھے۔ یہیں سے شہر کے بڑے حصہ میں روز کی تازہ خبریں اور ہونے والے جلسوں اور مظاہروں کی اطلاعیں پہونچتی تھیں اور اصل یہ ہے کہ یہی جگہ اہالیِ شہر کی نبض شناسی کے واسطے نہایت موزوں تھی، اس لیے کہ لوگ اسی جگہ آپس میں ہر ایک معاملہ پر اظہار رائے شروع کردیتے تھے۔ روزانہ کے اس جمِ غفیر میں ——— کیا رائے اور خیالات، اور کیا پوشاک اور گفتار ——— کوئی بات مشترک نہ تھی بجز سفید گاندھی ٹوپی کے، جو لوگوں کو اس قدر مرغوب تھی کہ کڑاکے کے جاڑے میں بھی لوگوں کو اس سے سبکدوش نہ ہونے دیتے تھے

(۳)

اسلام اور ترکِ موالات*

(ایک آزادانہ موازنہ)

نفسیاتِ اجتماع سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے واسطے "تارکینِ موالات کا "خروج" ایک
باریک لیکن حیرت انگیز مسئلہ ہے۔ مہاتما گاندھی کی فتوحات تاریخ ترکِ موالات کا ایک اہم جزو ہیں۔ نام ونمود
سے مہاتما کو کوئی تعلق نہیں۔ ظاہری وجاہت ——— جسکا ہمارا ہر مولوی مع اپنی دراز ریش، باجبروت
آواز، پُرجلال جبہ وعمامہ، اور سُرمگیں نہیں بلکہ سرمہ آلود آنکھوں کے صحیح معنوں میں دعویدار ہوسکتا ہے
مہاتما گاندھی کو چھو نہیں گئی ہے۔ اُنکی پُرشکن پیشانی، اُنکے موٹے ہونٹ، اُنکا گھٹا ہوا سر، اُنکا نحیف
جسم، اُنکی بدہیئت برہنگی، مجموعاً و منفرداً، تحریکِ ترکِ موالات کے پیغمبر کی نہایت ہی بھونڈی تصویر
پیش کرتے ہیں۔ اُنکی تقریر روکھی پھیکی ہوتی ہے، اُنکی تحریر کی سادگی بعض اوقات درجۂ خطا تک
پہونچ جاتی ہے۔ لیکن اُنھوں نے وقت شناسی سے کام لیا، اور اپنے کام کی کامیابی کے واسطے
بہت جلد لمحۂ نفسیاتی کا اندازہ لگایا۔ ارادتاً مطالباتِ سیاسی کو مبہم الفاظ میں بیان کیا گیا۔ سوراج
کی صاف اور صریح الفاظ میں تعریف کرنے سے عمداً گریز کیا گیا۔ ان باتوں کا یہ سودمند نتیجہ نکلا کہ ہر شخص
اور ہر جماعت نے بمصداقِ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست، اپنے ذہن میں اپنی رائے کے موافق سوراج
کے معنی سمجھ لیے۔ کسی کے مذہبی جذبات کو اُبھار کر، کسی کے سیاسی رجحانات کو برانگیختہ کرکے، کسی
کی اشخاص پرستی سے فائدہ اُٹھاکر، کسی کو پیامِ محبت سُناکر، کسی کے انقلابی اور تشدد پسند جذبات کو
قابو میں لاکر، کسی کو اقتصادی معموں کا حل بتاکر، کسی کے سامنے تاریخِ سیاسیات کے اوراقِ پریشاں
پیش کرکے سودیشی اور بدیشی کا سوال اُٹھاکر، چرخے اور کھدر کے فوائد بیان کرکے، غرض ہر ممکن طریقے
سے حکومتِ وقت کے خلاف جذبات اُبھار کر اُن کو ایک مرکز پر لانے میں کامیابی حاصل کی گئی۔ افراد
کو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں، چھوٹی ٹولیوں کو مختلف گروہوں میں، مختلف گروہوں کو مذہبی اور معاشی
جماعتوں میں، اور ان جماعتوں کو ایک متحدہ قوم کی صورت میں بہت ہی سُرعت کے ساتھ تبدیل کیا گیا۔
آپ کاغذ کا ایک مربع، ایک مستطیل، ایک دائرہ، اور دیگر اشکال ریاضی بنالیجے، اُنکے نقاط مرکزی
کو ایک کیل سے چُبھوئیے، اور اُس کیل کو بہت زبردست قوت سے اسکے محور پر گردش دیجیے۔

* "امین الدولہ پارک میں" کے زیرعنوان یہ حصہ نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن چونکہ ماقبل اور مابعد سے اس حصہ کا تعلق ہے، اس لیے اس جگہ لکھا گیا۔ "م۔ ص"

آپ کو نہ مربع نظر آئیگا نہ مستطیل، اور نہ کوئی اور شکل، بلکہ ایک دائرہ نظر آئیگا - یہی حال زمانۂ ترکِ موالات کے اتحاد کا تھا - سابرمتی کے جادوگر کا مختلف الخیال، مختلف الاعتقاد اور مختلف المذہب جماعتوں کو ایک قلیل مدت میں ایک مرکز پر لے آنا ایک اعجاز تھا - جیسے جیسے وہ قوت جس نے مختلف اشکالِ ریاضی کو یکساں دکھا دیا تھا کم ہوتی گئی، مربع اور مستطیل، دائرہ اور معین ہر ایک نے اپنی انفرادی شکل پیش کر دی - یہ مختلف قوتوں کا فوری گو زبردست تصادم تھا - لیکن تصادم کا ردّ عمل مختلف اجسام کو دیر تک ایک مرکز پر قائم نہ رکھ سکا - اسباب جس کیفیت کو اب تصادم کا نام دینے پر ہمیں مجبور کرتے ہیں، وہی کیفیت اس زمانہ کی اجتماعی نگاہوں میں اتحاد نظر آتی تھی - اور اس ظاہری اتحاد ہی کے زیر اثر سوامی شرادھانند کو جامع مسجد کے ممبر سے تقریر کرنے کی اجازت دی گئی اور اسی نمائشی اتحاد کے زمانہ میں مشہور ہوا تھا کہ مولانا شوکت علی نے اُس جبینِ نیاز پر جو وحدۂ لاشریک کے واسطے مخصوص تھی، قشقہ کھینچکر بزبانِ میر یوں فرمایا تھا کہ

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھتے ہو تم اُن نے تو
قشقہ کھینچا، دَیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ اسلام اور ترکِ موالات نے کیونکر ہم آہنگی اختیار کی - میں نہ حاملِ شریعت ہوں، نہ زاہدِ گوشہ نشیں، اور نہ صوفیِ رنگیں لباس - کھدر سے مجھے مطلق دلچسپی نہیں اور چیلیوں سے تو مجھ کو نفرت ہے - لیکن میرے ذہن نے اسلام اور ترکِ موالات میں بڑا فرق سمجھ رکھا ہے - ناظرینِ موالات یہ سُن کر برافروختہ ہونگے اور حاملینِ شریعت "کف در دہن" - میں ہر دو جماعتوں سے باادب معافی چاہتا ہوں اور ایک کی محبت آمیز نفرت اور دوسری کے انتقامانہ جلال سے بچنے کے واسطے آزادیِ خیال اور آزادیِ تحریر کی سپر پیش کرتا ہوں

چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم   نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم

یہ صحیح ہے کہ اسلام اور ترکِ موالات دونوں کا دشمن ․․․ دونوں کو باعثِ ننگِ حیات سمجھتے ہیں - دونوں زنجیرِ جمود کو توڑنے کی تلقین کرتے ہیں - دونوں زندگی کے ․․․ میں انقلاب کی طوفان خیز لہریں پیدا کرنے کو آئے - دونوں نے باردوانہ سرعت سے انسانوں کے دلوں کو مسحور کیا - دونوں نے افتراق میں اتحاد کا رنگ پیدا کیا، دونوں نے موت کا خوف دلوں سے نکال دیا - دونوں نے لوگوں میں اپنے نصب العین کے لیے مجنونانہ بیخودی سے کامیابی حاصل کرنے کا عشق پیدا کیا، دونوں رعد آسا گرجے اور برق آسا چمکے - اور دونوں استبداد کا ردّ عمل تھے -

لیکن پھر بھی دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے - اسلام آفتاب ہے اور ترکِ موالات محض
ہیولا (ضیاءالنجوم)' اسلام شاہین پرواز و عقاب نگاہ ہے، ترکِ موالات کبک رفتار و قمری آواز
اسلام قدامت کا دشمن تھا، ترکِ موالات اسکا دلدادہ ہے - ہندوستان میں اسلام کی ایک یادگار مسجد
قوۃ الاسلام ہے' ترکِ موالات کا مرکز ستیہ گرہ آشرم - ترکِ موالات قومیت کی تعلیم دیتا ہے' اسلام اخوۃ
بین الملل کی - اسلام نے شرابِ کہن کو جامِ نو میں پیش کیا، ترکِ موالات شرابِ نو کو جامِ کہن میں پیش کرنا
چاہتا ہے - اسلام قدامت کے خلاف ایک مسلح انقلاب تھا، ترکِ موالات حکومت کے خلاف
ایک غیر مسلح احتجاج - اسلام کا تعلق دل سے ہے، ترکِ موالات کا دماغ سے - اسلام تبلیغی ہے' ترکِ
موالات تعلیمی' اسلام خورشیدِ ضیا پاش ہے' ترکِ موالات چراغِ تہِ داماں - اسلام کی تعلیم امر بالمعروف
و نہی عن المنکر ہے، ترکِ موالات کو اہنسا پر ناز ہے - اسلام نے علی و خالد، غزالی و بو علی سینا، محمود و غوری
پیدا کیے، ترکِ موالات نے محض گاندھی - اسلام کے حلقہ بگوش اسوقت چالیس کروڑ نفوس ہیں، ترکِ
موالات کے چالیس ہزار بھی نہیں - اسلام مذہبی مشن ہے' ترکِ موالات سیاسی تحریک - اسلام اقوام کی
اصلاح کے لیے آیا، ترکِ موالات محض حکومت کی اصلاح چاہتا ہے - ترکِ موالات کی بگڑی صورت مقاطعہ
جوعی ہے' اسلام کی قتل راجپال - ایک کی بنیاد عمل ہے' دوسرے کی خیال - ایک کا نعرہ "اللہ اکبر" ہے
دوسرے کا "مہاتما گاندھی کی جے" - ایک خدا پرست ہے دوسرا "صنم آشنا" - ایک کہتا ہے "ہر ملک
ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست" دوسرا گاتا ہے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" ایک کے
پاس کتاب اللہ ہے' دوسرے کے پاس کھدر اور چرخا - ایک عریانی کو جائز قرار دیتا ہے' دوسرا "سترِ عورت" کے
مسئلہ پر زور دیتا ہے - ایک کثرتِ ازدواج کو جائز نہیں سمجھتا' دوسرا تجرد کا حامی ہے - محمد اور گاندھی، کربلا اور
چورا چوری' محمود اور سومنات' بت شکن اور بت گر، دریائے بے پایاں اور چشمۂ پایاب' خطِ مستقیم اور خطِ دائرہ
میں اگر کوئی فرق ہے تو یہی فرق اسلام اور ترکِ موالات میں سمجھ لیجیے -

با وجود اس زبردست اختلاف کے زمانۂ ترکِ موالات میں مسلمانوں نے زبردست حصہ لیا - اگر اعداد و شمار پر
نظر ڈالی جائے تو تعلیم ترک کرنے والوں' سرکاری ملازمتوں سے استعفا دینے والوں' اور جیل جانے والوں میں
یقیناً مسلمانوں کی تعداد نسبتاً زیادہ نکلے گی - اصل یہ ہے کہ مسلمانوں میں سپاہی اب بھی موجود ہیں لیکن
افسر کوئی نہیں - کام کرنے کی صلاحیت اُن میں اب بھی موجود ہے لیکن کام لینے کی صلاحیت رکھنے والوں
کی کمی ہے - (باقی ہے)

"مرزا صادق"

یادِ مدینہ

یاد آ آ کے مدینے کی رُلاتی ہے مجھے
چٹکیاں لیکے کلیجے میں اُٹھاتی ہے مجھے

وہ مدینہ کہ فدا جس پہ ہے جنت کا چمن
وہ مدینہ کہ فدایانِ نبی کا ہے وطن
یاد آ آ کے مدینے کی رُلاتی ہے مجھے

وہ مدینہ کہ ہے محبوبِ خدا کا مسکن
اُسکی جو شے ہے دل و جاں سے وہ بھاتی ہے مجھے
چٹکیاں لے کے کلیجے میں اُٹھاتی ہے مجھے

آسماں سے بھی ہیں اونچے در و دیوارِ حرم
مالکِ کشورِ کونین ہے سرکارِ حرم
یاد آ آ کے مدینے کی رُلاتی ہے مجھے

پایۂ عرش کو چھو لیتے ہیں مینارِ حرم
بلکہ شان اس سے بھی عالی نظر آتی ہے مجھے
چٹکیاں لے کے کلیجے میں اُٹھاتی ہے مجھے

کیسی شوکت تھی کبھی ہائے شہا تا اللہ
ہو گیا خواب وہ عالم وہ زمانا اللہ
یاد آ آ کے مدینے کی رُلاتی ہے مجھے

اب تو لوگوں کی زباں پر ہے فنا تا اللہ
دیکھوں اب کب مری تقدیر بلاتی ہے مجھے
چٹکیاں لے کے کلیجے میں جگاتی ہے مجھے

کیا خوش خوش میں پھرا کرتا تھا بازاروں میں
دلکشی وادیِ طیبہ کے وہ کہساروں میں
یاد آ آ کے مدینے کی رُلاتی ہے مجھے

جمگھٹ احباب کے مجلسوں کے مزے یاروں میں
جو تصور ہی میں کھینچے لیے جاتی ہے مجھے
چٹکیاں لے کے کلیجے میں اُٹھاتی ہے مجھے

حسرت و یاس نے افسوس کیا مجھ پہ ہجوم
ولد ہی کے لیے کوئی نہیں اُف رے مقسوم
یاد آ آ کے مدینے کی رُلاتی ہے مجھے

چھین لی میری خوشی کر دیا مجھکو مغموم
بس اک اُمید جو سینے سے لگاتی ہے مجھے
چٹکیاں لے کے کلیجے میں اُٹھاتی ہے مجھے

اللہ اللہ وہ شاہِ دوسرا کا مسکن
دامنِ کوہِ احد شیرِ خدا کا مسکن
یاد آ آ کے مدینہ کی رُلاتی ہے مجھے

آنکھ میں پھرنے لگا ہائے قبا کا مسکن
دیکھو وحشت ابھی دیوانہ بناتی ہے مجھے
چٹکیاں لے کے کلیجے میں اُٹھاتی ہے مجھے

شومیِ بخت صد افسوس نکالے مجکو
دور طیبہ سے کرے دیکھے نہ بھائے مجکو

دیکھ لے دیکھ لے او دیکھنے والے مجکو
یاد آ کے مدینے کی رُلاتی ہے مجھے

ہجر کے مارے نے کب راحت و آرام لیا
میں نے کیا تیرا بھلا گردشِ ایام لیا
یاد آ کے مدینے کی رُلاتی ہے مجھے

آتشِ ہجر سے پہلو مرے جل جاتے ہیں
شعلے اُٹھتے ہیں شرر دل سے نکل جاتے ہیں
یاد آ کے مدینے کی رُلاتی ہے مجھے

غرقِ دریائے ندامت ہوں نکالو مجکو
اب کرو رحم، ترس کھاؤ، بلا لو مجکو
یاد آ کے مدینے کی رُلاتی ہے مجھے

نشۂ شوق میں سرمست و فنا ہو جاؤں
برق بنجاؤں، تڑپ جاؤں، ہوا ہو جاؤں
یاد آ کے مدینے کی رُلاتی ہے مجھے

حکم ہو جائے تو فی الفور چلوں آنکھوں سے
چوموں دہلیز کو، سر رکھدوں، ملوں آنکھوں سے
یاد آ کے مدینے کی رُلاتی ہے مجھے

دور افتادہ جہاں اشک فشاں ہوتے ہیں
اپنے محبوبوں سے غافل وہ کہاں ہوتے ہیں
یاد آ کے مدینے کی رُلاتی ہے مجھے

ڈھونڈتی آنکھ ہے اُس قبۂ عالی کی بہار
کیا کہوں تجھ سے شرف روضہ کی جالی کی بہار
یاد آ کے مدینے کی رُلاتی ہے مجھے

دیکھیے کیا مری تقدیر دکھاتی ہے مجھے
چٹکیاں لے کے کلیجے میں اُٹھاتی ہے مجھے

آہ کی، نالہ کیا، لوٹ کے دل تھام لیا
دربدر تو جو زمانے میں پھراتی ہے مجھے
چٹکیاں لے کے کلیجے میں اُٹھاتی ہے مجھے

پھونک دیتی ہے فغاں لب مرے جل جاتے ہیں
ہائے انگاروں پہ یہ آگ لٹاتی ہے مجھے
چٹکیاں لے کے کلیجے میں اُٹھاتی ہے مجھے

بخش دو میری خطا دور نہ ڈالو مجکو
چشمِ رحمت بہت اُمید دلاتی ہے مجھے
چٹکیاں لے کے کلیجے میں اُٹھاتی ہے مجھے

جھوم کر رُخ کروں طیبہ کا میں کیا ہو جاؤں
اُٹھ کے قبلے سے گھٹا جوش میں لاتی ہے مجھے
چٹکیاں لے کے کلیجے میں اُٹھاتی ہے مجھے

بوسے اس راہ کے ہر گام پہ لوں آنکھوں سے
لذتِ شوق یہ رہ رہ کے سکھاتی ہے مجھے
چٹکیاں لے کے کلیجے میں اُٹھاتی ہے مجھے

موتی بن جاتے ہیں آنسو جو رواں ہوتے ہیں
دمبدم غیب سے آواز یہ آتی ہے مجھے
چٹکیاں لے کے کلیجے میں اُٹھاتی ہے مجھے

(خضریہ) کی فضا، بابِ عوالی کی بہار
جیسے اندر سے ہوا اور ہی آتی ہے مجھے
چٹکیاں لے کے کلیجے میں اُٹھاتی ہے مجھے

ابو الشرف

نظرے خوش گزرے

خدا کا شکر ہے کہ یہ پرچہ جنوری کے اندر مکمل ہو رہا ہے - آیندہ اُمید ہے کہ پرچے اس سے بھی پہلے تیار ہو سکیں گے - اور جب تک ابتدائی سات سال کی طرح انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو اشاعت کا اہتمام نہ ہو جائے، انشاءاللہ کوشش کا یہ سلسلہ جاری رہیگا - سال حال کے لیے بعض قابل قدر تحریریں بھی حاصل ہو گئی ہیں اور مزید جد و جہد جاری ہے - ماہِ صیام کے بعد انشاءاللہ اس سے زیادہ مستعدی سے الناظر کی خدمت کا موقع ملے گا -

---

جولائی سنہ ۹ء میں الناظر جاری ہوا تھا - جون سنہ ۲۹ء میں اسکی زندگی کے بیس سال تمام ہوئے تو ارادہ تھا کہ اس بیست سالہ دَور کے خاتمہ پر قدردانانِ الناظر کی خدمت میں کوئی موزوں ہدیہ پیش کیا جائے، لیکن گھر میں بیماریوں کے زور اور کاروبار کی ابتریوں نے اسکا موقع نہ دیا - اب اُسکی تلافی کے لیے یہ تجویز ہے کہ آیندہ سے جملہ قدردانانِ الناظر کو تمام ذاتی مطبوعات پر ۲۵ فی صدی کی رعایت دی جایا کرے - سالانہ چندہ ادا کرنے کے بعد خریداروں کے پاس ذاتی مطبوعات کی ایک ایک فہرست بھیجدی جائے گی اور اُنھیں تا اختتام میعادِ سالانہ حق ہوگا کہ جو کتاب چاہیں، رعایتی قیمت پر منگا لیں - اور اسی طرح انشاءاللہ ہر سال نئی فہرست مرتب ہو کر پہونچتی رہیگی -

جملہ مستقل معاونین کی خدمت میں یہ فہرست اسی پرچہ کے ساتھ بھیجی جا رہی ہے، اور آیندہ انشاءاللہ ہر سال کے شروع میں بھیجی جائیگی، اور اُنکو بھی اس فہرست کی جملہ کتب رعایتی قیمت پر دی جائیں گی -

اس سال پورا اطمینان نصیب نہیں، اسلیے فہرست کی تیاری پر کوئی خاص اہتمام نہیں کیا جا سکا - خدا کی مرضی ہے تو آیندہ یہ فہرست ایسی صورت میں پیش کیجائیگی، کہ لوگوں کو سال بھر تک اپنے پاس رکھنا بار نہ معلوم ہو -

---

بعض اتفاقی اسباب کی بنا پر اس دفعہ تاریخ امریکہ کا جزو تیار ہونے میں اتنی تاخیر ہونے کا اندیشہ ہے کہ یہ پرچہ جنوری کے اندر شایع نہ ہو سکے گا - اسلیے مجبوراً تاریخ کے اوراق حذف کیے گئے - انشاءاللہ

آئندہ نمبر میں اسکی تلافی کردی جائیگی۔

منشی صفدر علی صفدر مرزا پوری نے جو ایک خوشگو شاعر اور متعدد دلچسپ ادبی تصانیف کے مولف تھے، یکم جنوری کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ مرحوم ۱۹۱۵ء میں الناظر کی خدمت کے لیے مرزاپور سے لکھنؤ آئے، اور پھر یہیں شادی کر لینے کی وجہ سے مستقل طور پر سکونت پذیر ہوگئے تھے۔ اس دیرینہ تعلق کی وجہ سے اُن کی وفات سے دلی صدمہ ہوا۔ اُنکی اہلیہ کا انتقال کچھ دن پیشتر ہوگیا تھا۔ دو کمسن بچے یادگار ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا رحم و کرم ان یتیموں کے شاملِ حال رہے کہ ان کی پرورش و تربیت کے لیے ضروری اسباب مہیا ہوں۔

اودھ کے ضلع بارہ بنکی سے ایک ماہوار رسالہ زیر نگرانی حضرت ریاض مدظلہ جاری ہوا ہے۔ راجہ اعجاز رسول خاں صاحب تعلقدار جہانگیرآباد، رسالہ کے سرپرست ہیں۔ اسی مناسبت سے رسالہ کا نام "اعجاز" رکھا گیا ہے۔ حکیم عبدالوالی صاحب اڈیٹر معلومات، جو عرصہ سے دنیائے ادب کو فراموش کیے ہوے تھے، اور ہماری متواتر کوششوں پر بھی آمادۂ کار نہ ہوے، اتفاق سے سلسلۂ ملازمت بارہ بنکی ہی میں مقیم ہیں، خوشی کی بات ہے کہ کارکنان رسالہ اُنکو قلمی اعانت پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ اور اگر اسے ایک قسم کا اعجاز کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ چودھری محمد علی صاحب رُدولوی بھی جو ظرافت نگاری میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، اعجاز کے معاونِ خصوصی ہونگے۔

حضرت ریاض کی نگرانی، رئیس جہانگیرآباد کی مالی امداد، اور حکیم عبدالوالی و چودھری محمد علی جیسے اصحاب کی قلمی اعانت کو دیکھتے ہوے یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ "اعجاز" بہت جلد کامیاب رسائل میں شمار ہونے لگے گا۔ رسالہ کے اڈیٹر ایک ندوی نوجوان ہیں۔ تصویر کی اشاعت کے متعلق جہاں تک ہمیں علم ہے علمائے ندوہ نے فتوائے جواز صادر نہیں کیا۔ اس لیے اعجاز میں جناب راجہ اعجاز رسول خاں صاحب کی عکسی تصویر دیکھکر حیرت ہوئی۔ اگر محض مالی امداد کی خاطر یہ معصیت جائز قرار دی گئی ہے، تو ہماری راے ناقص میں نہ یہ مدیر رسالہ کے لیے باعثِ فخر ہے نہ دارالعلوم ندوہ کی شہرت کے لیے مفید۔ اعجاز کا سالانہ چندہ چار روپیہ (للعہ) ہے۔

۲۵۔ جنوری ۱۹۳۰ء

اڈیٹر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو کی بہترین کتابیں

محصول معاف
پندرہ روپے کی روانگی پر آدھا
اور
پچیس روپے کی روانگی پر پورا

ہدیۂ ...
پچاس روپے کی روانگی پر ...
اور
سو روپے کی روانگی پر ...

مرزا غالب مرحوم
- اردوے معلیٰ
- عود ہندی
- دیوان غالب بہ درجہ ...
- کمل دیوان غالب

سر سید مرحوم
- خطبات احمدیہ
- کمل مجموعہ لکچر
- اسباب بغاوت ہند
- مضامین تہذیب الاخلاق
- خطوط سر سید

نواب محسن الملک مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق
- کمل مجموعہ لکچر
- تقلید و عمل بالحدیث
- کتاب المحبت والشوق
- مکاتیب
- مسلمانوں کی تہذیب

خلیفہ محمد حسین مرحوم
- اعجاز التنزیل
- سفرنامہ یورپ ۲ جلد

مولانا آزاد مرحوم
- آب حیات
- دربار اکبری
- سخندان فارس
- نگارستان فارس
- نیرنگ خیال
- سیر ایران
- ڈرامۂ اکبر
- مجموعہ مکتوبات آزاد
- مجموعہ نظم آزاد
- نصیحت کا کرنپھول
- جانورستان
- بیاض آزاد
- تذکرۂ علماء
- لغت آزاد
- دیوان ذوق مرتبہ آزاد

پروفیسر شہباز مرحوم
- زندگانی بے نظیر
- خیالات شہباز

مولوی سید ممتاز علی
- تذکرۃ الانبیا
- شیخ حسن

مولانا نذیر احمد مرحوم
- حمائل شریف مترجم
- الحقوق والفرائض
- بنات النعش
- مرآۃ العروس
- توبۃ النصوح
- موعظۂ حسنہ
- رویائے صادقہ
- ایامیٰ
- فسانۂ مبتلا
- ابن الوقت
- مصائب غدر
- مجموعۂ نظم بے نظیر
- کمل مجموعہ لکچر ۲ جلد
- منتخب الحکایات
- چند پند
- مبادی الحکمۃ

مولانا اشہری مرحوم
- حیات انیس
- ایشیائی شاعری
- نور جہاں بیگم
- حیدر علی سلطان
- لغات الخواتین

مولانا حالی مرحوم
- یادگار غالب
- حیات سعدی
- مقدمۂ شعر و شاعری
- حیات جاوید
- دیوان حالی
- مسدس حالی
- مجموعۂ نظم حالی
- بیوہ کی مناجات
- شکوۂ ہند

مولوی بشیر الدین مرحوم
- واقعات دار الحکومت دہلی
- تاریخ بیجاپور
- حرز طفلاں
- نشاط عمر
- عصائے پیری
- لخت جگر
- حسن معاشرت
- اصلاح معیشت
- اقبال دولہن
- شمع ہدایت
- انشائے بشیر
- دیوان بشیر

مولانا شبلی مرحوم
- سیرۃ النبی جلد اول
- دوم
- سوم
- الفاروق
- سیرۃ النعمان
- الغزالی
- المامون
- سوانح مولانا روم
- سفرنامہ مصر و روم و شام
- علم الکلام
- الکلام
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- شعر العجم جلد اول
- دوم
- سوم
- چہارم
- پنجم
- موازنۂ انیس و دبیر
- مضامین عالمگیر
- آغاز اسلام
- مجموعۂ کلام شبلی اردو
- مکاتیب شبلی ۲ جلد

مولانا ذکاء اللہ [illegible]
- تاریخ ہندوستان [illegible]
- گرزن نامہ
- آئین قیصری
- محاربات عظیم
- معادن الجواہر
- ساعت [illegible]

سید محمود [illegible]
- کتاب [illegible]
- کتاب [illegible]
- لکچر
- شرح قانون [illegible]

مولوی [illegible]
- الدین والاسلام
- تحریر [illegible]

مولوی [illegible]
- ترجمہ تاریخ [illegible]
- ترجمہ رشحات
- ترجمہ جواہر [illegible]
- ترجمہ کشف [illegible]
- علم السیاست

ملنے کا پتہ - الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

باسمہ

فہرست مضامین بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء

نمبر ۴ — جلد ۳۷

نظرے خوش گزرے (پشت صفحہ ہذا)

نظرے خوش گزرے

الناظر کا یہ نمبر سیّ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو سکیگا۔ کاتب الناظر منشی امیر علی رقم لکھنوی کی شدید علالت کے باعث تاخیر ہوئی۔ لکھنؤ کی آب و ہوا سال گذشتہ کے مانند پھر خراب ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے جو قابل قدر مضمون ارسال فرمایا ہے وہ کافی طویل تھا۔ اس لیے اُسے مستقل رسالہ کی صورت میں درج کرنا پڑا۔ اُمید ہے کہ تین نمبروں میں یہ مضمون مکمل ہو جائیگا۔

افسوس کہ لالہ سری رام ایم اے دہلوی مؤلف تذکرہ خمخانۂ جاوید نے اسی مہینہ میں بمقام دہلی انتقال کیا۔ کئی سال ہوئے جب فالج میں وہ مبتلا ہوئے تھے۔ اور اُسوقت اگرچہ خدا کے فضل سے جان بچ گئی تھی، مگر عملاً وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ اپنے مشاغل ادبی کو جاری رکھ سکیں۔ خمخانۂ جاوید، اپنی بہت سی کوتاہیوں کے باوجود اُردو شاعری کی تاریخ میں اپنی آپ نظیر ہے۔ اور اتنے بڑے کام کا بیڑا اُٹھانے اور اُسے نہایت مستعدی و انہماک سے انجام دینے والے شخص کی ہمت اور ذوق کی جسقدر بھی ستائش کیجائے کم ہے۔ خصوصاً جبکہ یہ امر بھی پیش نظر رکھا جائے کہ لالہ سری رام نے جب یہ تذکرہ مدون کرنا شروع کیا ہے تو اسوقت ہماری زبان اُردو بالکل کس مپرسی کی حالت میں تھی۔ حکومت کا تو ذکر ہی فضول ہے، انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب تک اُردو کو حقارت سے دیکھتے اور اُردو کتابیں پڑھنے کو تضیع اوقات جانتے تھے۔

دو سال ہوئے جب ایڈیٹر الناظر کو لالہ صاحب کی خدمت میں برسوں کے بعد حاضری دینے کا موقع ملا تو آپ نے بڑی حسرت کے ساتھ اپنی مجبورانہ حالت کا ذکر فرمایا اور مشورہ طلب کیا کہ خمخانہ کی بقیہ جلدوں کی تدوین و اشاعت کے لیے کیا صورت اختیار کی جائے۔ غور و خوض کے بعد ایک تجویز سوچی گئی تھی مگر افسوس ہے کہ دوبارہ حاضری کی نوبت نہ آئی۔ بہرحال جناب پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کے تازہ گرامی نامہ سے معلوم کرکے کسی قدر اطمینان ہوا ہے کہ لالہ صاحب نے اپنی زندگی ہی میں کچھ انتظام کر دیا تھا اور امید کرنا چاہیے کہ اُنکے ورثاء اُنکی اس قابل قدر تالیف کی تکمیل کے لیے امکانی سعی کرینگے۔

اُردو کے اس بڑے محسن کی وفات پر جہاں ہم اُنکے ورثاء کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا آپکا کتبخانہ ان کتابوں سے خالی ہے؟

تفسیر فتح المنان

مولانا محمد عبدالحق حقانی دہلوی کی یہ تفسیر حقانی بہت مشہور ہے۔ عرصہ سے شائقین کو تلاش تھی اب پھر چھپ ہی ہے اس وقت تو طبع حصص حسب ذیل حاضر ہیں

جلد اول تفسیر حقانی کا لاجواب مقدمہ قیمت عہ

جلد دوم ۔ سورہ فاتحہ اور پارہ الم کی تفسیر قیمت للعہ

جلد سوم ۔ پارہ سیقول سے آخر سورہ تک پارہ کی تفسیر للعہ

جلد چہارم ۔ سورہ مائدہ سے سورہ براۃ تک [illegible] پارہ کی تفسیر للعہ

تفسیر الفرقان فی معارف القرآن

اس نام سے خواجہ عبدالحی فاروقی استاد تفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک تفسیر لکھ رہے ہیں جس کے ذریعہ سے کوشش ہے کہ مسلمان حالات حاضرہ پر قرآنی روشنی میں غور کریں دنیائے اسلام کے موجودہ تنزل و انحطاط کے اسباب کو سمجھیں۔ عروج و ترقی کیلئے اسلامی تعلیم کی جو ہدایتیں ہیں ان پر عمل کریں اور عہد رسالت و خلفائے راشدین کے مبارک دور میں مسلمانوں کا جو نظام تھا اسکو دوبارہ قائم کرنیکی کوشش کریں ۔ حسب ذیل حصص حاضر ہیں

بیان ۔ سورہ آل عمران کی تفسیر قیمت ۱۲ر

الصراط المستقیم ۔ سورہ انفال سورہ توبہ کی تفسیر " عہ

سبیل الرشاد ۔ سورہ حجرات کی تفسیر " ۱۰ر

عبرت ۔ سورہ یوسف کی تفسیر " عہ

برہان ۔ سورہ نور کی تفسیر " عہ

ذکریٰ ۔ سورہ عم یتساءلون کی تفسیر " ۸ر

بصائر ۔ خواجہ صاحب نے اس رسالہ میں بنی اسرائیل کے وہ واقعات بیان کیے ہیں جو قرآن مجید میں درج ہیں۔ اور جو زمانہ حال کے مسلمانوں پر بہت کچھ منطبق ہوتے ہیں قیمت صرف چھ آنے ۶ر

روح الایمان

مولانا فتح الدین از برخوشابی نے سورۂ فاتحہ و سورۂ بقر کی یہ تفسیر لکھی ہے جس میں متن کے تحت فارسی و اردو ترجمہ ہے اور ہر آیت کا شان نزول الفاظ قرآن کی تحقیق و حل لغات و ترکیب نحوی صرفی و لطائف و نکات قرآن بتائے گئے ہیں ۔ قیمت للعہ

روح القرآن

از مولوی محمد ظفر ایم اے ایل ایل بی وکیل یعنی سارے قرآن مجید کی فہرست بزبان اردو ۔ فہرست کو خاص عنوانات کے تحت میں درج کیا ہے پھر ہر سورۃ کے خواص، مختصر مطالب اور شان نزول بیان کی ہے اور آخر میں قرآنی حروف اور علامات قرآنی کے اقسام و اعداد ہیں۔ غرضکہ کوزہ میں سمندر کو بند کرنیکی کوشش کی ہے۔ کم فرصت اصحاب و خصوصاً انگریزی داں حضرات کے لیے یہ کتاب نعمت غیر مترقبہ ہے حجم ۸ جزو قیمت عہ

عورت اور قرآن

مستورات کی اخلاقی، مذہبی تمدنی و معاشرتی زندگی کے متعلق قرآن شریف کی تمام آیات کو خاص ترتیب کے ساتھ مولانا عبدالماجد دریابادی نے مرتب کیا ہے قیمت عہ

علوم القرآن

خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب نے ثابت کیا ہے کہ جملہ علوم قرآن میں مذکور ہیں اور آیات قرآن کی تشریح کرکے جدید علوم سے [illegible] استخراج کیا ہے قیمت ۸ر

خصائل نبوی

حدیث شریف کی مشہور کتاب شمائل ترمذی کی اردو شرح از جناب مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم ۔ [illegible] ہے اور نہایت شرح قیمت ۱۲ر

انتخاب صحاح ستہ

حدیث شریف کی چھ مشہور کتابوں سے ۵۹۷ حدیثیں منتخب کرکے انکا ترجمہ بلحاظ ترتیب مضامین شائع کیا ہے آخر میں اصل عبارت حدیث درج ہے۔ اور ترجمہ و متن دونوں یکساں نمبر دیدیے ہیں۔ تاکہ ترجمہ و حدیث کی مطابقت میں آسانی ہو۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے ۔ عہ

مواعظ کریم

حدیث قدسی اور اقوال سلف صالحین کے رو سے مسلمانوں کیلیے پند و موعظت کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ پچاس سال پیشتر کا چھپا ہوا ہے قیمت چھ آنے ۶ر

الکلام المرفوع فیما یتعلق بالحدیث الموضوع

قرائن وضع حدیث، قرینہ در راوی و ایجاد محدثین قواعد جرح و تعدیل، فرق میان فقہا و محدثین حفظ اسناد .... قبول روایات مبتدعین اختلاف فضیلت امام شافعی، فضیلت صلوۃ التسبیح، احوال محدثین وغیرہ ۱۲ر

نبوت

اس کتاب میں ثابت کیا گیا ہے کہ ہر ایک قوم میں خدا نے نبی بھیجا ہے اور نبوت کے اقسام اور اس کی ضرورت پر بحث کی ہے ۔ قیمت صرف بارہ آنے ۱۲ر

حجۃ الاسلام

مولانا اکبر شاہ خاں نے اس لاجواب کتاب میں کوشش کی ہے کہ اسلام کی فضیلت دوسرے ادیان پر ثابت ہو اور اسلامی تعلیمات پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں انکے مسکت و مدلل جواب دیے ہیں قیمت ۸ر

حقائق اسلام

مفتی نوازالحق ... تعلیمات ... نے لوگوں کو سمجھانے کیلیے اس کتاب میں ... بتایا ہے کہ جملہ اسلامی ارکان کی ادائگی کیوں ضروری ہے اور افراد و جماعت کو اس سے کیا فوائد پہنچتے ہیں تاکہ جو لوگ اس خام خیالی میں مبتلا ہوں کہ اسلام نے شروع میں جن ارکان کی ادائگی کا حکم دیا گیا تھا اب ان پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں یا جو انکے ظاہری فوائد کو نہ سمجھ سکتے ہوں ان کی تشفی ہو جائے ۔ عہ

جزاء الاعمال

از مولانا اشرف علی تھانوی جس میں قرآن و حدیث کے رو سے بتایا گیا ہے کہ اچھے کاموں کا انعام اور برے کاموں کی سزا اسی دنیا میں کیونکر ملتی ہے ۔ قیمت تین آنے ۳ر

مسالک النظر فی نبوت خیر البشر

ایک یہودی نومسلم نے اپنی مذہبی کتابوں سے حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اثبات کیا ہے پروفیسر نسیم الرحمن ایم اے نے عربی نسخہ سے ترجمہ کیا ہے ۔ ۸ر

فوز المرام فی طبقات اولیاء الکرام

ولی اور ولایت کی تعریف ، بیعت کس سے کرنا جائز ہے اقسام اولیاء کا ذکر ، فضیلت علمائے باطن ، فضیلت علم شریعت و حقیقت اور ان کا فرق ، جذب و سلوک معجزہ ، کرامت و استدراج کا بیان اور ان کا باہمی فرق ، انواع نزول وحی ، جمع قرآن ، وضع اعراب آداب قرأت ، محبت با اولیاء وغیرہ وغیرہ عہ

مصباح التعرف لارباب التصوف

جس میں اصطلاحات صوفیہ کے مطالب و معانی بیان ہوے ہیں تاکہ تصوف کی کتابیں پڑھنے والوں کو آسانی ہو ۔ قیمت ۔۔۔ عمر

مشہد ناز

علم تصوف کا منظوم رسالہ گلشن راز بہت مشہور ہے یہ اسی کی اردو شرح ہے ۔ حجم ۱۸۴ صفحات تقطیع کلاں ۔ قیمت تین روپے ۔ ۔ للعہ

تصفیہ

حضرت شاہ محب اللہ الہ آبادی نے تصوف پر ایک کتاب تسویہ لکھی تھی جس کی شرح مولانا شاہ علی انور قلندر نے فارسی میں لکھی ۔ یہ اسی کا بامحاورہ اردو ترجمہ ہے ۔ قیمت ایک روپیہ عہ

الکہف و الرقیم

حضرت شیخ عبد الکریم جیلی نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کی تفسیر و تشریح میں یہ لاجواب رسالہ لکھا تھا مع اردو ترجمہ شرح اور مقدمہ کے منشی تاج الدین قلندر نے شائع کرایا ۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے عہ

تنویر الافق

یعنی تصوف کا مشہور رسالہ تبیین الطرق مصنفہ علی بن حسام الدین مع اردو ترجمہ کے ۔ قیمت عہ

الدرۃ الملتقہ

تصوف کی مشہور کتاب تحفۃ المرسلہ کی فارسی شرح از مولانا شاہ علی انور قلندر مع اردو ترجمہ عہ

تاریخ عرب

موسیو سدیو فرانسیسی کی مشہور تاریخ جو تمدن عرب سے بھی قبل کی تصنیف ہے تلخیص و ترجمہ کے بعد شائع کی گئی ہے ۔ کتاب میں کیا ہے اسکا اندازہ مندرجہ ذیل فہرست مقالات سے کیا جا سکتا ہے

مقالہ اولے ۔ جزیرہ نمائے عرب کا جغرافیہ و تاریخ رسول کریم صلعم کی بعثت سے قبل ۔
مقالہ دوم ۔ نبی کریم صلعم اور قرآن مجید ۔
مقالہ ثالث ۔ فتوحات امت محمدیہ ۱۱ھ تا ۱۲۵ھ
مقالہ رابع ۔ مشرق میں عربوں کی قوت و شوکت اور اسکا انحطاط ۔ ۱۲۶ھ لغایت ۶۲۵ھ
مقالہ پنجم ۔ مغربی ممالک میں عربی سلطنت کا عروج و زوال ۔ بنی امیہ اور بنی عباس کی خانہ جنگی کے آغاز سے شمالی افریقہ میں دولت عثمانیہ کے قیام تک اسپین سے نصاریٰ کا مغربی مسلمانوں کو جلاوطن کرنا
مقالہ ششم ۔ عہد اول کا عربی تمدن
مقالہ ہفتم ۔ عرب کی حالت زمانہ موجودہ میں
تمدن عرب میں صرف آخری دو ابواب کے مضامین بحث کی گئی ہے اور اس میں تاریخ و تمدن عرب دونوں شامل ہیں ۔ حجم زائد از ۵۰۰ صفحے جلد خوشنما
قسم خاص ۔ للعہ قسم عام ۔ صہ

مسلمانان اندلس

یہ اندلس کے ہشت صد سالہ دور خلافت کی اجمالی تاریخ ہے جو اسٹینلی لین پول کی مشہور کتاب مورس ان اسپین سے ترجمہ کی گئی ہے قیمت ۔۔۔

تاریخ مغرب

شمالی افریقہ کے عہد اسلامی کی یہ تاریخ عربی کی ایک نادر غیر مطبوعہ کتاب سے ترجمہ ہوئی ہے جو عربی اہل اصحاب کے لیے بھی قابل مطالعہ ہے ۔ قیمت ۔۔۔

دین و دنیا کی باتیں

جو مسلمان بچوں میں واقفیت عامہ پیدا کرنے کی غرض سے منشی سید احمد مارہروی نے مرتب کی ہیں قیمت ۶ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مجاہدین مراقش بالتصویر

جنگ ہسپانیہ و ریف کے اصلی سبب سرزمین مراقش پر یورپین سیاست کے داؤں پیچ درجنوں ہسپانوی افواج کے مقابلہ میں مٹھی بھر مجاہدین کے بے جا حریت کی ہوشربا داستان مع اصلی تصاویر میدان جنگ، نقشہ جات مراقش و ریف اور غازی عبدالکریم اور مجلس انتظامیہ جمہوریہ ریف کے مکاتیب کے از ملک عبدالقیوم بیرسٹر ایٹ لا قیمت عہ

آئینہ حقیقت نما (جلد دوم)

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی ہندوستان کی تاریخ اس غرض سے لکھ رہے ہیں کہ غلط تاریخوں نے جو زہر پھیلایا ہے کہ مسلمانوں کا عہد حکومت ہندوؤں کیلئے ظالمانہ تھا اسکے لیے تریاق فراہم کریں۔ جلد اول مقبول ہو چکی ہے۔ اب دوسری جلد شائع ہوئی ہے جس میں تغلق اور لودی خاندانوں کے حالات ہیں۔ قیمت عہ

مراۃ محمدی

مسلمان سلاطین گجرات کے مستند حالات۔ مصنف شیخ غلام محمد مصنف مراۃ عالمگیری قیمت ۱۲

مزارات اولیائے دہلی

دہلی میں جو بزرگان دین آرام فرما رہے ہیں انکے حالات، سنین وفات اور مزارات کے موجودہ پتے جنکی مدد سے کم سے کم وقت میں سب مزارات پر حاضری دی جا سکتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ عہ

سفرنامہ حرمین شریفین

مولانا حکیم محمد محی الدین حسین صاحب مدرس مدرسہ لطیفیہ ویلور کا قابل قدر سفرنامہ حسین حرمین بیت المقدس و زائرین حرمین کیلیے مفید تجربات اور بہت تمدنی و معاشرتی نمونہ تحقیقانہ رنگ میں درج ہیں۔ حجم تقریباً ۲۲ جزو قیمت ۸

سفرنامہ مصر

مرتبہ قاضی ولی محمد سکریٹری سٹیٹ کونسل بھوپال جسکے مطالعہ سے مصر کے عام جغرافی، تمرنی، اقتصادی و سیاسی حالات معلوم ہونگے علاوہ و بائیں بانتفرین کی طرز معاشرت اخلاقی اور مذہبی و سیاسی خیالات کا علم ہو جائیگا۔ کتابت طباعت اعلیٰ درجہ کی ۶۰ سے اوپر سادہ و رنگین عکسی تصاویر قیمت .... للعہ

سفرنامہ اندلس

مرتبہ قاضی ولی محمد سکریٹری سٹیٹ کونسل بھوپال، جس میں اندلس کی تقریباً ایک سو مشہور اسلامی بستیوں قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ، مالقہ، طلیطلہ، بلنسیہ، سرقسطہ، قادس وغیرہ کے چشم دید حالات اور متعدد نقشے، تصویر محلات و مساجد، طلیطلہ کی ۶۰ عکسی تصویریں بھی درج ہیں۔ طباعت اعلیٰ درجہ کی۔ قیمت شے

سفرنامہ شاہ ایران

ناصرالدین شاہ قاچار نے یورپ کی سیاحت کا جو روزنامچہ مرتب کیا تھا وہ اسقدر مقبول ہوا کہ مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ اردو ترجمہ مولوی فخری صاحب استاد نواب رامپور نے کیا ہے۔ گر اس میں صرف انگلستان تک کے حالات سفر درج ہیں قیمت عہ

سفرنامہ برہما

جس میں برہما کی اخلاقی، معاشرتی، تعلیمی و سیاسی زندگی کو تفصیل تحریر کیا ہے اور عصر موجودہ کے تمام چشم دید حالات درج ہیں۔ مصنفہ مولانا سید ابوظفر ندوی پروفیسر جامعہ دینیہ کالج احمد آباد ۱۲

صبح اسلام۔

یہ منظوم میلاد شریف لکھنؤ کے مشہور شاعر جانشین جلال حضرت بیدو کا طبعزاد ہے قیمت ۱۳

انوار احمدی

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل درود شریف کے فوائد اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہم کے آداب وغیرہ۔ قیمت ..... علمہ

انوار العاشقین

ذکر ولادت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم، ایام جاہلیت عرب اور اس کی اصلاح، مناقب و حالات صحابہ کرام و اہل بیت اطہار رضی اللہ علیہم اجمعین۔ حالات و کرامات سلسلہ چشتیہ صابریہ اولیاء اللہ کے عمہ

سراج منیر

منشی امتیاز علی بی اے وکیل ہائی کورٹ نے یہ سوانح عمری حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی اس غرض سے لکھی ہے کہ جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے دلوں میں حضور رحمۃ للعالمین کی عظمت و محبت جاگزیں ہو عہ

سرور عالم

حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس سوانح حیات اس ترتیب سے بیان کیے گئے ہیں کہ ہر واقعہ کے متعلق سنہ ولادت سنہ نبوی سنہ ہجری اور سنہ عیسوی تا امکان جملہ سنین درج کیے ہیں۔ انداز تحریر بھی مخصوص طور پر دلکش ہے۔ عرب کا نقشہ اور غار حرا کی تصویر مستزاد ۱۲

اسلام کا چاند

مسلمان بچوں کے لیے حضور رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کی مختصر سوانح عمری از منشی سعید احمد مارہروی قیمت ۔

ماہتاب عرب ۵

مکاتیب

(مرتبہ منشی محمد امین زبیری) نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے خطوط کا مجموعہ جنکے مطالعہ سے کئی حصہ قومی و ملی تعلیمی سیاسی مسائل اور ریاست حیدرآباد کے معاملات پر روشنی پڑتی ہے مع دونوں کی عکسی تصویروں کے قیمت عمر

اسلام

نواب محسن الملک مرحوم کا ایک قابل دید مضمون ۲ر

اسلامی حکومت

اس مضمون میں مولانا شبلی نے یہ دکھایا ہے کہ ہندوستان پر اسلامی حکومت کا کیا اثر ہوا۔ ۲ر

اسلامی مدارس

مولانا شبلی نے مسلمانوں کی ان قدیم درسگاہوں کے خصوصیات و حالات لکھے ہیں جنھوں نے غزالی و رازی ابن رشد و بو علی سینا جیسے باکمال پیدا کیے۔ قیمت چار آنے ۴ر

خطبات فرخیہ

مولوی فرخی صاحب نے اس رسالہ میں دکھایا ہے کہ اسلامی تعلیم غداری اور تعصب منافرت مذہبی کے خلاف ہے۔ اسلیے مسلمانان ہند کی طرف سے انگریزوں کو کسی قسم کا اندیشہ نہ کرنا چاہیے ۸ر

انتخاب نقیب

بدایوں کے مشہور ادبی رسالہ نقیب میں فاضل ادیب حضرت [illegible] (جو ہمیشہ گمنام رہنا پسند کرتے ہیں) کے جس قدر مضامین چھپے تھے ان کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ قیمت ۲ر

خیالات

پنجاب کے مشہور مضمون نگار مرزا سلطان احمد اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے قیمتی مضامین کا مجموعہ عہ

زر گل

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے دلچسپ مضامین جو الناظر اور ملک کے دوسرے رسائل میں طبع ہوئے ۶ر

مترجمات

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے دو قابل قدر مضامین جو دوسری زبانوں سے ترجمہ کیے گئے اور رسائل میں چھپے ۸ر

پارسی علوم اور اسلام

مولوی محمد مسلم عظیم آبادی ایم اے نے دکھایا ہے کہ مسلمانوں نے پارسیوں اور انکے علوم کے ساتھ کیا سلوک کیا اور فارسی پر عربی زبان کے کس قدر اثرات و احسانات ہیں۔ قیمت بارہ آنے ۱۲ر

بیداری ہند

(جلد اول) یعنی مہاتما گاندھی کی ان یادگار تحریروں کا ترجمہ ... جو اخبار ینگ انڈیا میں ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۲ء تک لکھی گئیں جنکے مطالعہ سے نہ صرف تحریک عدم تعاون کی مکمل تاریخ سے واقفیت ہوگی بلکہ ہندوستان کے اس نامور فرزند کی سچائی، خدا ترسی، بلند نظری، اور دانشمندی کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ ممکن ہے کہ آپ انکے عقائد و خیالات سے اختلاف رکھتے ہوں لیکن ان تحریروں کے مطالعہ کے بعد ناممکن ہے کہ آپ انکی عظمت ان شخصیت کا اعتراف نہ کریں۔ حجم چار سو صفحے۔ قیمت دو روپے عار

سلف گورنمنٹ

۶ر

خیالات ارونگ

امریکہ کے مشہور ادیب واشنگٹن ارونگ کے بعض قیمتی مضامین کا ترجمہ۔ از مولف سیر المصنفین مسٹر محمد یحییٰ تنہا بی اے۔ قیمت آٹھ آنے ۸ر

دیوان اثر

خواجہ میر درد کے بھائی سید محمد میر اثر کا کلام جو پہلی بار چھپا ہے مع مقدمہ از مولوی تقی الدین احمد و تعارف از پروفیسر آغا حیدر حسن دہلوی عہ

دیوان تاباں

میر عبدالحی رضوی تاباں معاصر میر و سودا کا قابل قدر کلام جو پہلی بار طبع ہوا ہے مع مقدمہ از سید بادشاہ حسن قیمت عہ

واقعات کربلا

جدید تعلیم یافتہ گروہ معترض تھا کہ اردو میں رزمیہ شاعری نہیں ہے میر انیس کے ایک ہی بحر کے بہترین راثی کا یہ مسلسل انتخاب اس اعتراض کا بہترین جواب ہے عہ

قصائد مومن

حکیم مومن خان کے اردو قصائد کو مولوی ضیاء احمد ضیاء بدایونی ایم اے نے بعد تصحیح و تحشیہ و اضافہ مقدمہ شائع کیا ہے۔ مقدمہ میں حکیم مومن خان کے سوانح اور ان کے خصوصیات کلام درج ہیں قیمت ۱۲ر

فغان آرزو

لکھنؤ کے سب سے خوشگو شاعر سید انور حسین آرزو جانشین جلال مرحوم کا پہلا دیوان۔ ۸ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

حسرتِ اختر

آخری تاجدار اودھ سلطان عالم واجد علیشاہ کے خود نوشت حالات قید فرنگ بصورت مثنوی مع مقدمہ از مولانا عبدالحلیم شرر اڈیٹر دلگداز ۸ر

باغ فردوس

میر ولایت علی فردوس دبیذری جو میر انیس کے شاگرد تھے اور مرثیہ گوئی میں مہارت تامہ رکھنے کے ساتھ ساتھ غزل، قصیدہ، مثنوی، ہر صنف کلام کے قادر الکلام شاعر تھے اور اردو فارسی دونوں میں صاحب دیوان تھے۔ یہ مثنوی انھیں کے زور طبع کا نتیجہ ہے۔ مثنوی گلزار نسیم کی بحر اور غالباً اسی کے جواب میں لکھی ہے جیسٹس محمود اور فردوس کے دیگر قدردان اُن کی زبان سے اسکے اشعار سُنکر داد سخن دیتے۔ اور اس کی طباعت پر اصرار کیا کرتے مگر باکمال شاعر کی وارفتگی طبع کے باعث ان کی زندگی میں احباب اور دلی قدردانوں کی یہ حسرت پوری نہوئی۔ فردوس کے انتقال کے بعد ان کی عمر بھر کا اندوختہ یعنی دفتر شاعری ناقدردان ورثا کی بے التفاتی کی بدولت قعر گمنامی میں جا پڑا۔ بارے غنیمت ہے کہ اُنکے ایک عزیز نے اس گوہر گراں مایہ کو طبع کرا کے محفل ادب میں پیش کر دیا۔ ہے حجم ۱۵۲ صفحے۔ ۱۲ر

کلام شاد عظیم آبادی

حصہ اول۔ صوبہ بہار کے مشہور شاعر اور میر انیس کے شاگرد رشید خان بہادر سید علی محمد شاد عظیم آبادی کا قابل دید کلام۔ قیمت ۸ر

ظہور رحمت

خان بہادر سید علی محمد شاد عظیم آبادی کا منظوم میلاد شریف ۸ر

مثنوی امید و بیم

لکھنؤ کے مشہور شاعر ادیب و فلسفی ڈاکٹر مرزا محمد ہادی رسوا بی اے کی بے نظیر نظم جسمیں اردو میں سب سے پہلی بار اعلیٰ فلسفیانہ مضامین نظم کیے گئے ہیں۔ قیمت چار آنے ۴ر

نو بہار

مرزا رسوا کی ایک قابل دید بہاریہ نظم ۲ر

لیلیٰ مجنوں

منظوم ڈرامہ از مرزا رسوا بی اے جسمیں عروض کی تمام بحروں کا استعمال بتایا گیا ہے مرزا کی قوت نظم کا اندازہ کرنا ہو تو اسے ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت ۸ر

قومی مثنوی

جس میں مسلمانوں کے حالات لکھ کر انکے نقائص دور کرنیکی تدبیریں بیان کی گئی ہیں گویا جس مقصد سے مولانا حالی نے اپنا مشہور مسدس لکھا تھا اسی غرض سے باکمال شاعر نے یہ مثنوی لکھی ہے۔ قیمت ۱۲ر

فیضان شوق

شاعر باکمال منشی احمد علی شوق قدوائی مرحوم کا قابل قدر دیوان جس میں غزلیات قطعات اور رباعیات ہیں۔ شروع میں مسٹر معین الدین انصاری بی اے بیرسٹر ایٹ لا کا مقدمہ کاغذ دبیز کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ قیمت ۸ر

داغ جگر

جناب جگر مرادآبادی کا قابل قدر دیوان مع مقدمہ از مولوی احسان الحق بی اے ایل ایل بی وکیل [illegible] عہ ر

سبد گل

مولانا سید اولاد حسین شاعر لکھنوی کی تازہ نظموں کا مجموعہ۔ قیمت ایک روپیہ عہ ر

تذکار سلف

مولوی ضیاء احمد ضیاء بدایونی ایم اے کے قطعات جن میں اسلامی معاشرت کی خوبیوں کو نمایاں کیا ہے مع تقریب از مولوی عبد الماجد بی اے و مقدمہ از مولانا عبد السلام ندوی ۶ر

حرم سرا

حضرت ریاض خیرآبادی کا مشہور افسانہ۔ جو سالہا سال سے شائقین کو دستیاب نہیں ہوتا تھا اسکے کچھ نسخے حال ہی میں مل گئے ہیں۔ دونوں جلدیں مکمل ہیں۔ قیمت [illegible] شائقین فوراً طلب فرمالیں

لال کٹھور

مسٹر ظفر عمر مصنف نیلی چھتری و بہرام کی گرفتاری کا نیا جاسوسی افسانہ جس میں بہرام ایک نئی صورت میں نظر آتا ہے یعنی بجائے اسکے کہ وہ چوری اور ڈاکے کا مرتکب ہو دوسرے مجرموں کی سرکوبی کرتا اور خلق اللہ کو ان کی شرارتوں سے بچاتا ہے اور اس سلسلے میں عجیب و غریب کارنامے ظاہر ہوتے ہیں۔ کتاب بے حد دلچسپ ہے ۸ر

شاما

پنڈت کشن پرشاد کول بی اے رکن انجمن خادمان ہند کا دلچسپ فسانہ جس میں معاشرتی اصلاح سے بحث کی گئی ہے مناظر قدرت خصوصاً کشمیر کے دلفریب مناظر کے بیان اور سیرت نگاری کے لحاظ سے یہ فسانہ نہایت دلچسپ ہے ۸ر

اسرار رنگون

عہ ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

اب ذرا اِس شعر کا مذکورۂ بالا شاعرہ کے شعر سے مقابلہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اُس شاعرہ کے خیالات زیادہ سادے اور دلفریب ہیں ؎

کیے ہیں یہ اگر روشن جو اپنی مسکراہٹ سے — انھیں بھی تو عدم آباد کی دنیا بسانی ہے
محبت بھی اگر محدود ہو اس دارِ فانی تک — اسے الفت نہ کہیے اِک سرابِ زندگانی ہے

ہمیں دُنیا سے کچھ مطلب نہیں دُنیا تو فانی ہے
مگر ہرگز نہ یہ کہنا کہ الفت آنی جانی ہے ؎

اِن اشعار میں جذبات کی ترجمانی نہیں ہو سکی تاہم خیالات کے ترجمہ سے دونوں کا فرق معلوم ہو گیا ہوگا۔ کہیں نہ جائیے ہندوستان میں خسرو اور مخفی کے کلام کو لیجیے۔ خسرو کے خیالات و جذبات نہایت نازک سمجھے جاتے ہیں مگر انکی نزاکت اور مخفی کے خیالات و جذبات کی نزاکت میں وہی فرق معلوم ہوگا جو بیلے اور گلاب یا چنبیلی اور جوہی کی خوشبو میں ممکن ہے۔ مخفی کی سی معصومیت اور بھولا پن خسرو میں نہیں۔ خسرو کے اشعار ہیں ؎

یارب غمِ آن سروِ خراماں بکہ گویم — دل نیست بدستم سخنِ جاں بکہ گویم
دردیست درین سینہ کہ ہمدرد نشاسد — بیدردچو باور نکند آن بکہ گویم
خونابہ پیدا ہمہ بینند خود از چشم — احوالِ جگر خوردنِ پنہاں بکہ گویم
بلبل بکند نالہ چو خسرو بسحرگاہ — چون نشنود آں سروِ خراماں بکہ گویم

مخفی کے اشعار جو اسی رنگ میں ہیں، ملاحظہ ہوں ؎

منم کز زخمِ غم خوردن خراشیدن نمیدانم — بجز خونابہ دل جامِ نوشیدن نمیدانم
زنانہ جامہ نحنت وہر زاغم کہ میدانم — لباسِ عافیت را طرزِ پوشیدن نمیدانم
گلہ را از دلت ہمین کہ من از سادہ ہوں حیا — چو طفلاں راز دل از غیر پوشیدن نمیدانم
نبردم رہ بہ مقصودے درین دنیا زاں مخفی — کہ در راہِ طلب آئین کوشیدن نمیدانم

دونوں کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ جس قدر بھولاپن مخفی کے اشعار میں ہے اتنا خسرو کے اشعار میں نہیں۔ اگرچہ سلاستِ زبان اور روانی الفاظ میں خسرو کا پایہ برتر ہے۔ موجودہ زمانہ میں ٹیگور اور نیڈو کے خیالات میں اگر کچھ فرق معلوم ہوگا تو صرف سیاسیات کی وجہ سے۔ کیونکہ ٹیگور مس سروجنی نائیڈو کی طرح پالٹکس میں زیادہ حصہ نہیں لیتے۔ تاہم جذباتِ لطیف نیڈو میں زیادہ ہیں۔

ذیل کے ترجمہ سے ٹیگور کے خیالات و جذبات کا اندازہ کیجیے :-

"اپنے دماغ میں بڑے بڑے ارادوں کے ساتھ میں دن رات محنت کرتا رہا کہ آخر
کوئی بڑی چیز بنا سکوں ———— صدق اور فریب صدق ہم آہنگ تھے،
———— لیکن میری ننھی ننھی اُمیدیں عرصے تک منتظر رہیں ————
———— خوشیاں جن میں استقلال نہیں ———— جنکے تصور میں اِدھر اُدھر
گھومتے ہوئے نغموں کی آواز، کسی درخت کی ہلتی ہوئی ڈالیوں کی سرگوشیاں اور نسیم سے چلتی
ہوئی بوئے گل بھی شامل ہے ———— ہاں خواب سے بھر جانے والی
آرام دہ نیند کی طرح طاری ہو جاتی ہے ———— جبکہ مرضی خدا نے خلق کرنے کے
لیے آسمان کو آتشی حلقوں میں ہلا دیا تب اُس ایام ابتدائی میں اسکی طاقت نے اپنے
جوش فتح و شادمانی کو سرفلک پہاڑیوں سے ظاہر کیا۔ لیکن قسمت کہ وہ اپنے پہلے
زہریلے پھول کو دیکھ کر مسکرائے اُس کے تصور کو لاکھوں تاریک راتیں انتظار میں گزارنا
پڑی ہوں گی۔"

مس سروجنی نیڈو کے خیالات میں ٹیگور کے سے مجذوبانہ تصورات اور متین و ناقابل فہم جذبات
نہیں۔ باوجود سیاسیات و وطنیت کے ذیل کے اشعار مس نیڈو نے بمقتضائے حسن طبیعت
نہایت پُرلطف انداز میں لکھے ہیں، جو ساتھ ہی ساتھ نہایت نازک اور سادہ بھی ہیں :-

جادو بھری صدائیں اس شب کی خامشی میں	نغمہ نواز ہو کر بیدار ہم کو کر دیں
تقویم آرزو ہوں، اُمید کے ترانے	جو جوش حریت کو دل میں ہمارے بھر دیں
نغمے عرب کے گائیں گنگا کی وادیوں میں	خواب حجاز کی ہم اس ہند کو خبر دیں
مسلم نمازیوں کے دل کی صدا سنائیں	اور وید کے ترانے نعروں سے انکے بھر دیں

المختصر عورت کے جذبات و خیالات بمقابلہ مرد کے کہیں زیادہ دلفریب اور بھولے بھالے
ہوتے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بنگال کی خاتون اپنی کمسنی ہی میں اس قدر مشہور ہو گئی۔ اگر وہ اور زیادہ
زندہ رہتی تو نہیں معلوم اسکی شہرت کا کیا عالم ہوتا!

وہ خاتون مس تارو دت تھی، جو زیب النسا کی طرح دوشیزہ ہی فوت ہوئی یعنے عالم شباب
ہی میں اس دنیائے فانی کو خیرباد کہا۔ تارو دت کی زندگی کے حالات پڑھنے سے ہر وہ شخص
جسکے دل میں وطن اور اہل وطن کی محبت کا کچھ بھی شائبہ ہوگا ضرور متاثر ہوگا۔ ہم ... کو ہمیشہ

محبت سے یاد کرتا رہیگا۔ اس غریب بچی کی عمر کا عہد زریں یورپ میں تمام ہوا۔ لیکن چونکہ وطن
ہندوستان ہی تھا۔ اس لیے اسکے دل سے بنگالی سہیلیوں کی یاد نہ گئی۔ کیا کوئی خیال کر سکتا ہے
کہ جس وقت تارو دت ملک فرانس کی وادی "پوپیا" اور "اوورنے" کی پہاڑیوں پر سیر کر رہی
ہوگی، [illegible] باغ [illegible] اور ہگلی کی اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی لہریں نہ یاد آتی ہونگی؟ نہیں اسکو
بنگال کے چپے چپے سے محبت تھی جسکا اظہار اس نے اپنی نظموں میں کیا ہے۔

۴ مارچ ۱۸۵۶ء میں تارو دت اسوقت برطانیہ ہند کے دارالسلطنت کلکتہ میں پیدا ہوئی۔ رام
باگان" دت خاندان کے لیے مشہور ہے۔ یہ اس خاندان کی نجابت کا نمایاں ثبوت ہے کہ مسیحی
مشن کے کارکنوں کی رنگین بیانی نے اس خاندان کے اکثر افراد پر اپنا اثر ڈالا اور تارو دت کے
بزرگوں نے مذہب عیسوی قبول کر لیا۔

شاعری تارو دت کا خاندانی ورثہ سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اسکے باپ بابو گووند چندر دت خود
بھی اپنی زبان کے اچھے خاصے شاعر سمجھے جاتے تھے، اور تارو کے چچا رائے بہادر جسٹس
ششی چندر دت کو بھی شاعری سے بہت کچھ ذوق تھا۔ شاید اسی خاندانی اثر کا نتیجہ ہے کہ جیسی
نظمیں تارو دت نے انگریزی زبان میں لکھی ہیں ابھی تک کوئی انگلستان کی عورت بھی ویسی نظمیں
نہ لکھ سکی۔ اور اگر کمسنی میں تارو دت فوت نہ ہو گئی ہوتی تو آج زبان انگریزی کی مایہ ناز شاعرہ
سمجھی جاتی۔

کہا جاتا ہے کہ تارو دت کے والد نہایت پاک طبیعت اور پرہیزگار عیسائی تھے اور اُنکے
بھائی رومیش چندر دت کو تو ملک ہند کی سیاسیات میں کچھ ایسا دخل تھا کہ انگلستان والے بھی
اُن کی عزت کرتے تھے۔ چنانچہ رومیش دت مرحوم نے "تمدن ہند" پر ایک مختصر تاریخ ایسی لکھی ہے
جس میں موصوف نے سب کچا چٹھا کھول کر دکھا دیا اور حکومت برطانیہ سے ہندوستان کی صنعت
و حرفت کو جو کچھ نقصان پہونچا اُس پر بھی جرأت کر کے کچھ نہ کچھ روشنی ڈال دی اور یہ بھی ثابت
کر دیا کہ انگریزی مورخوں نے مسلمانوں کے زمانہ کی تاریخ لکھنے میں بہت زیادتی سے کام لیا ہے
کیونکہ تاریخ کا مقصد صرف کسی قوم کی برائیاں ہی بیان کرنے کا نہیں، بلکہ اُس کی
خوبیوں پر روشنی ڈالنا مورخ کا فرض عین ہے۔ اور زیادہ تر بھلائیاں
ہی بیان کرنا چاہئیں، تاکہ آئندہ نسلوں کے لیے وہ نمونہ معاشرت
بن سکیں۔

تارودت کے ایک بھائی تھا اور ایک بہن - ان تینوں بہن بھائیوں نے کلکتہ کے ہندو کالج
میں تعلیم پائی تھی - لیکن سب کمسنی ہی میں فوت ہو گئے -
۱۸۶۹ء میں تارودت نے سفر یورپ کیا - تقریباً چار سال تک وہ یورپ کے مختلف
مقاموں میں رہی - کچھ دن فرانس کے اسکولوں میں علاوہ ازیں اٹلی اور انگلستان میں - اور ان
ممالک میں رہنے کی وجہ سے اسکو مغربی علوم و فنون پر بہت کچھ آگاہی ہو گئی - شاید اسی وجہ سے
اس کی نظموں میں مغربی "نیچرلزم" کو بہت کچھ دخل ہے - ذیل کی عبارت سے جو "تارو" کے خیالات
کا ترجمہ ہیں، مغربی جذبات کا اندازہ کر لیجیے :-

"سبزہ - نہیں بلکہ سنہری اور سرخ پتیاں پیلی پیلی گھاس پر گرتی ہیں اور سبزہ زار کو داغدار
بناتی ہیں - صبح و شام سرد ہوا چلتی ہے - افسوس! تابستان کے دھوپ والے دن گزر گئے اور
سطح آب پر بارش سے حباب پیدا ہو چکے

کسان فصل ربیع کی تیاریاں کر رہے ہیں - موسم سرما آ رہا ہے، دور گاؤں کے مکانوں پہ
ابابیل اڑتے نظر آتے ہیں"

مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ تارودت نے شعر و شاعری میں مشرقی شاعرانہ انداز نہیں برتا - جب اپنے وطن
سے جو نظمیں متعلق ہیں اُن میں نیٹو کا سا جوش و خروش موجود ہے - ذرا ذیل کے جذبات ملاحظہ ہوں

"قبل اسکے کہ رات میں تبدیل ہونے والی شام کا سایہ پھیلے، ستارے نمودار ہوں اور
جنگلوں کے راستے تاریک ہو جائیں، دیر میں نکلنے والے چاند پہلے شفق رنگ میں
چمک کر بھاگ گیا رتھی کے کنارے پھولنے والے سفید سفید دھتورے کے پھولوں پہ اپنی
ٹھنڈی اور پاک روشنی ڈالتا"

اسی طرح نظم Our Casuarina Tree میں تارودت نے اسی
قسم کے جذبۂ وطنیت کو ظاہر کیا ہے - گو یہ نظم فرانس میں لکھی گئی لیکن ذرا یہ عبارت پڑھیے اور
مع بنگال کے مناظر کا اندازہ کیجیے :-

"جب علی الصباح میرے کمرے کے دریچے کھول دیئے جاتے ہیں - میری نگاہیں خوش ہو کر
اُسی درخت پر پڑتی ہیں - کبھی کبھی موسم سرما میں اکثر بوم (بندر) اسکی شاخ پر بیٹھ کر
خاموش بیٹھا ہوا، طلوع شمس کو دیکھتا ہوا نظر آتا ہے، اور اسکے چاروں طرف شاخوں پر

Casuarina Tree) سے

"۔۔۔کے چھوٹے چھوٹے بچے چوکڑیاں بھرا کرتے ہیں۔ وہ آس پاس کے درختوں پر کوئلیں
"کوکتی، صبح کا خیر مقدم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ نیند میں مخمور گائیں دُم اور کان ہلاتی
"ہوئی چراگاہوں کو جاتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اور درخت سے تھوڑی دُور چشمے کے کنارے
"دھتورے کے سفید پھولوں پر شبنم کے قطرے دیکھے جا سکتے ہیں۔"

[illegible] حصہ جو کہ مغربی دیومالا سے صبح بنگالہ کے اس منظر کا مقابلہ کیونکر کیا جاتا ہے :-

"پیارے درخت! میں نے تیری شاخوں کے ہلنے اور شاخوں سے گزر کر سنسناتی ہوئی ہوا کے
رواں ہونے کو ہمیشہ یاد رکھا۔ اس وقت جبکہ میں زمین کے دور دراز خطوں میں دریا کی
"پری اور سمندر کے عفریت کو بحیرہ روم کے ساحلوں پر تصور کر رہی ہوں تیری یاد میرا
"ایمان ہے۔"
"اطالیہ اور فرانس کی خلیجوں کے Classic کناروں پر جہاں چاندنی رات میں
ہومر اور ورجل کی روحیں گھوما کرتی ہیں۔ اے درخت تیرا تصور میری روحانی آنکھوں
"کے سامنے بالکل اسی طرح پھر جاتا ہے گویا میں نے تجھے اپنے محبوب وطن میں دیکھا۔"

باوجود کرسچین ہونے کے تارودت کو اپنی قوم سے بہت محبت تھی۔ اور قوم کے قدیم مگر لایعنی رسوم سے اس کی طبیعت بہت بیزار تھی۔ خصوصاً شادی بیاہ کے معاملات میں صنف نازک کی بیکسی پر اسکو بہت ترس آتا تھا۔ بنگالیوں میں لڑکی کے ماں باپ جن اخراجات کو برداشت کرنے پر مجبور کیے جاتے ہیں انکی بابت تارودت نے ایک اچھا خاصا مرثیہ لکھا ہے۔

ہندوستان میں جہاں اور بُرے رسوم پھیلے ہوئے ہیں وہاں ایک کمبخت رسم یہ بھی ہے کہ بیواؤں کی شادی معیوب سمجھی جاتی ہے۔ اور یہ ہندوؤں کی صحبت کا اثر ہے کہ مسلمان بھی اسکے پابند ہوگئے۔ افسوس مسلمانوں نے شریعت پر معاشرت کو ترجیح دے کر خود اپنے آپ کو اس بُری رسم کا شکار بنا لیا۔ ورنہ آج ہماری قوم میں بیوہ عورتیں نظر نہ آتیں۔ تارودت بھی اپنی قوم کی اس بُری رسم سے بہت ناخوش تھی جس کا اظہار ایک بڑی نظم میں کیا گیا ہے۔

علم ادب میں تارودت نے جو کمال حاصل کیا، اُس کے خود اہلِ فرنگ بھی قائل ہیں۔
مسٹر ایڈورڈ جے ٹامسن نے اپنی کتاب گلدستہ نظم میں تحریر فرمایا ہے :-
" تارودت کی سوانح عمری ہندوستان کے ہر بچے کو معلوم ہونا چاہیے، کیونکہ اس کمسنی میں ہندوستان
"ہی نہیں، بلکہ انگلستان میں بھی کوئی لڑکی اس دل و دماغ کی نہیں ثابت ہوئی۔"

فرانس اور اطالیہ کے دارالعلوم میں رہ کر قدیم یورپ کے علم ادب پر اس نے کافی عبور حاصل کر لیا تھا۔ اور اگر اس کی زندگی وفا کرتی تو شاید "رومانیات" میں وہ ملٹن اور کیٹس کا مقابلہ کرتی۔

تارودت کی نظم میں مشرقی علم ادب کا رنگ بھی موجود ہے۔ ذیل میں ہم اس کی ایک چھوٹی سی نظم کا ترجمہ نظم ہی میں کرتے ہیں تاکہ جذبات لطیف کا بخوبی اندازہ ہو جائے ؎

"پیامِ صبح"

اٹھو مشرق میں اب خورشید کی ہوتی ہے مہمانی
ستارے کر چکے اب سونے والوں کی نگہبانی
یہ لاہوتی فضا اور تم نہ جاگے واہ رے نادانی
ابھی تک بند ہیں آنکھیں تمہاری یوسف ثانی
کھلے بادِ سحر سے پھول اور ہلنے لگے پتّے
ہر اک گل ہنس پڑا دیکھی جو اپنی چاک دامانی
نسیم صبحدم چلتی ہے ہر شے تازہ تازہ ہے
سفیدی ہے سحر کی اور نکہت کی فراوانی
جدھر دیکھو صدائیں گونجتی ہیں سازِ الفت کی
تمہیں کیوں ہے خمارِ نیند سے اب تک گرانجانی
پکارے مرغ اور بولیں طوطیاں گانے لگی بلبل
افق کا ارغوانی رنگ ہے مشرق میں نورانی
کوئی دولت کوئی عزت کوئی محوِ عبادت ہو
مجھے تو تم محبت ہو تمہاری ہی زیارت ہو

۱۸۷۶ء کے سرما میں تارودت یورپ کے سفر سے واپس آئی اور آخر عمر تک یہیں رہی۔ عمر کا آخری حصہ خوشی سے نہیں گزرا۔ اور انگریزی شاعر کیٹس (Keats) کی طرح غریب تارو بھی مرض دق میں مبتلا ہو گئی۔ یہاں تک کہ اکیس سال اور چند مہینوں کی مختصر زندگی کے بعد ۳۰ اگست ۱۸۷۷ء میں فوت ہو گئی ؎

ﻟﮧ "Sonnets"

آرودت

در یغا کہ شاخِ گلِ نو شگفتہ
فرو ریخت از تند بادِ خزانی

اس کی تصانیف میں "سندھو کی کہانی"، "ہندوستان میں انگریز عورتیں" اور چند قیمتی نظمیں ہیں۔ اگر وہ تندرست رہتی اور زندگی وفا کرتی تو آج آرودت کی شہرت بھی مس سروجنی نائیڈو سے کم نہ ہوتی۔ تب بھی آرودت کی چند مختصر نظمیں اس کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

سید مقبول حسین احمد پوری

ہم پھول بنکے آئینگے اگلی بہاریں

گلشن میں لالہ زار میں اور کوہسار میں
"ہم پھول بنکے آئیں گے اگلی بہار میں"

نکھریں گے حسن بنکے کبھی روئے یار میں
یا سوزِ عشق بن کے دلِ داغدار میں

الفت کا راگ گائیں گے اشکوں کے تار میں
ہونگے مخل کسی کے شکیب و قرار میں

سینے کی آگ بن کے کوئی دل جلائیں گے
یا دل میں درد بن کے کسی کو ستائیں گے

کچھ دن رہیں گے منزلِ ناپائدار میں
تبدیلیاں دکھائیں گے لیل و نہار میں

مخمور ہو کے سوئیں گے اپنے خمار میں
جاگیں گے صبح بن کے اذاں کی پکار میں

کھیلیں گے کھیل آ کے عاشق کے پیار میں
رو رو کے مسکرائیں گے شمعِ مزار میں

یوں مسکرا کے سیکڑوں مردے جلائیں گے
زیر و ترنم کو چھیڑ کے دل میں سمائیں گے

سید مقبول حسین احمد پوری

ذوق

شیخ ابراہیم ذوق کے باپ کا نام شیخ محمد رمضان ہے، جو ایک غریب سپاہی تھے۔ آپ ۱۲۰۴ھ
میں پیدا ہوئے۔ بقول آزاد مرحوم "اُس وقت کسے خبر ہوگی کہ اِس رمضان سے وہ چاند نکلے گا جو
آسمانِ سخن پر عید کا چاند ہو کر چمکے گا"۔ جب آپ پڑھنے کے قابل ہوئے تو آپ کو حافظ غلام رسول نام
ایک شخص بادشاہی حافظ کے مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ وہاں معمولی نوشت و خواند حاصل کی اور شعر
کہنے کا شوق بھی وہیں پیدا ہوا۔ کیونکہ حافظ صاحب بھی شوق تخلص کرتے تھے اور اُن کے یہاں
شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ ابتداء میں آپ بھی حافظ صاحب سے اصلاح لینے لگے اور ذوق تخلص بھی
اُنھی کا عطیہ ہے۔ آزاد نے آپ کے حالات میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ ابتدائے عمر میں کہاں تک آپ نے
علمی استعداد بہم پہونچائی بلکہ جب شاہ نصیر سے خوب معرکہ آرائی ہو چکی اُس کے بعد آزاد لکھتے ہیں کہ
تکمیلِ علوم کے قدرتی سامان ہوگئے اور مولوی عبدالرزاق جو شیخ مرحوم کے قدیمی اُستاد تھے
راجہ صاحب رام کے بیٹے کی تکمیل تعلیم کے لیے مقرر ہوئے۔ اتفاقاً ایک دن شیخ مرحوم مولوی صاحب کے
ساتھ گئے۔ راجہ صاحب جو اُن کی تیزیِ طبع کی شہرت کی بنا پر اُن سے واقف تھے، کہنے لگے کہ تم بھی درس
میں شریک رہا کرو۔ اور اس طرح شیخ مرحوم نے تکمیلِ علوم کی۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ غلام رسول
شوق کے بعد شیخ ابراہیم ذوق نے مولوی عبدالرزاق صاحب سے بھی درسی کتابیں پڑھی تھیں، لیکن تکمیل
کی نوبت نہ آئی تھی کہ شاعری کے مشغلے میں پڑ گئے۔ اور رفتہ رفتہ شاہ نصیر کے شاگردوں میں بھی داخل
ہوگئے۔ مشکل مشکل زمینوں میں شعر نکالنے لگے۔ بمقتضائے سن شاہ نصیر کے صاحبزادے منیر جو کسی
شاعر کو خاطر میں نہ لاتے تھے، اکثر بحث و تکرار ہو جاتی تھی اور خوب مباحثے ہوتے تھے۔ اسی قیل و قال میں
ایک دن سودا کی غزل پر غزل کہی "ہوشِ نقشِ پا، آغوشِ نقشِ پا"، اور شاہ نصیر کے پاس لے گئے۔ بقول
خفا ہو کر غزل پھینک دی کہ اُستاد کی غزل پر غزل کہتا ہے؟ اب تو مرزا رفیع سے بھی اونچا اُڑنے لگا۔
اس طرح ذوق کا بگاڑ شاہ نصیر سے ہوا۔ اس ناچاقی کے بعد ذوق نے اُستاد کی اصلاح کے بغیر
مشاعروں میں غزل پڑھنی شروع کی۔ اور بعض انصاف پسند لوگوں نے آپ کی ہمت افزائی بھی
کی۔ میر کاظم حسین بیقرار جو آپ کے ہم جماعت اور دوست تھے اُن کی وساطت سے آپ قلعہ میں
آنے جانے لگے۔ اور وہاں کے مشاعروں میں دلچسپی لینے لگے۔ جب شاہ نصیر مرحوم دکن چلے گئے

تو مرزا ابو ظفر ولیعہد تھے جو بعد ازاں بہادر شاہ ہوئے، اپنی غزلیں بنانے کی خدمت بیقرار کے سپرد کر دی۔ جب وہ بھی جان الفنسٹن کے میر منشی مقرر ہوگئے تو ولیعہد بہادر آپ کے شاگرد ہو گئے اور چار روپے ماہوار آپ کی تنخواہ مقرر ہوگئی، جو رفتہ رفتہ سو روپیہ ماہوار تک پہونچی۔ اسی درمیان میں نواب الٰہی بخش خاں معروف بھی اصلاح لینے لگے جو فنِ شعر میں کامل تھے، وہ بھی آپ کی کچھ نہ کچھ خدمت کرتے رہتے تھے۔

جب شاہ نصیر دکن سے واپس آئے اور اپنا معمولی مشاعرہ جاری کیا تو آپ کی مشقِ سخن خوب زوروں پر تھی۔ آپ نے بھی مشاعرے میں جاکر غزل پڑھی۔ شاہ صاحب نے دکن میں کسی کی فرمائش سے نو شعروں کی ایک غزل کہی تھی، جسکی ردیف تھی، "آتش و آب و خاک و باد" وہ غزل مشاعرہ میں سنائی، اور کہا کہ اس طرح میں جو غزل لکھے میں اسے استاد مانتا ہوں"۔ دوسرے مشاعرہ میں آپ نے اس پر غزل پڑھی۔ شاہ صاحب کی طرف سے بجائے خود اس پر اعتراض ہوئے جشن قریب تھا، آپ نے اکبر شاہ ثانی کی تعریف میں ایک قصیدہ اسی طرح میں لکھا، مگر پہلے شاہ عبد العزیز صاحب کے پاس لے گئے کہ اسکے صحت و سقم سے آگاہ فرمائیں۔ اُنھوں نے سن کر پڑھنے کی اجازت دی۔ چنانچہ آپ نے دربارِ شاہی میں جاکر قصیدہ سنایا۔ بعد ازاں اس کو مشاعرہ میں بھی پڑھا۔ شاہ نصیر نے ایک مستعد طالب علم کے ذریعہ سے اس پر اعتراضات وارد کیے اور آپ نے جملہ اعتراضات کا جواب نہایت معقول دیا۔ یہاں تک کہ معترض لاجواب ہوگیا۔ ایک شعر پر شاہ صاحب نے بھی یہ اعتراض کیا کہ اس میں روانی کا ثبوت نہیں ہے تو آپ نے کہا یہاں تغلیب ہے۔ شاہ صاحب نے کہا کہ یہ تغلیب کہیں نہیں آئی۔ آپ نے کہا کہ تغلیب کا قاعدہ عام ہے۔ شاہ صاحب نے کہا کہ جب تک کسی استاد کے کلام میں نہ ہو جائز نہیں ہوسکتی۔ آپ نے کہا کہ شاہ صاحب! آپ نے نو شعر کی غزل پڑھ کر فرمایا تھا کہ اس طرح میں کوئی غزل کہے تو ہم اسے استاد جانیں۔ میں نے تو ایک غزل اور تین قصیدے لکھے، اب بھی استاد نہ ہوا۔

ایک مرتبہ آپ نے ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں کہہ کر سنایا، جسکا مطلع ہے :-

جبکہ سرطان و اسد مہر کا ٹھیرا مسکن   آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

اس پر بادشاہ نے خاقانیٔ ہند کا خطاب عطا کیا۔ اس وقت آپ کی عمر صرف انیس برس کی تھی۔

جب مرزا ابو ظفر بادشاہ ہوکر بہادر شاہ ہوئے تو آپ نے پہلے یہ قصیدہ پیش کیا

رو کش ہو تیرے رخ سے کیا نورِ سحر رنگِ شفق   ذرہ ہے تیرے فیض کا نورِ سحر رنگِ شفق

ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوئے۔ جب شفا پائی اور آپ نے ایک قصیدۂ غرا کہکر نذر گزرانا، تو خلعت کے علاوہ خطاب خان بہادر اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی انعام ہوا۔ پھر ایک بڑے زور وشور کا قصیدہ کہکر پیش کیا جسکا مطلع ہے

شب کو میں اپنے سر بستر خوابِ راحت		نشۂ علم میں سرمستِ غرور و نخوت

اس پر ایک گاؤں جاگیر میں عطا ہوا

اگرچہ آپ کی کافی قدر ہوئی، کیونکہ جیسی اُس وقت بادشاہت تھی اُسکے لحاظ سے سو روپیہ ماہوار ایک درباری شاعر کیلیے کافی تنخواہ تھی، مگر آپ ہمیشہ یہی کہتے رہے

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے		اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

آپ ۲۴ر صفر ۱۲۷۱ھ ہجری کی صبح کو جمعرات کے دن راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ ۱۷ دن بیمار رہ کر وفات پائی۔ مرنے سے تین گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا		کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

آپ قد وقامت میں متوسط تھے۔ رنگ سانولا تھا اور چیچک کے داغ بہت تھے۔ آپ کے نو دفعہ[9] چیچک نکلی تھی۔ آنکھیں روشن اور نگاہیں تیز تھیں۔ چہرہ کا نقشہ کھڑا کھڑا تھا۔ بہت جلد چلتے تھے۔ آواز بلند اور خوش آیند تھی۔ جب مشاعرہ میں پڑھتے تھے تو محفل گونج اُٹھتی تھی۔ آپ کے پڑھنے کی طرز آپکے کلام کی تاثیر کو بڑھا دیتی تھی۔

آپ کی قوتِ حافظہ بہت زبردست تھی۔ صلاحیتِ طبع رکھتے تھے۔ سنا جاتا ہے کہ آپ نے اساتذہ کے ساڑھے تین سو دیوان دیکھے تھے اور اُن کا خلاصہ کیا تھا۔ خانِ آرزو کی تصنیفات، ٹیک چند بہار کی تحقیقات اور اس قسم کی اور کتابیں اُن کی زبان پر تھیں۔ تعجب یہ ہے کہ تاریخ کا ذکر آتا تھا تو آپ ایک صاحب نظر مورخ ثابت ہوتے تھے۔ تفسیر کا ذکر آتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ تفسیر کبیر دیکھ کر اُٹھے ہیں۔ علم تصوف اور مسائل وحدتِ وجود و وحدتِ شہود میں کافی دستگاہ تھی۔ رمل و نجوم بھی جانتے تھے۔ چند روز موسیقی اور طب کا بھی شوق کیا۔ آخر جو طبیعت خدا نے دی تھی وہی خوبی قسمت کا سامان بنی۔

کلام پر تبصرہ

ذوق میں ملکۂ شاعری ضرور ودیعت کیا گیا تھا لیکن گرد و پیش کے حالات نے اُسکی شاعری کو جادۂ مستقیم سے ہٹا دیا اور اسکی بعض خصوصیات ترقی نہ کرسکیں ورنہ وہ اُسے نہ صرف ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر بلکہ بہترین شاعر بنوا کر چھوڑتیں۔ وہ گرد و پیش کے کیا حالات تھے جنھوں نے اُسکی شاعری کو نقصان پہونچایا اور وہ اُسکی کیا خصوصیات تھیں جن سے

وہ بہترین شاعر شمار کیا جاتا، ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:-

(۱) ذوق کی شاعری کا نشو و نما اُس زمانہ میں ہوا جب دہلی میں قدیم اساتذہ میں سے کوئی باقی نہ رہا تھا اور صرف شاہ نصیر کوس لمن الملک الیوم بجا رہے تھے - اُنکے نزدیک بد قسمتی سے شکوہ الفاظ کے ساتھ سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنا شاعری تھی - اِس سے زیادہ وہ کچھ نہ جانتے تھے - ہمارے کمسن شاعر کے لیے بھی دہلی کی اُس وقت کی عام حالت پر نظر کرتے ہوے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ شاہ نصیر کے سامنے زانوے شاگردی تہ کرے - پس اِس نوجوان شاعر کے دل میں شاعری کا مفہوم یہی ہو سکتا تھا کہ وہ بھی اپنے اُستاد کی طرح سنگلاخ زمینوں میں شعر نکالا کرے اور اپنے اُستاد ہی کی طرح اپنی شاعری کو بھی کوہ کندن و کاہ برآوردن کا مصداق بنا دے - ظاہر ہے کہ سنگلاخ زمینوں میں تخیل سے جیسا کہ چاہیے کام نہیں لیا جا سکتا، اور ردیف کے ساتھ قافیہ کو کسی نہ کسی طرح بٹھا دینا ہی کمال سمجھا جاتا ہے - اس صورت میں اعلےٰ خیالات اور مصوری جذبات کسی طرح ممکن نہیں ہے بلکہ صرف مبتذل خیالات اور پیش پا افتادہ مضامین ہی باندھے جاسکتے ہیں، مثلاً

اُس نے جب مال بہت رد و بدل میں مارا	ہم نے دل اپنا اُٹھا اپنی بغل میں مارا
چرخ بد بیں کی کبھی آنکھ نہ پھوٹی سو بار	تیر نالے نے مرے چشم زحل میں مارا
دل کو اُس کاکل پیچاں سے نہ بل کرنا تھا	یہ سیہ بخت گیا اپنے ہی بل میں مارا
آنکھ سے آنکھ ہی لڑتی مجھے ڈر ہے دل کا	کہیں یہ جائے نہ اِس جنگ و جدل میں مارا
بے خبر قافلۂ عیش گزر جاتا ہے	بے زباں ہے جو دہانِ جرس جام شراب
ابلقِ چشم سیہ مست کو تیری دیکھا	ورنہ اب تک نہ سنا تھا فرس جام شراب
مجنوں نے دی لگا جو سرِ خار زار پشت	پشت اب ہجوم خار سے ہے پشتِ خار پشت
تھی زلف تیری سنبل صحنِ چمن کی شاخ	قطروں سے پرعرق کے بنی یاسمن کی شاخ
کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد	سینے میں ہوگی سانس اَڑی دو گھڑی کے بعد
مژدۂ قتل ہے اُس عہد شکن کا کاغذ	ہے مری روح کو آزادی تن کا کاغذ
ساقی بطِ شراب ہے تجھ بن پڑی ہوئی	خم سے الگ ایاغ سے دور اور شکستہ پر
اُس مرغ ناتواں پہ ہے حسرت جو رہ گیا	مرغانِ کوہ و راغ سے دور اور شکستہ پر

صرف آخری شعر کسی قدر اچھا ہے، ورنہ تمام شعر بے لطف اور بے کار ہیں

(۲) اتفاق سے ذہین اور تیز طبیعت شاگرد اور اُستاد سے بہت جلد بگڑ جاتی ہے، کیونکہ وہ سودا

کی سنگلاخ زمین پر طبع آزمائی کرتا ہے۔ اُستاد شاگرد کی خداداد قابلیت دیکھ کر دل ہی دل میں کُڑھتا ہے اور اُس کو یہ کھٹکا ہوتا ہے کہ اب تو "مرزا رفیع سے بھی اونچا اُڑنے لگا" شاگرد کو ناگوار ہوتا ہے، اور ہمارے نزدیک اُسے خفا ہوجانا بھی چاہیے تھا، کیونکہ ذوق کی غزل کا پلّہ سودا کی غزل سے بھاری ہے۔ دوسرے یہ کوئی عیب کی بات بھی نہیں کہ ایک شاعر اُستاد کی غزل پر غزل کہے۔ تمام شعرا ایسا ہی کرتے آئے ہیں۔ اگر یہ ممانعت عام کردی جائے تو بڑی دشواری کا سامنا ہو جائے۔ ہم ذوق اور سودا کی غزلیں ذیل میں درج کرتے ہیں تاکہ قارئین کرام خود بھی اندازہ کرسکیں کہ ہماری رائے کہاں تک درست ہے:-

ذوق

رکھتا ہر قدم ہے وہ یہ ہوشِ نقشِ پا — ہو خاک عاشقاں نہ ہم آغوشِ نقشِ پا

افتادگاں کو بے سروساماں نہ جانیو — داماں خاک ہوتا ہے روپوشِ نقشِ پا

اعجاز پا ہے تیرے عجب کیا کہ راہ میں — بول اُٹھے منہ سے ہر لبِ خاموشِ نقشِ پا

اس رہگزر میں کس کو ہوئی فرصت مقام — بیٹھے ہے نقشِ پا یہ سرِ دوشِ نقشِ پا

جسم نزار خاک نشینانِ کوئے عشق — یوں ہے زمیں پہ جیسے تنِ دوشِ نقشِ پا

فیضِ برہنہ پائی مجنوں سے دشت میں — ہر آبلہ بنے ہے دُرِ گوشِ نقشِ پا

پابوس در کنار کہ اپنی تو خاک بھی — پہنچی نہ ذوق اُس کے بہ آغوشِ نقشِ پا

سودا

کیا جانئے کس کی خاک ہے ہم دوشِ نقشِ پا — یوں دھر قدم کہ تا نہ دبے دوشِ نقشِ پا

پابوس پر رقیب بحث دے ہے جی کہ واں — کب ہے قبولِ خاطرِ پاپوشِ نقشِ پا

احوال تشنگاں کے نکالا بت کر نظر — حیراں رہے ہیں صورتِ خاموشِ نقشِ پا

دہشت ہے کبر اہلِ جہاں سے یہ اب مجھے — افتادگی نہ ہووے فراموشِ نقشِ پا

کثرت سے کیسے یار میں گرمی ہے یہ کہ داں — پڑتا ہے پا میں آبلہ از جوشِ نقشِ پا

کس کی سنے ہیں خاک نشیناں راہِ عشق — گوش اپنے کر رہیں اتنے کہ جوں گوشِ نقشِ پا

گزرے وہ کیونکہ خاک سے میری کہ تا ابد — چھوٹے قدم کہ اُس کے نہ آغوشِ نقشِ پا

افتادگاں تک آن کے کیا کھینچئے راہزن — جز خاک کچھ نہیں ہے در آغوشِ نقشِ پا

اے شوخ ہرزہ گردی نے تیری سراک جا — خونِ جگر کیا ہے مرا نوشِ نقشِ پا

سودا بقول حضرت بیدل بکوے دوست
خطِ جبیں است ہم آغوشِ نقشِ پا

یہ تو ظاہر ہے کہ ایسے مضامین ایسی سنگلاخ زمین میں نہیں نکل سکتے تھے۔ چنانچہ اس لحاظ سے دونوں غزلیں بیکار اور فضول ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کس کی غزل تعقید سے پاک ہے اور کس کے یہاں روانی اور برجستگی پائی جاتی ہے۔ نیز یہ کہ قافیے کس شاعر نے اچھے بٹھا دیے ہیں۔ ہم مجبور ہیں کہ ذوق کو سودا پر ترجیح دیں اور صاف صاف کہدیں کہ ذوق کی غزل کے سامنے سودا کی غزل پھیکی ہے۔

بہرحال اس بگاڑ کے بعد ذوق نے شاہ نصیر کے یہاں آنا جانا بند کر دیا اور اب وہ دہلی کے مشاعروں میں اُستاد کو غزل دکھائے بغیر پڑھنے لگا۔ شاہ نصیر کے دیگر شاگرد اور اُنکے ہمنوا جن سے تمام دلی بھری پڑی تھی اُسکے اشعار پر اعتراض بھی کرتے تھے لیکن وہ اُنکو معقول جواب دیتا تھا اور رفتہ رفتہ اپنی شہرت کی بنیاد رکھتا جاتا تھا۔ تاہم ظاہر ہے کہ اس نوجوان شاعر کے دل میں یہی جذبہ کارفرما ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے مخالفین کو اپنے کمال کا قائل اُسی قسم کی شاعری سے بنائے جس کو وہ شاعری سمجھتے تھے۔ چنانچہ ذوق نے ایسا کیا اور اس میں شک نہیں کہ اُس نے یہ کام کامیابی کے ساتھ انجام دیا۔ مثال کے طور پر ہم ذوق کی وہ غزل لکھتے ہیں جو سنگلاخ ہونے کے علاوہ شاہ نصیر کی غزل پر لکھی گئی تھی۔

ذوق

لکھیے اُسے خط میں کہ ستم اُٹھ نہیں سکتا
پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم اُٹھ نہیں سکتا

بیمار ترا صورتِ تصویرِ نہالی
کیا اُٹھے سر بستر غم اُٹھ نہیں سکتا

آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ
صد حیف کہ مجنوں کا قدم اُٹھ نہیں سکتا

جوں دانۂ دوئیدہ تو خاک ہمارا
سر زیر گراں بارِ الم اُٹھ نہیں سکتا

ہر داغِ معاصی مرا اس دامن تر سے
جوں حرفِ سر کاغذ نم اُٹھ نہیں سکتا

اتنا ہوں تری تیغ کا شرمندۂ احساں
سر میرا ترے سر کی قسم اُٹھ نہیں سکتا

پردہ درِ کعبہ سے اُٹھانا تو ہے آساں
پر پردۂ رخسارِ صنم اُٹھ نہیں سکتا

کیوں اتنا گراں بار ہے جو رختِ سفر بھی
اے راہروِ ملکِ عدم اُٹھ نہیں سکتا

دنیا کا زر و مال کیا جمع تو کیا ذوق
کچھ فائدہ بے دستِ کرم اُٹھ نہیں سکتا

شاہ نصیر

ہے اشکِ رواں ساتھ لیے آہ جگر کو
عاشق کہیں بے فوج و علم اُٹھ نہیں سکتا

سر معرکۂ عشق میں آساں نہیں دینا
گاڑے ہے جہاں شمع قدم اُٹھ نہیں سکتا

سقفِ فلکِ کہنہ میں کیا خاک لگاؤں — اے ضعفِ دل اس آہ کا تھم اٹھ نہیں سکتا

ہے جنبشِ مژگاں کا کسی کی جو تصور — دل سے خلشِ خارِ الم اٹھ نہیں سکتا

دل پر ہے مرے خیمۂ ہر آبلہ استاد — کیا کیجے کہ یہ لشکرِ غم اٹھ نہیں سکتا

ہر جا متجلی ہے وہی پردۂ غفلت — اے متکلفِ دیر و حرم اٹھ نہیں سکتا

یوں اشک زمیں پر ہیں کہ منزل کو پہونچکر — جوں قافلۂ ملکِ عدم اٹھ نہیں سکتا

شاہ صاحب کا صرف حسب ذیل شعر اس طرح میں اچھا ہے۔ اگرچہ ذوق کا شعر اس قافیہ میں بھی شاہ صاحب کے شعر سے بلند تر ہے۔

سر معرکۂ عشق میں آساں نہیں دینا — گاڑے ہے جہاں شمع قدم اٹھ نہیں سکتا

(۳) شاہ نصیر دہلی سے حیدرآباد دکن اور دیگر مقامات کو جاتے ہیں اور بہادر شاہ متخلص بہ ظفر کی غزلیں بنانے کی خدمت ذوق کے سپرد ہوتی ہے۔ یہ بادشاہ ہندی الفاظ اور محاوروں کے استعمال کو پسند کرتا ہے۔ خیالات سے اسے بحث نہیں کہ کیا ہوں، لیکن محاورات اور سیدھے سادے الفاظ اشعار میں داخل ہو جائیں۔ اس اُستادی اور شاگردی کا اثر ذوق کے کلام میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ ذوق کی کسی غزل کو لے لیجیے، جہاں تک اُس کا بس چلا ہے محاوروں کے بھرنے میں اسنے کوئی کوتاہی نہیں کی مثلاً

باقی ہے شیخ کو ابھی حسرت گناہ کی — کالا کرے گا منہ بھی جو داڑھی سیاہ کی

محتسب گرچہ دل آزار ہے میخواروں کا — دیجیے اک جام تو ہے یار ابھی یاروں کا

بغل سے لے گئے دل کو نکال کر وہ صریح — جو مانگا تو کہا آنکھیں نکال کے کیسا

میں کہاں سنگِ درِ یار سے ٹل جاؤنگا — کیا وہ پتھر ہے پھسلنا کہ پھسل جاؤنگا

جنبشِ برگ صفت باغِ جہاں میں لے ذوق — کچھ نہ ہاتھ آئیگا تو ہاتھ ہی مل جاؤنگا

پانی طبیب دے ہے ہمیں کیا سمجھا ہوا — ہے دل ہی زندگی سے ہمارا سمجھا ہوا

اس سے تو اور آگ وہ بیدرد ہو گیا — اب آہ و آتشیں سے بھی دل سرد ہو گیا

سینے میں بوالہوس کے بھی تھا آبلہ مگر — نشتر کا نام سنتے ہی منہ زرد ہو گیا

تلخکامی کا رہا بعد فنا بھی یہ اثر — استخواں کو ہے منہ پر نہ ہما نے رکھا

نشۂ دولت کا بد اطوار کو جس آن چڑھا — سر پہ شیطان کے اک اور بھی شیطان چڑھا

کٹ کے ہے خنجرِ قاتل سے یہ گلو میرا — کمی جو مجھ سے کرے تو پیے لہو میرا

ہے قطع رہِ شوق میں اے ذوق ادب شرط — جوں شمع تو اب سر ہی کے بل جائے تو اچھا

کہاں تک مثالیں دی جائیں، محاورات سے دیوان بھرا پڑا ہے۔ جس طرح شاہ [illegible] اُردو میں لائی

نذیر احمد نے محاورات کے بکثرت استعمال سے اپنا طرز خاص بنا لیا ہے۔ اسی طرح ذوق نے محاورات
کی کثرت سے غزل گوئی میں اپنا ایک خاص رنگ ایجاد کر لیا ہے۔ لیکن اس سے شاعری کو کوئی خاص
نفع نہیں پہونچا۔ ذوق کا بہت سا حصہ کلام ضائع ہوگیا ہے، لیکن فرض کیجیے جو کچھ اب موجود ہے
یہ بھی ناپید ہو جاتا تو ہماری اُردو شاعری کو کیا نقصان پہونچتا؟ جہاں تک محاورات کے استعمال کا تعلق
ہے مولوی نذیر احمد کی کتابیں بدرجہ اولیٰ اس کام کو انجام دیتی ہیں۔ سند کے اعتبار سے بھی مسلمہ انشا پرداز
کی تحریرات کسی اُستاد شاعر کے کلام سے کم پایہ نہیں رکھتیں۔ اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ نفس
شاعری کو محاورات کے استعمال نے کیا ترقی دی؟ ہم اسکے جواب میں یہ عرض کریں گے کہ اس سے
مطلق ترقی نہیں ہوئی۔

(۴) ناسخ کا دیوان دہلی میں پہونچتا ہے اور ذوق کی طبیعت میں ناسخ کی تقلید کا شوق پیدا
ہوتا ہے۔ وہ اب تک سودا کی تقلید میں گامزن تھا۔ سنگلاخ زمینوں میں لکھنا شاہ نصیر سے سیکھا
تھا اور شکوہِ الفاظ کلام سودا کے مطالعہ سے۔ محاورات کو اشعار میں داخل کرنے کی عادت ظفر کی
فرمائش سے پیدا ہو ہی گئی تھی، اب مثالیہ شاعری کی کمی باقی تھی وہ ناسخ کے دیوان کے مطالعہ سے
پوری ہوگئی۔ اور رعایت لفظی یا تناسب لفظی کو بھی جگہ دی گئی۔ مثلاً

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا — آسماں آنکھ کے تِل میں ہے دکھائی دیتا
نام یوں بستی میں بالا تر ہمارا ہوگیا — جس طرح پانی کنوئیں کی تہ میں تارا ہوگیا
دریائے غم سے میرے گزرنے کے واسطے — تیغ خمیدہ یار کی لوہے کا پل ہوا
بجھنے کی دل کی آگ نہیں زیرِ خاک بھی — ہوگا درخت گور پہ میری چنار کا
کھینچے دل انساں کو نہ وہ زلف سیاہ فام — اژدر کوئی انساں کو نگل جائے تو اچھا
بعد مردن بھی خیالِ چشمِ فتاں ہی رہا — سبزۂ تربت مرا وقفِ غزالاں ہی رہا
میں ہمیشہ عاشقِ پیچیدہ مویاں ہی رہا — خاک پر روئیدہ میری عشق پیچاں ہی رہا
وادیٔ ظلمت میں پہنچے [illegible] نور کا — ہر اک شعلہ [illegible] چراغ [illegible] کا
ہے فیض سے دنیا [illegible] میری نگاہ میں — جس شاخ میں ثمر ہے وہ ہے لاکھ من کی شاخ
بدخصلتوں کو کرتا ہے بالانشیں فلک — اونچی ہے آشیانۂ زاغ و زغن کی شاخ
رہتے ہیں کشمکش میں پس از مرگ پُرجفا — آخر کو زیرِ ارّہ گئی کرگدن کی شاخ

(۵) لہٰذا ذوق کی شاعری اس معجونِ مرکب کا نام ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے۔ لیکن اسکے دل

پر ابھی ایک اور اثر پڑنا باقی تھا اور وہ اثر اُسکے ہمعصر شعراء غالب اور مومن کے اشعار کا تھا جن میں زیادہ تر جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے اور بلند خیالی کی داد دی گئی ہے - پس ذوق نے بھی اپنے ہمعصر شعراء کی طرح کہیں کہیں واردات قلبی کو بیان کیا ہے اور خوب بیان کیا ہے مگر وہ اپنی قدیم طرز شاعری میں پختہ اور شاق ہو چکا تھا اب عمر کے آخری حصہ میں اُس سے یہ توقع بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنا کمال ظاہر کرے اور حقیقی شاعری کا مرد میدان بنے - اگر وہ ابتدا ہی سے میر کے کلام کا مطالعہ کرتا اور اپنی شاعری کی بنیاد اُسی شاعری پر رکھتا تو اسکی جولانی طبع وہ زور دکھاتی کہ دیگر شعرا اسکی گرد کو بھی نہ پہونچتے - مثلاً

اُمید ہو گئی ہمسایہ، ورنہ خانۂ یاس　　بہشت تھا ہمیں آرام جاوداں کے لیے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے　　مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اکدم بھی ہجر میں جینا تھا ہم کو ناگوار　　پر اُمید وصل میں برسوں گوارا ہو گیا

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو　　تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدر وسعت　　تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے

وہ کون سا غم ہے جسے پاتے نہیں دل میں　　لیکن نہیں پاتے تو خوشی کو نہیں پاتے

عمر خضر بھی ہو تو ہو معلوم وقت مرگ　　ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

ذوق کی خصوصیات جن کو ترقی کا موقع نہ ملا یا حقیقی شاعری کے اظہار میں اُن سے مدد نہ لی گئی حسب ذیل ہیں :-

(۱) وہ ایسا فصیح البیان ہے کہ ادق سے ادق اور ثقیل سے ثقیل لفظ کو شعر میں اس طرح لکھ دیتا ہے کہ پڑھنے والے کی زبان پر آسانی جاری ہو جاتا ہے - اگر ہم اُسی لفظ کو علیحدہ پڑھیں تو کسی قدر گراں معلوم ہوگا لیکن شعر کے اندر اُسکا ثقل جاتا رہتا ہے - بیشک میر انیس کے کلام میں بھی یہی بات دیکھی گئی ہے لیکن دیگر شعراء کے یہاں اس قسم کی مثالیں مشکل سے ملیں گی -

ہوا یہ سینہ کہ سرخار زار وحشت غم میرا　　کہ آیا پا بجوں آغشتہ ہو کر لب پہ دم میرا

پا بجوں آغشتہ کا ثقل شعر کے اندر داخل ہونے سے جاتا رہا ہے -

وہ ہوں میں گیسوئے موج محیط اعظم وحشت　　کہ ہے گھیرے ہوئے روئے زمیں کو پیچ و خم میرا

موج محیط اعظم کا ثقل ملاحظہ ہو، لیکن باوجود دو اضافتوں کے کس قدر روانی پیدا ہو گئی ہے - 'گیسوئے موج محیط اعظم وحشت'، اول تو ایک اضافت بھی بعض اوقات ناگوار گزرتی ہے - خیر ایک نہیں تو دو اضافت سہی - اس سے زیادہ عام طور پر نہ ہونی چاہییں، لیکن یہاں دو کا کیا ذکر تین بھی نہیں بلکہ چار اضافتیں

موجود ہیں اور روانی ہے کہ سبحان اللہ!

مری صورت کے معنی ہیں نفخت فیہ من روحی ... حدوث بے ثبات، اثبات کرتا ہے قدم میرا

نفخت فیہ من روحی، حدوث بے ثبات اور اثبات سب کافی ثقیل ہیں لیکن شعر نے ثقل کو روانی میں تبدیل کر دیا ہے۔ مگر الفاظ کی بندش کیسی ہی چست اور عمدہ کیوں نہ ہو۔ ان اشعار میں جو مضامین بیان کیے گئے ہیں وہ دل پر کوئی اثر نہیں پیدا کرتے کیونکہ دوسرے شعر میں انتہائے غلو سے کام لیا گیا ہے۔ اور تیسرے شعر میں "مادہ حادث ہے اور روح قدیم" کے مسئلہ کو چھیڑ دیا ہے۔ البتہ پہلے شعر میں تشبیہ ہے اور خوب تشبیہ ہے لیکن اثر پیدا کرنے سے قاصر ہے۔

(۲) وہ مشکل سے مشکل مضمون کو آسان اور عمدہ پیرایہ میں ادا کر جاتا ہے اور اس کے لیے بہت آسان اور فصیح الفاظ تلاش کر لیتا ہے۔ کہتا ہے

جا پڑا پاؤں پہ قاتل کے تڑپ کر کشتہ ... سرد ہونے پہ بھی گرمی وفا ہے اس میں

مطلب یہ ہے کہ معشوق امتحانِ وفا میں عاشق کو قتل کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مرنے کے بعد کوئی اظہارِ وفا عاشق سے نہیں ہو سکتا۔ اُسکی وفا شعاری قتل ہونے پر ختم ہو جانی چاہیے۔ لیکن ذوق کہتا ہے کہ قتل ہو جانے کے باوجود وہ اس طرح مزید اظہارِ وفا کرتا ہے کہ تڑپ کر قاتل کے پاؤں پر جا پڑتا ہے۔ یعنی قتل ہونے پر بھی اُسی کا والہ و شیفتہ رہتا ہے۔ گرمیِ وفا نہایت خوبی کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ تمام الفاظ سلیس اور مناسب تلاش کیے گئے ہیں۔ پھر واقعہ بھی یہی ہے کہ اکثر مقتول قتل ہونے کے بعد تڑپ کر قاتل کے پاؤں پہ جا پڑتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ قتل، قاتل اور مقتول کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ اس مضمون کو ادا کرنا دشوار تھا لیکن ذوق نے آسانی کے ساتھ بیان کر دیا۔

جنوں نے کچھ نہ چھوڑا آخر اپنے جیب و داماں میں ... نفس اک تار ہے سینے میں سمجھو یا گریباں میں

جو لذت آشنائے مرگ ہوتا خضر، تو وہ بھی ... نہ پیتا آبِ حیواں، ڈوب مرتا آبِ حیواں میں

دونوں شعر مشکل مضمون کو آسان الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ پہلا شعر اس مضمون کو ادا کرتا ہے کہ ہم نے وحشت میں اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور ایک تار بھی بدن پر باقی نہیں رہا۔ اب صرف لباسِ عریانی ہے اور ہم ہیں اور ہمارے سینے میں جو تارِ نفس ہے اسکو خواہ ہمارے لباسِ عریانی کا ایک تار سمجھو یا ہماری زندگی کا ایک سلسلہ سمجھو، ورنہ ہم میں کچھ باقی نہیں رہا۔

دوسرا شعر موت کی لذت کو کس خوبی سے ظاہر کرتا ہے۔ خضر آبِ حیواں میں نہیں معلوم اس شرم سے ڈوب مرتا کہ کیوں اُس نے ابدی زندگی کی خواہش کی، یا اس وجہ سے ڈوب مرتا کہ زندگی کے مقابلہ میں

موت میں زیادہ لطف ہے - بہرحال ایسے مشکل مضامین کو آسان الفاظ میں ادا کرنا ذوق ہی کا کام ہے
(۳) اُس کی اپنی ترکیبیں رواں اور برجستہ ہیں، نامانوس اور غریب نہیں معلوم ہوتیں - بلکہ عام شاہراہ سے اُنکے علیحدہ ہونے کا گمان بھی نہیں ہوتا - مثلاً

اے صنم کیا پوچھتا ہے حال اس رنجور کا ۔۔۔ دل نہ اٹکائے کہیں اللہ بے مقدور کا
سرِ راہِ فنا میں ہوں مہیائے سفر لیکن ۔۔۔ برنگِ اشکِ مژگاں منتظر ہوں اک اشارہ کا
جاان لباسیوں کے نہ ظاہر لباس پر ۔۔۔ عاری عبائے ہوش و قبائے خرد سے ہیں

لباسیوں کی ترکیب عجیب ہے مطلب اُن اشخاص سے ہے جو ٹیپ ٹاپ سے رہتے ہیں -

ذوق اس صورت کدہ میں ہیں ہزاروں صورتیں ۔۔۔ کوئی صورت اپنے صورتگر کی بے صورت نہیں

صورت کدہ، صورت گر، بے صورت تمام عمدہ اور نئی ترکیبیں ہیں - دُنیا کو صورت کدہ کہنا، خدا کو صورتگر بتانا اور بے شکل کو بے صورت بیان کرنا حُسنِ ترکیب ہے -

کھاکے زخمِ تیغ قاتل جو بجا لائے نہ شکر ۔۔۔ کوئی بھی اُس سے زیادہ کافرِ نعمت نہیں
ہو اسنے زلف کو چھیڑا اور اپنا دل لرزتا ہے ۔۔۔ کہیں ایسا نہ ہووے ہم سے وہ کافر ادا سمجھے
محبت سے ذرا گرموم ہو اُس دلشکن کا دل ۔۔۔ دلِ شکستہ میرا اپنے حق میں مومیا سمجھے

معشوق کو دلشکن کہا گیا ہے -

موذیوں کو حق نے دے آنکھیں کر نالا دیں بلا ۔۔۔ عین حکمت تھی کہ معدوم ہیں بصیر عقرب بنے
گاہ ہجوم یاس میں ہے دل گاہ ہجومِ حسرت میں ۔۔۔ ہے یہ مرد سپاہی پیشہ پھرتا لشکر لشکر ہے
خنجر کہیں نہ یار کا بہ جائے ہو کے آب ۔۔۔ میرے گلے میں نالۂ آہن گداز ہے

(۴) اس کی تخئیل بھی زبردست ہے، لیکن خال خال اشعار میں اس کا وجود پایا جاتا ہے - جو اشعار ہم نے ذوق کے منتخب کلام کے ذیل میں درج کیے ہیں وہ اُنکی اعلیٰ تخئیل کی مثال ہیں یہاں صرف ایک شعر لکھتے ہیں

ہوا حمدِ خدا میں دل جو مصروفِ رقم میرا ۔۔۔ الف الحمد کا سا بن گیا گویا قلم میرا

قلم کو الحمد کے الف سے تشبیہ دینا موقع اور مضمون کے لحاظ سے کس قدر نادر ہے - دوسرے الف الحمد میں خاک اضافت ہے جو سجیدہ نفیس ہے - گمان بھی نہیں ہوتا کہ اضافت نداد ہے -
افسوس ہے کہ ذوق جیسا قادر الکلام شاعر زمانہ کے ہاتھوں حقیقی شاعری سے جس کا ملکہ قدرت نے اُس میں ودیعت کیا تھا اتنا دُور ہو گیا کہ رعایتِ لفظی اور تلازمہ کو شاعری سمجھا جس کا ذکر ہو چکا ہے

اُس کو ظفر کی فرمائشوں نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ میر کی طرح خانہ نشیں ہو کر جذباتِ دلی کی ترجمانی کرتا اور دنیا کو دکھلا دیتا کہ شاعری کیا چیز ہے۔ دیکھیے یہ شاعر لفظوں کے ساتھ کیسا کھیلتا ہے۔ اسے تجنیس لفظی کہیے یا الفاظ کا گورکھ دھندا۔ لیکن شاعری ہرگز نہیں کہہ سکتے۔

اے اجل تخفیف ستم کیا کر گئی آن کر ـ ہو چکا پہلے ہی کشتہ میں کسی کی آن کا

بیمارِ محبت نے لیا تیرے سنبھالا ـ لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا

تا صاف کرے دل نہ مے صاف سے صوفی ـ کچھ سود و صفا علمِ تصوف نہیں کرتا

جاتی رہے زلفوں کی گرہ دل سے ہمارے ـ افسوس کچھ ایسا ہمیں لٹکا نہیں آتا

جو کھُل کر اُن کا جوڑا بال آئیں سر سے پاؤں تک ـ بلائیں آ کے لیں سو سو بلائیں سر سے پاؤں تک

سینے کا چاک سینے کی فرصت کہاں کہ ہیں ـ مصروف زخمِ دل کی مگس رانیوں میں ہم

عدو آیا ہے لیکر نامہ بر لکھا نصیبوں کا ـ کریں گے لیکے خط کیا مدعی سے مدعا سمجھے

پھینکے ہے ایک جنبشِ مژگاں میں وہ پری ـ اس اپنے ناتواں کو پرے کوہ قاف سے

ذاتِ دنیا ہے عجب طرح کی علامۂ دہر ـ مردِ دیندار کو بھی دہریہ کر دیتی ہے

جو دل قمار خانہ میں بت سے لگا چکے ـ وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

چُنی تو نے افشاں جو اے مہ جبیں ہے ـ ستاروں میں کیا کیا چناں اور چنیں ہے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے ـ پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

گر دکھا دوں عالم اپنے نالہ ہائے زار کا ـ کام دوں ہر تار کو سے تارِ موسیقار کا

تم بیٹھے بغل میں جو رقیبِ دغلی کی ـ کی گرم بغل ہم نے بھی گورِ بغلی کی

آتے ہی گھر کے تو نے پھر جانے کی سنائی ـ ہو جاؤں سُن نہ کیونکر یہ تو بُری سنائی

ذوق نے ضرب الامثال کے باندھنے میں بھی بہت وقت صرف کیا ہے۔ مثلاً چند اشعار لکھتا ہوں

پہونچا ہے شب کمند لگا کر وہاں رقیب ـ سچ ہے حرامزادے کی رسی دراز ہے

لے گیا چھین کے دل، مت بچشم قہر دیکھ ـ گڑ دیے سے جو مرے تو نے نہ اُسکو زہر دیکھ

زلف کی قینچی سے دل ڈرتا نہیں ـ بھوت بھاگے ہے وگرنہ مار سے

سینہ و دل پہ مرے زخمِ جگر ہنستے ہیں ـ ہنسنے دو چارہ گرو ہنستے ہی گھر بستے ہیں

مرے نالوں سے چپ ہیں مرغِ خوش الحاں ـ صدا طوطی کی سنتا کون ہے نقار خانہ میں

کرے وحشت بیاں چشمِ سخن گو اسکو کہتے ہیں ـ یہ سچ کہتے ہیں سر چڑھ بولے جادو اسکو کہتے ہیں

سوالِ بوسہ کو ٹالا جوابِ چینِ ابرو سے	براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو اسکو کہتے ہیں
تو کہے غنچہ کہ اُس لب پہ دھڑی خوب نہیں	چُپ کہ منہ چھوٹا سا اور بات بڑی خوب نہیں
مجھ میں کیا باقی ہے جو دیکھے ہو تو آنکے پاس	بدگماں وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس
سرمہ ہے سفاک شہرہ ہے نگاہِ یار کا	سچ کہا ہے باڑھ کاٹے نام ہو تلوار کا

بعض عربی ضرب الامثال اور محاورات کو شعروں میں خوب نباہا ہے۔ مثلاً

ہم تو سنتے تھے سدا کُلُّ حموضٍ باردٌ	ذوق ہوتا ہے وہ کیوں ہو کے ترش بردگرم
دوزخ بھی جائے نعرۂ ہَل مِن مَزید ہو	لائیں جو آہ کو شرر افشانیوں میں ہم
الٰہی کس بے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے	کہ آج کوچہ میں اُسکے شور بای ذنب قُتلت ہے
سچ ہے الحرب خدعۃٌ اے ذوق	نگہ اُس کی دغا سے لڑتی ہے
ہمارے سینے میں وہ آہِ آتشیں ہے ذوق	جو برق دیکھے تو فی النار و السقر ہو جائے

ذوق کے یہاں بھی دیگر شعراء کی طرح ادق الفاظ پائے جاتے ہیں لیکن اُس نے انکو ایسا باندھا ہے کہ خواہ انکے معنی نہ معلوم ہوں مگر زبان پر رواں ہو جاتے ہیں۔ مثلاً

میں وہ ہوں نخچیر جسکو دیکھتا ہے وقتِ ذبح	دیدۂ حیرت سے حلقہ جوہرِ ساطور کا
کھینچے مانی اُس پری کی کیسے تصویر [illegible]	جمع ہو جب تک نہ رنگِ سُرخ روئے حور کا
لکھیں اُس چشم کے وحشی کے لیے گر تعویذ	اہلِ تکسیر کریں پشتِ ہرن کا کاغذ
رہے ہے جوں قمرِ منخسف سدا بے نور	سیاہ بختوں کے بالینِ گور کی قندیل
خبر کر جنگِ زفل کی تو مجنوں اہلِ ہاموں کو	کیا دہ تا صبا کھینچو انے شاخ بید مجنوں کو

ذوق کے یہاں بعض رکیک اشعار بھی پائے جاتے ہیں مثلاً

نہ جھاڑا غیر کو تو نے کہ ہو کر جھاڑ لپٹا تھا	مجھی پہ گالیوں کا جھاڑ تو نے برزبان باندھا
ناف اُس صبیح کی ہے کوئی نسترن کا پھول	اور ناف لیکے سینے سے ہے نسترن کی شاخ
اُس لعل لب کے ہم نے لیے بوسے اس قدر	سب اُڑ گئی مسی کی دھڑی دو گھڑی کے بعد
جھومر کا نظر سر پہ ترے اب تو پڑا چاند	تھا وعدہ چڑھے چاند کا لا بوسہ چڑھا چاند
تم مسی مل کے نہ غرفے سے لگا یا منہ کرو	اور نہیں گر مانتے تو جاؤ کالا منہ کرو

ذوق نے لوگوں کے عقائد و رسوم و توہمات کو بھی اپنی شاعری میں خوب جگہ دی ہے۔ مثلاً چند اشعار لکھے جاتے ہیں:-

ڈھلکا ہے شال، اذ تسبیح کیوں منکا
کہ جب ٹھہرا سفر دنیا سے کیا کام ستارے کا

عشق کے مکتب میں ہو فرہاد سے تیز ذہن
تین دن چاٹے اگر تعویذ میری گور کا

تپ سوز محبت کے لیے چارہ نہیں قمری
یہ گنڈا نیلگوں گردن پہ کیوں اے تفتہ جاں باندھا

یاں تک عدو زمانہ ہے مرد دلیر کا
جھلسے ہیں منہ شکار کیے پر بھی شیر کا

جسکے سبب لڑائی ہو وہ آدمی نہیں
کانٹا ہے گھر میں ماہی کا یا گل کنیر کا

وعدہ ہے آنے کا اُسکے ابر کھلجائے تو تنئے
ڈالتا ہوں میدہ اُٹھو اُٹھ کے روغن آب میں

چھلا نہیں تو چھلے کا گل اے نگار دے
کچھ تو نشانی اپنی مجھے یادگار دے

ذوق کے یہاں بعض الفاظ ایسے بھی استعمال ہوے ہیں جو اب متروک ہوگئے ہیں مثلاً

فلک کا رنگ جو ابتک سیاہ ہے اُسیر
پڑا تھا سایۂ بخت سیہ کبھو میرا

آج اُن سے مدعی کچھ مدعا کہنے کو ہیں
پر نہیں معلوم کیا کہوینگے کیا کہنے کو ہیں

بجھنے کی دل کی آگ نہیں زیر خاک بھی
ہوگا درخت گور پہ میری چنار کا

واہ وا شور محبت خوب ہی چٹخارا نمک
استخواں میری ہما کس کس مزے سے کھائے ہے

ذوق نے بعض الفاظ کے اُلٹ پھیر سے بھی مضامین نو پیدا کیے ہیں۔ اگرچہ ہم اس قسم کی شاعری کے قائل نہیں۔ مثلاً

درد دل سے لوٹتا ہوں میرا کس کو درد ہے
ہوں میں حرف درد جس پہلو سے الٹو درد ہے

پھیر کر ادھر اُدھر نہ ہمارا گیا قلق
لفظ قلق کی طرح سے وہ ہی رہا قلق

قفس سے بند ہیں جیسے سین و قاف قفس
قفس میں بند ہیں ہم مثل فا ناف قفس

ذیل میں ذوق کا منتخب کلام ہدیۂ ناظرین ہے:—

۱- ہو احمد خدا میں دل جو مصروف رقم میرا
الف الحمد کا سا بنگیا گویا قلم میرا

۲- وہ ہوں میں رہ نوردِ شوق میرے ساتھ جاتا ہے
برنگ سایۂ مرغ ہوا نقش قدم میرا

۳- ایک دم بھی ہجر میں جینا تھا ہم کو ناگوار
پر امید وصل میں برسوں گوارا ہوگیا

۴- ہم ہوں اور سایہ ترے کوچہ کی دیواروں کا
کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا

۵- منہ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے
گر حریصوں کو خدا ساری خدائی دیتا

۶- ہنگامہ گرم ہستی ناپائدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

۷- شکر پردے ہی میں اُس بت کو حیا نے رکھا
ورنہ ایمان گیا ہی تھا خدا نے رکھا

۸- نہ پکڑیں دامنِ الیاس گردابِ بلا میں ہم — کہ بدتر ڈوب کر مرنے سے ہے جینا سہارے کا

۹- نہیں گوشِ شنوا باغِ جہاں میں غافل — ورنہ ہر برگ ہے یہاں نغمہ سرائی کرتا

۱۰- کب لباسِ دنیوی میں چھپتے ہیں روشن ضمیر — جامۂ فانوس میں بھی شعلہ عریاں ہی رہا

۱۱- آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز — کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

۱۲- جہاں میں عرصۂ عشرت سے سوا دہ چند ہے غم کا — اگر ہے عید کا اک دن تو عشرہ ہے محرم کا

۱۳- اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر — آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا

۱۴- پروانہ بھی تھا گرمِ تپش پر کھلا نہ راز — بلبل کی تنک حوصلگی تھی کہ غل ہوا

۱۵- یہ حیاتِ چند روزہ جو نہ سدِ راہ ہوتی — تو پھر ایک عرصہ گاہِ عدم و وجود ہوتا

۱۶- ہم رونے پہ آ جائیں تو دریا ہی بہائیں — شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

۱۷- آنا تو خفا آنا جانا تو رلا جانا — آنا ہے تو کیا آنا جانا ہے تو کیا جانا

۱۸- یوں لائے وہاں سے ہم دلِ صد پارہ ڈھونڈ کر — دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اٹھا لیا

۱۹- زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں — کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہہ گیا

۲۰- ہو برسوں ہجر، وصل ہو گر اک دم نصیب — کم ہوگا کوئی مجھ سا محبت میں کم نصیب

۲۱- دل عبادت سے چرانا اور جنت کی طلب — کام چور اس کام پر کس منہ سے اجرت کی طلب

۲۲- رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ — جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح

۲۳- ذبح کرنے کو مرے پوچھتے ہو کیا تکبیر — تم چھری پھیر بھی دو دم خدا اکبر لیکر

۲۴- اہلِ جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک — لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر

۲۵- کیا جانیں ہم زمانہ کو حادث ہے یا قدیم — کچھ ہو بلا سے اپنی کہ ہیں فانیوں میں ہم

۲۶- بے یار روزِ عید شبِ غم سے کم نہیں — جامِ شراب دیدۂ پرنم سے کم نہیں

۲۷- جا ماندگانِ عشق سے پوچھو وہ تھا — اس میں جنابِ خضر ابھی نابلد ہیں

۲۸- اس گلستانِ جہاں میں کیا گلِ عشرت نہیں — سیر کے قابل ہے یہ پر سیر کی فرصت نہیں

۲۹- وقتِ پیری شباب کی باتیں — ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

۳۰- اس کے گھر لیچلا مجھے دیکھو — دلِ خانہ خراب کی باتیں

۳۱- احسان ناخدا کے اٹھائے مری بلا — کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

۳۲- جو لذتِ آشنائے مرگ ہوتا خضر تو ہرگز — نہ پیتا آبِ حیواں ڈوب مرتا آبِ حیواں میں

۳۳- ہوں طائرِ خیال نہ پر ہیں مرے نہ بال
پر اُڑ کے جا پہونچا کہیں سے کہیں ہوں میں

۳۴- رُکاؤ خوب نہیں طبع کی روانی میں
کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

۳۵- کہانیاں ہیں حکایاتِ خضر و آبِ بقا
بقا کا ذکر ہی کیا اس جہانِ فانی میں

۳۶- گُہر کو جوہری صرّاف زر کو دیکھتے ہیں
بشر کے دیکھنے والے بشر کو دیکھتے ہیں

۳۷- جو مانگوں موت دردِ ہجر سے مجھ کو نہیں ملتی
کہ نام عشق لوں اور اعتذارِ رحمت طلب ہو نہیں

۳۸- دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو
آئے ہے جزو میں نظر کل کا تماشا ہم کو

۳۹- کرتے ہوں گو وہ نہیں ہم تو سخن میں سبقت
پر وہ کچھ ہم سے بنے گا جو کہے گا ہم کو

۴۰- موت ہی سے کچھ علاجِ دردِ فرقت ہو تو ہو
غسلِ میت ہی ہمارا غسلِ صحت ہو تو ہو

۴۱- دیکھا [illegible] ماہ کو
عید ہوئی ذوق مگر شام کو

۴۲- لیتے ہیں ثمر شاخِ ثمر دار کو جھکا کر
جھکتے ہیں سخی وقتِ کرم اور زیادہ

۴۳- ممکن نہیں ہے ذوق علائق سے چھوٹنا
جب تک کہ روح کو ہے تعلق بدن کے ساتھ

۴۴- گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

۴۵- ستم کو ہم کرم سمجھے جفا کو ہم وفا سمجھے
جو اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت سے خدا سمجھے

۴۶- ترے کوچے کو وہ بیمارِ غم دار الشفا سمجھے
اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے

۴۷- کل جہاں سے کہ اُٹھا لائے تھے احباب مجھے
لے چلا آج وہیں پھر دلِ بیتاب مجھے

۴۸- لیتے ہی دل جو عاشقِ دل سوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

۴۹- رخصت اے زنداں جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

۵۰- اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

۵۱- کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

۵۲- ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق
اُس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

۵۳- ہمیں غرض کیا کہ جائیں گے ہم حرم کو اے شیخ بتکدے سے
ہمیں بتوں میں خدا کا اپنے ظہورِ قدرت نہ دیکھ لیں گے

۵۴- یہ اقامت ہمیں پیغامِ سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

۵۵- اگر یہ جانتے چُن چُن کے ہم کو توڑیں گے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

۵۶- دروازہ میکدہ کا نہ کر بند محتسب
ظالم خدا سے ڈر کہ درِ توبہ باز ہے

نظام تمدن میں سزا کا تخیل بہت قدیم ہے۔ ہر قوم اور ہر زمانہ کے تمدن میں سزا ایک ضروری عنصر رہی ہے۔ اسلامی زاویۂ نگاہ سے تو تخلیق عالم ہی پاداش عمل پر مبنی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام شجر ممنوعہ کے ثمر سے اپنے کام و دہن کی تواضع کرتے ہیں۔ غضب الٰہی جوش میں آجاتا ہے اور صفی اللہ کو نتائج اعمال بھگتنے کے لیے دنیا میں بھیج دیا جاتا ہے۔ گویا روئے زمین پر انسان کا نزول فلسفۂ سزا کا ممنون ہے۔

اصول سزا قانون قدرت میں بھی جاری اور ساری ہے۔ قدرت خود ایک زبردست منتقم ہے۔ انسان مجرم کو کبھی کبھی معاف بھی کر دیتا ہے لیکن قدرت اپنے گنہگار سے کبھی درگزر نہیں کیا کرتی۔ غلطی کا ارتکاب ایک دفعہ ہو جانے کے بعد اُسکے نتائج و عواقب کا برداشت کرنا لابدی ہو جاتا ہے۔ جلد یا بدیر انسان اپنے کیے کا خمیازہ اُٹھاتا ہے۔ قدرت کا یہ اٹل قانون "جیسی کرنی ویسی بھرنی" کے مقولہ میں مضمر ہے۔ اگر ہم اپنی موجودہ صورتِ حالات کو گردشِ زمانہ اور قسمت کے عالمگیر ہاتھوں سے منسوب کرنے کے عادی نہ ہوں تو ذرا سا غور و فکر یہ بات منکشف کر دیتا ہے کہ ہماری جملہ تکالیف اور مصائب، ہمارے تمام آلام و محن نتیجہ ہوتے ہیں کسی نہ کسی گناہ یا غلطی کا جو ہم سے قانون قدرت کے خلاف سرزد ہوتی ہے اسکو قدرت کی سزا یا انتقام کہیے۔

تمدن کے ابتدائی مدارج میں جب انسان نے ایک دوسرے کے حقوق کو تسلیم کیا اُس وقت یقیناً اسکے ذہن میں وہ قوت Sanction بھی تھی جس کے بل پر اُن حقوق کا تحفظ کیا جا سکتا تھا۔ اس قوت کو بروئے کار لانے کا نام سزا ہے۔ جذبۂ انتقام جو سزا دینے کا دوسرا نام ہے انسان کے اندر فطرتاً ودیعت کیا گیا ہے۔ اس خواہش سے خالی شاید ہی کوئی دماغ ہوتا ہو۔ ممکن ہے بعض افراد میں نسبتاً یہ جذبہ قوی ہو اور بعض میں کمزور، لیکن اسکا وجود ضرور ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس جذبہ کو قطعی طور پر مغلوب کر لے تو میں کہونگا کہ اُسکی ہستی ماورا انسان Super-human ہے۔ بچے سے لیکر بوڑھے تک سب کے اندر یہ جذبہ پایا جاتا ہے۔ اسکا اظہار مختلف افراد اور جماعتیں مختلف انداز سے کرتی ہیں۔ وحشیوں میں یہ طریقہ ظالمانہ ہوتا ہے۔ متمدن سوسائیٹیاں نسبتاً بہتر انداز اختیار کرتی ہیں، لیکن مبرا کوئی بھی نہیں۔

تمدن کا انحصار بڑی حد تک سزا پر ہے - انسانی حقوق کے تحفظ اور نگہداشت کے لیے اسکا
وجود نہایت ضروری ہے - انسان فطرتاً خطا کار واقع ہوا ہے - خطا اس نے حضرت آدم سے
ورثہ میں پائی ہے - گناہ کی کشش، بدی کی ترغیب اس کو جلد اپنی طرف مائل کرلیتی ہے - یہ روز
مرّہ کا مشاہدہ ہے کہ بڑے بڑے پارسا اور متقی حضرات کے پائے ثبات کو موقع ملنے پر لغزش ہو جاتی
ہے - بقول لسان الغیب

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر میکنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر میکنند

اگر سزا کا ڈر، احتساب کا خوف نہ ہو تو خدا معلوم حضرت انسان کیا کر گزریں - باوجود سزا کے خوف
کے انسان دوسروں کی حق تلفی سے باز نہیں آتا - اگر یہ ڈر نہ رہے تو پھر تو یہ حضرت خوب کھل کھیلیں -
اگر سزا کا تخیل ذہن انسانی سے محو کر دیا جائے تو تمام ذمہ داریوں کا خاتمہ ہو جائے - اور ہر شخص
جو جی میں آئے کرنے لگے - ذمہ داری کا تصور بغیر سزا کے بے معنی ہے -

تمدن کی نگہداشت کے ذمہ دار دو ہیں - مذہب اور سماج - حکومت بھی ایک منظم سماج کا
نام ہے - جو اپنے حلقہ اثر میں بقائے امن اور تحفظ حقوق کی ذمہ دار ہے - مذہب نے ہمیشہ
اپنے پیرووں کو عقوبتِ اُخروی کا خوف دلایا - دنیا کی تقریباً تمام شریعتیں سزا کے مفصل نظام کی
حامل ہیں - حکومت بھی اپنی ذمہ داریوں کی تکمیل اور نفاذ کے لیے قانونِ سیاست وضع کرتی رہتی ہے
حکومت جو سزا اپنے مجرموں کو دیتی ہے اُسکے مقاصد چار گونہ ہوتے ہیں - انتباہ، امتناع،
انتقام اور اصلاح - ان مقاصد کے لحاظ سے سزا کی نوعیت میں بھی اختلاف ہوتا ہے - وسیع
معنوں میں سزا کو چار شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے - تنبیہی، امتناعی، انتقامی، اور اصلاحی - یہ تقسیم
باعتبار منطق مکمل نہیں ہے، اکثر شعبے ایک دوسرے پر حاوی ہو جاتے ہیں - پھر بھی اختلاف ظاہر ہے
ذیل میں ہم ایک مشہور مقنن کے خیالات کا عکس ہر ایک کے متعلق پیش کرتے ہیں :-

تنبیہی

سزا کا اہم ترین پہلو ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کی جھلک دوسرے شعبوں
میں بھی نظر آتی ہے - سزا کا غایت المقصود سماج کی اصلاح ہے - آپ مجرم کو سزا
اس لیے دیتے ہیں کہ سوسائٹی کی اصلاح ہو، مجرم کا حال دیکھ کر لوگ عبرت پکڑیں، اور آیندہ
کسی کو ارتکاب جرم کا حوصلہ نہ ہو - انسان جرم اس لیے کرتا ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق سے
اپنی خواہشات کو مقدم پاتا ہے - وہ دوسروں کے علی الرغم اپنے فائدہ کے لیے کوشش کرتا ہے

سیاست کا مقصود اس سود کو زیاں سے بدل دینا ہوتا ہے - تاکہ لوگ آیندہ اس فائدہ کے لالچ
میں پھنس کر گناہ کا ارتکاب نہ کریں - اس قسم کی سزا بالعموم نہایت شدید ہوتی ہے - جس سے دیکھنے
والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور وہ مجرم کا حشر دیکھ کر ڈر جائیں - سزائے تازیانہ اس ذیل
میں آتی ہے -

امتناعی

اس قسم کی سزا کا مقصدِ وحید اعادۂ جرم کا سدِ باب ہوتا ہے - اگرچہ ایک نتیجۂ دوکاج
کے مطابق بڑی حد تک تنبیہی سزا کی غایت بھی اس سے پوری ہو جاتی ہے امتناعی
سزا کے ذریعہ سے مجرم کو اس قابل نہیں چھوڑا جاتا کہ وہ آیندہ ارتکاب جرم کر سکے - اسے اُن
مواقع سے محروم کر دیا جاتا ہے جو ارتکاب جرم میں اسکے ممد ہوتے ہیں - مثلاً اگر کوئی شخص اپنے
عہدہ سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر کسی جُرم کا مرتکب ہوتا ہے تو اُسکو اُس عہدہ سے برطرف کر دیا
جاتا ہے - تعزیراتِ ہند کی سزائے حبس دوام عبور دریائے شور اسی تحت میں آتی ہے - قاتل کو
سزائے موت دینے کا بھی یہی مقصد ہے - اس سے دونوں مقصد پورے ہو جاتے ہیں - مجرم کا حشر
جہاں دیکھنے والوں کے لیے سامانِ عبرت مہیا کرتا ہے وہاں خود اُسکی ہستی کو بھی ناپید کر دیتا ہے -
نہ رہے گا بانس نہ بجیگی بانسری - نہ قاتل زندہ رہیگا نہ اس قسم کے جرائم کا مرتکب ہو سکے گا -
شریعتِ اسلام میں سارق کی دست تراشی کا حکم بھی اسی قبیل سے ہے - مدعا یہ کہ ہاتھ کھو کر چور
چوری کے قابل نہ رہے -

انتقامی

منجملہ دیگر مقاصد کے سزا کا ایک مقصد انتقامی بھی ہے - مظلوم اور اُسکے اعزا کے
جذبۂ انتقام کو تسکین دینے کی غرض سے ظالم کو سزا دی جاتی ہے - شریعتِ موسوی
میں جو ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور آنکھ کے بدلے آنکھ کا اصول منضبط کیا گیا تھا اُسکا مقصد بھی یہی تھا کہ
مظلوم کے لیے سرمایۂ تسلی بہم پہونچایا جائے - اگر ہم کو یا ہمارے کسی عزیز کو کوئی شخص نقصان پہونچاتا
ہے تو بے اختیار ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم ظالم کو کیفرِ کردار کو پہونچائیں - ہماری خواہشِ انتقام
اُس وقت تک سکون پذیر نہیں ہوتی جب تک ہم اپنے ستانے والے کو اس سے زیادہ یا کم از
کم اُتنا ہی نقصان نہ پہونچا لیں جتنا کہ ہم کو پہونچا ہے - مظلوم جب تک کہ اپنی داد کو نہ پہونچ
جائے اُس کا خون کھولتا رہتا ہے - دادرسی اُس کا حق ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اُسکو اس حق
سے محروم کر دیا جائے - یہ جذبہ اگرچہ بظاہر زیادہ محمود نہیں معلوم ہوتا لیکن فی الحقیقت مذموم
بھی نہیں ہے - مجرم کو سزا دلانے کا محرک یہی جذبہ ہوتا ہے -

اصلاحی

اس قسم کی سزا کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مجرم کی سیرت کو تبدیل کر دیا جائے، تاکہ
پھر کبھی اُسکے دل میں جُرم کرنے کی خواہش پیدا نہ ہو - مجرم کی اصلاح کرنا
اس کی غایت ہوتی ہے - اس قسم کے تحت میں صرف سزائے قید آسکتی ہے - کیونکہ دوسری اقسام
کی سزا سے یہ مقصد پورا نہیں ہوسکتا - اصلاحی سزا کے حامی جسمانی سزا کو نفرت و حقارت کی نظر سے
دیکھتے ہیں - جیل خانہ کی زندگی میں مجرم کی ایسی تربیت کی جاسکتی ہے کہ جب وہ اپنی مقررہ
میعاد پوری کرنے کے بعد جیل کی زندگی کو خیرباد کہے تو اس کی سیرت میں ایک انقلاب واقع ہوچکا
ہو اور وہ بجائے جرائم پیشہ ہونے کے ایک عمدہ شہری بن چکا ہو - اس مقصد کے لیے جیل میں مجرموں
کو مختلف اقسام کی دستکاریوں اور صناعیاں سکھائی جاتی ہیں کہ آیندہ زندگی میں ان کے کام
آئیں اور انکے ذریعہ سے وہ لوگ اپنی روزی ایمانداری کے ساتھ پیدا کرسکیں - لیکن اس مقصد
کے حصول میں بہت سی قباحتیں ہیں - اگر یہی نصب العین قائم کرلیا جائے تو عملی حالت میں
اکثر دشواریوں کا سامنا ہوگا - جیل خانہ کی زندگی میں ایسی سہولتیں اور آسائشیں مہیا کرنی پڑینگی
کہ جو مجرموں کو گھر پر بھی میسر نہ آئیں - علاوہ اسکے بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو شروع ہی
سے اس قسم کی اصلاحی کوششوں کے لیے ناموزوں ہوتے ہیں - تعلیم و تربیت کا اُن پر کوئی اثر
نہیں ہوسکتا - اس لیے کہ تربیت محض جوہر قابل کو جلا دے سکتی ہے اور "نااہل" کے لیے
"گردگاں برگنبد" ثابت ہوتی ہے -

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود　　　گرچہ با آدمی بزرگ شود

سوال یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ کیا کیا جائے - اصلاحی سزا ان کے معاملہ میں ناکام رہیگی
ایسی صورتوں میں تنبیہی اور امتناعی سزا کی طرف نظر جاتی ہے - سزا کی یہ ہی اقسام کچھ ایسے
موقعوں پر کام آسکتی ہیں -

حال ہی میں ایک تحریک اور عالم وجود میں آئی ہے - وہ یہ ہے کہ ارتکاب جرم کے
وقت مجرم صحیح طور پر اپنے ہوش میں نہیں ہوتا - اسکی حالت ایک ایسے شخص کی سی ہوتی ہے
جو کسی مرض میں گرفتار ہو - دورہ کے وقت اُس سے عجیب و غریب حرکات ظہور میں آئیں
اور دورہ ختم ہونے کے بعد وہ اُن جملہ حرکات سے بیخبر ہو - اس تحریک کے مؤیدین کا خیال ہے
کہ مجرم کو سزا دینے کے بجائے کسی شفا خانہ میں علاج کے لیے بھیجنا چاہیے - اس میں کوئی شک
نہیں کہ یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے، لیکن اسکے حامی افراط و تفریط میں پھنس گئے ہیں - انکی

رہے ہے کہ جرم کی نوعیت کیسی ہی کیوں نہ ہو، اُسکا سبب ضرور مجرم کا دماغی خلل ہوگا - انکی دلیل
یہ ہے کہ ارتکاب جرم سے جو منافع ہوتا ہے وہ یقیناً اس قدر اہم نہیں ہوتا کہ کوئی ہوشمند شخص اُسکے
لیے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنا پسند کرے - صحیح ہے - لیکن اگر حکومت مجرموں کو سزا دینی ترک
کردے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ صرف دماغی طور پر ناقص اشخاص ہی ارتکاب جرائم کریں گے بلکہ اچھے
اچھے ہوشمند بھی یہ پیشہ اختیار کریں گے - دراصل یہ تحریک ردعمل ہے پرانے مسلک کا - زمانۂ
قدیم میں جرم کے اس پہلو کو قطعی نظرانداز کر دیا گیا تھا - مجرم کی دماغی حالت پر کبھی غور نہیں کیا
جاتا تھا - بلکہ یہ تصور کر لیا گیا تھا کہ مجرم بھی معمولی صحیح الدماغ انسان ہوتا ہے - زمانہ جدید کی یہ
تحریک پورے جوش کے ساتھ اس قدیم خیال کی مخالفت کرتی ہے - بہر حال افراط و تفریط
سے دامن بچانا چاہیے - دونوں باتوں کا امتزاج غالباً بہتر صورت پیدا کر سکتا ہے -

محمد اظہار احسن بی اے ایل ایل بی

وہ ستمگر نہیں وہ بانیٔ بیداد نہیں — ابھی کمسن ہے اُسے رسم جفا یاد نہیں
آہ کرنے کے بھی قابل دلِ برباد نہیں — اب تری بزم میں ہنگامۂ فریاد نہیں
بے زبانی کا گلہ کرتی ہے رو رو کر صبح — شمع تربت کو میسر لب فریاد نہیں
ستم و جور کریں آپ گروعیان رہے — دل ہمارا ہے یہ پتھر نہیں فولاد نہیں
صبح پیری نہ رہا شام جوانی کا خیال — رات کو خواب جو دیکھا تھا ہمیں یاد نہیں
سرگزشت دل ناکام سنو کہتے ہیں — داستاں اور تو کوئی بھی ہمیں یاد نہیں
یا مجھے قتل کرو ہاتھ میں لیکر تلوار — یا یہ کہدو کہ ہیں قاتل نہیں جلاد نہیں
جب مرے حال پہ تھی چشم عنایت اُنکی — اُس زمانہ کی کوئی بات اُنھیں یاد نہیں
ہم اسیرانِ محبت کی رہائی کیسی — یہ وہ ہے قید کہ جس کی کوئی میعاد نہیں
بھولنے والے کا رہتا ہے تصور دل میں — اور کچھ اسکے سوا ہم کو جگر یاد نہیں

حکیم جگر صدیقی

ملاہین کا سفر

(از چیکوف)

ایک مال گاڑی کئی گھنٹوں سے ایک اسٹیشن پر کھڑی ہے - انجن بالکل خاموش ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اب اسے یہاں سے کہیں جانا نہیں ہے - ٹرین کے قریب کوئی آدمی ہے اور نہ اسٹیشن کے احاطہ میں کوئی متنفس -

ریل کے ایک ڈبہ میں سے دھندلی روشنی کی ایک دھاری پلیٹ فارم پر پڑ رہی ہے اور اس ڈبہ میں دو آدمی بیٹھے ہوئے ہیں - ان میں ایک بوڑھا آدمی ہے جو بھیڑ کی کھال کا کوٹ اور بکری کی کھال کی قلندر شاہی ٹوپی پہنے ہوئے ہے - دوسرا ایک نوجوان شخص ہے جسکے ابھی داڑھی نہیں نکلی ہے - یہ پرانا کوٹ، فرسودہ واسکٹ اور کیچڑ میں سنا ہوا اونچا جوتا پہنے ہوئے ہے - گاڑی میں جو مال جا رہا ہے یہ دونوں اسکے مالک ہیں - بوڑھا آدمی نوجوان شخص کے سامنے پیر پھیلائے بیٹھا کچھ سوچ رہا ہے، اور نوجوان سر جھکائے ہوئے بیٹھا ہے - انکے قریب ہی ایک قندیل ٹنگ رہی ہے -

ڈبہ پورا بھرا ہوا ہے - اگر کوئی شخص قندیل کی دھندلی روشنی میں ایک نظر ڈالے تو پہلے پہل اسکو گاڑی میں بڑے بڑے بے ڈول بہت سے زندہ کیڑے سے معلوم ہونگے - بعض وقت وہ اتنے بلند ہو جاتے ہیں کہ چھت سے لگ جاتے ہیں - لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو سینگ اور انکی پرچھائیاں، کھر، دم اور آنکھیں بھی دھندلی روشنی میں نظر آنے لگتی ہیں - یہ مویشی اور ان کی پرچھائیاں ہیں - آٹھ مویشی ایک ڈبہ میں بھرے ہوئے ہیں - بعض وقت وہ مڑ مڑ کر آدمیوں کو دیکھتے اور دم ہلاتے ہیں - بعض کھڑے ہوتے ہیں اور بعض آرام سے بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں - گنجائش کے اعتبار سے ڈبہ میں زیادہ مویشی بھر دیے گئے ہیں - اگر ایک بیٹھ جاتا ہے تو دوسرے کو کھڑا رہنا پڑتا ہے - انکے کھانے پینے کے لیے ڈبہ میں کوئی چیز نہیں رکھی گئی ہے -

بوڑھے آدمی نے جیب میں سے گھڑی نکالکر دیکھا تو سوا دو بجے تھے - [illegible] کھڑے کھڑے دو گھنٹے گزر گئے - نکل کر ذرا گڑبڑ کرنی چاہیے ورنہ صبح سے پہلے [illegible]

وہ جا کر سو گئے یا خدا جانے کیا کرنے لگے۔

بوڑھا آدمی اُٹھ کھڑا ہوا اور احتیاط سے ڈبہ میں سے اُتر کر اندھیرے میں انجن کی طرف چل دیا۔ کوئی دو درجن ڈبوں کے بعد انجن تک پہونچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ دہکتی ہوئی بھٹی کے سامنے ایک شخص بے حس و حرکت بیٹھا ہے۔ اسکی قلندر شاہی ٹوپی، چہرے اور گھٹنوں پر آگ کی سرخ روشنی پڑ رہی ہے۔ جسم کا تمام حصہ سیاہ ہے جو اندھیرے میں آسانی سے شناخت ہو سکتا ہے۔ بوڑھے آدمی نے دریافت کیا۔ گاڑی کب چلیگی یا ابھی یہیں اور ٹھہرنا پڑے گا۔ کوئی جواب نہ ملا۔ اس لیے کہ انجن کے اندر جو شخص آگ کے سامنے بیٹھا ہے، بےخبر سو رہا ہے۔ بوڑھے آدمی نے زور سے کھنکارتے اور سردی سے کپکپاتے ہوئے انجن کے گرد چکر لگایا۔ جب وہ انجن کے سامنے پہونچا تو لمپوں کی تیز روشنی سے اُس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور رات اسے اور بھی تاریک نظر آنے لگی۔ اب وہ اسٹیشن کی طرف چلا۔

پلیٹ فارم اور اسٹیشن کی سیڑھیاں پانی سے تر تھیں۔ برف پڑ رہا ہے اور پگھلتا جاتا ہے۔ اسٹیشن کے اندر روشنی ہے مگر خوب گرم ہو رہا ہے۔ یہاں فرنیچر کی قسم سے کوئی چیز نہیں ہے، فقط سامان تولنے کی مشین اور ایک چھوٹا سا چبوترہ ہے جس پر ایک شخص گارڈ کی وردی پہنے سو رہا ہے۔ بائیں ہاتھ کی طرف دو دروازے ہیں جو بالکل کھلے ہوئے ہیں۔ ایک دروازہ میں سے تار برقی کا آلہ نظر آ رہا ہے اور ایک لیمپ جس کی معتدل روشنی آلہ پر پڑ رہی ہے۔ دوسرے دروازہ میں سے ایک چھوٹا کمرہ دکھائی دے رہا ہے جس کا نصف حصہ سامان کی الماری نے گھیر رکھا ہے۔ اس کمرے کی کھڑکی پر ہیڈ گارڈ اور انجن ڈرائیور بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور ان دونوں میں کسی بات پر کچھ بحث ہو رہی ہے۔

انجن ڈرائیور "اس ٹوپی کا سمور اصلی نہیں ہے نقلی ہے۔ اصلی سمور کہیں ایسا ہوتا ہے۔ خود اندازہ کیجیے۔ اس کی قیمت اور پانچ روپیہ۔ بہت زیادہ ہے"

ہیڈ گارڈ "پانچ روپے آپ کو بہت زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ اچھا ہم اسکی قیمت کسی تاجرے دریافت کرینگے (بوڑھے آدمی کی طرف مخاطب ہو کر) مسٹر ملاہین! ذرا آپ اسے دیکھ کر بتائیے کہ یہ مال اصلی ہے یا نقلی؟"

ملاہین نے ٹوپی لیکر پہلے اُسکے بالوں کو انگلیوں سے مس کیا اور پھر اُسکی مختلف طریقوں سے جانچ کر کے حقارت آمیز تبسم سے کہنے لگا "حضرت یہ تو نقلی ہے اصلی نہیں ہے"

پھر تینوں میں حجت ہوتی رہی۔ گارڈ یہی کہتا رہا کہ یہ اصلی معمولی ٹوپی ہے۔ انجن ڈرائیور اور ملاہین اس کی تردید کرتے رہے۔ دوران بحث میں بوڑھے آدمی کو یکایک یاد آیا کہ میں کس کام کے لیے آیا تھا، اور کس جھگڑے میں پڑگیا۔ فوراً یوں اٹھا "یہ ٹوپی واقعی بہت اچھی ہے۔ لیکن یہ تو بتایئے کہ ریل کب تک یوں ہی کھڑی رہیگی۔ آخر کس کا انتظار ہے۔ اب چلنا چاہیے"۔

گارڈ "اچھا ابھی چلتے ہیں۔ ایک سگرٹ پی لیں پھر [illegible]۔ عجلت کی ضرورت نہیں اگر ہم یہاں سے چل بھی دیے تو آگے جا کر کسی اسٹیشن پر رک جانا پڑیگا۔ پھر ایسی غلطی کیوں کریں یہ سچ ہے کہ ہماری گاڑی بہت لیٹ ہے۔ مگر یہ واقعہ بھی اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ ہمیں آگے کسی اسٹیشن پر روکا نہ جائیگا۔ خواہ ہم یہاں سے ابھی چل کھڑے ہوں یا صبح چلیں۔ ہم اپنی گاڑی کو چودھویں نمبر پر نہیں بیجا سکتے۔ ہر حالت میں یہ گاڑی تیئیسویں نمبر پر جائیگی۔ بتایئے اب کیا کیا جائے۔ اگر یہیں ٹھیرے رہے تو کونسا حرج ہے؟"

یہ سب سن کر ملاہین گارڈ کی طرف دیکھنے لگا۔ اور پیچ و تاب کھاکر اس طرح گویا ہوا کہ گویا وہ کسی سے مخاطب نہیں ہے۔ "خدایا تو ہی انصاف کر۔ چونتیس گھنٹوں سے ہماری گاڑی کو بلا وجہ جگہ جگہ روکا گیا ہے۔ میں نے ایک ایک منٹ کا حساب نوٹ بک میں درج کرلیا ہے۔ اگر یہی رفتار رہی تو بیچارے مویشی رستے ہی میں مرجائیں گے۔ یا اگر ہم وہاں کسی طرح پہونچ بھی گئے تو انکی کوڑی بھی نہ اٹھے گی۔ سفر نہ ہوا مصیبت ہوگئی"۔

گارڈ نے اپنی آنکھوں کو ذرا جھٹکے کے ساتھ اوپر کی طرف حرکت دی۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ یہ کہہ رہا ہے کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں بالکل سچا اور درست ہے۔ انجن ڈرائیور خاموش بیٹھا ہوا اپنی ٹوپی کی طرف نظر جمائے ہوئے تھا۔ ان دونوں کی صورتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ انکے دلوں میں کوئی ایسی بات ہے جسے وہ اپنی زبان سے کہنا نہیں چاہتے۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ اسے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں بلکہ اس لیے کہ اس قسم کے خیالات بہ نسبت الفاظ کے بہتر طریقہ پر ظاہر ہوتے ہیں۔ بوڑھا ملاہین سمجھ گیا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور بغیر کچھ کہے سنے اس اعتماد اور صاف دلی کے ساتھ جس طرح غالباً وہی لوگ رشوت لیا اور دیا کرتے ہیں، گارڈ کو دیدیا۔ اس نے نوٹ لیکر اطمینان سے جیب میں رکھ لیا۔ اسکے بعد تینوں شخص کمرے سے باہر نکلے اور اس طرح [illegible] نظر نہ آئے۔

ہیڈ گارڈ نے اپنے شانوں کو حرکت دیتے ہوئے کہا "کس بلا کی سردی ہے۔ کیسا موسم ہے
کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا"۔

ان میں سے کسی نے کہا "واقعی بڑا خراب موسم ہے"۔
کھڑکی میں سے لیمپ کی مدھم روشنی میں تار برقی کے آلہ کے قریب تار بابو کا سر نظر آرہا ہے
اور اسکے بعد ایک اور شخص کا۔ اسکی داڑھی بڑی لمبی اور گھنی ہے اور وہ سرخ ٹوپی پہنے ہوئے
ہے۔ یہ اسٹیشن ماسٹر ہے۔ اس نے میز کی طرف سر جھکا کر سگریٹ کی روشنی کی مدد سے ایک نیلے کاغذ
کو پڑھا۔ اب ملاہین اپنے ڈبہ میں چلا آتا ہے۔

اسکا نوجوان ساتھی پہلے کی طرح اب بھی سر جھکائے بیٹھا ہے۔ یہ ابھی کمسن ہی ہے۔ مسیں
تک نہیں بھیگی ہیں۔ رنگ سرخ و سفید ہے۔ رخساروں کی ہڈیاں چوڑی ہیں۔ بمقابلہ زیادہ
عمر والے آدمیوں کی آنکھوں کے اسکی آنکھیں اداس معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن جسمانی حیثیت سے
وہ بہت لحیم شحیم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ اٹھ بیٹھ نہ سکے گا۔

اب گھنٹی کی دھیمی آواز آرہی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا بہت دور بج رہی ہے۔
اسکے بعد دوسری گھنٹی زور سے بجتی ہے، پھر تیسری۔ اسکے بعد گارڈ سیٹی بجاتا ہے۔ ایک منٹ
کی خاموشی کے بعد گاڑی کے نیچے کھڑ پڑ کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ گاڑی کو تھوڑی سی جنبش ہوکر
پھر خاموشی ہو جاتی ہے۔ پھر ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ گاڑی تھوڑی سی آگے کو بڑھتی ہے
جھٹکے کی وجہ سے مویشی ایک دوسرے کے اوپر گر پڑتے ہیں۔

بڑھے نے اپنی ٹوپی کو جو جھٹکے کی وجہ سے پیچھے ہٹ گئی تھی، ٹھیک طریقہ سے سر پہ
رکھتے ہوئے کہا "خدا ان کا ستیاناس کرے، میرے جانوروں کا تو اس طرح خاتمہ ہو جائیگا"۔

یاشا فوراً کھڑا ہو جاتا ہے اور گرے ہوئے جانوروں میں سے ایک کے دونوں سینگ
پکڑ کر اسکو کھڑا کرنے کی کوشش کرتا ہے .... گاڑی میں پھر ایک جھٹکا لگا اور
گاڑی کے نیچے کھڑ بڑ کی آواز ہوکر وہ تھوڑی سی پیچھے کو ہٹی۔

بڑھا یہ کہہ ہی رہا تھا، کہ دیکھو ہوشیار رہنا .... گاڑی میں پھر ایک جھٹکا لگا اور
تمام ڈبوں کے آپس میں ٹکرا جانے سے بڑی زور کی آواز پیدا ہوئی اور جانور پھر ایک دوسرے
سے ٹکرانے لگے۔

یاشا کہنے لگا۔ ریل کیا ہے تماشہ ہے۔ غالباً ریل وزنی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہاں سے

چلے ہی گی نہیں - وزنی تو پہلے بھی تھی مگر اب اور زیادہ وزنی ہو گئی ہے - بڈھے نے جواب دیا - نہیں بیٹا معلوم ہوتا ہے کہ گارڈ نے اسے کچھ نہیں دیا - جاؤ اسے بھی کچھ دیدو ۔۔۔ ورنہ یہ کمبخت اسی طرح صبح تک پریشان کرتا رہیگا -

یاشا نے باپ سے تین روبل کا نوٹ لیا اور گاڑی میں سے کود کر روانہ ہو گیا - تھوڑی دیر تک اسکے وزنی قدموں کی آواز آتی رہی پھر رفتہ رفتہ مدھم ہو کر حسب سابق خاموشی چھا گئی ۔۔۔۔۔۔

یاشا واپس آگیا - ڈبہ میں سرد اور تیز ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے - بڈھے نے کہا بیٹا اب دروازہ بند کر دو - سوئیں گے - اور اس قندیل کی لو کو بھی کم کر دو - بہت تیز جل رہی ہے -

یاشا وزنی دروازہ کو بند کر دیتا ہے - انجن نے سیٹی دی اور ریل چلنے لگی - بڈھے نے بستر پر دراز ہوتے اور گٹھری پر سر کو رکھتے ہوئے کہا "بلا کی سردی ہے - یہاں گھر کا سا آرام کہاں - گھر میں ہم چاہتے ہیں کہ بستر صاف، ستھرا اور نرم ہو، لیکن یہاں ہم جانوروں کے مثل پڑے ہوئے ہیں - حد ہو گئی کہ میں نے چار روز سے جوتے تک نہیں اتارے"

یاشا گاڑی کے جھٹکوں سے ڈگمگا رہا ہے - قندیل کا دروازہ کھول کر بتی کے گل کو بھیگی ہوئی انگلیوں سے دور کر کے بتی کو ذرا نیچے دبا دیتا ہے - بتی بھُر بھُر کر کے اس طرح جلتی رہی کہ دھواں نہ نکلے -

پھر وہ باپ کے پاس لیٹ جاتا ہے - جب اسکی پیٹھ باپ کی پشت سے مس ہوتی ہے تو ملاہین کہتا ہے "بیٹا کیسی سردی ہے - ڈبہ کے ہر روزن میں سے کس بلا کی سرد ہوا آ رہی ہے - اگر تمہاری ماں یا بہن کو یہاں ایک رات رہنے کا اتفاق پڑ جائے تو وہ صبح تک زندہ بھی نہ بچیں - بیٹا پڑھنے میں تمہاری طبیعت نہیں لگی - دیکھو تمہارے بھائیوں کو پڑھنے کا کیسا شوق ہے - تمہاری سمجھ پر کیسے پتھر پڑ گئے تھے جو تم نے یہ پیشہ پسند لیا اور تم میرے ساتھ مارے مارے پھرتے ہو - قصور تمہارا ہی ہے اور اسکے ذمہ دار تم ہی ہو - تمہارے بھائی اسوقت گرم بستروں پر سو رہے ہونگے، لیکن تم کیسے بدنصیب ہو کہ جانوروں کے ڈبہ میں پڑے ہوئے ہو"

ٹرین کی کھڑکھڑ اور شور و غل میں بڈھے کی آواز سنائی بھی نہ دیتی تھی لیکن وہ بہت دیر تک اسی طرح بڑبڑاتا، آہیں بھرتا، اور کھکار کھکار کر حلق صاف کرتا رہا ۔۔۔۔۔۔ تازہ گوبر کی بو اور بتی کی چراہند مل جل کر ایسی ناگوار اور تیز ہو گئی کہ سوتے میں یاشا کے گلے اور سینے میں خراش پیدا ہو گئی اور وہ کھانسنے اور چھینکیں لینے لگا - لیکن بڈھا ان باتوں کا عادی تھا - فقط سینہ

پھاڑ پھاڑ کر زور زور سے سانس لیتا اور کھنکار کر خاموش ہو جاتا۔

ریل تیزی سے جا رہی ہے، ڈبے ادھر ادھر ہل رہے ہیں، پہیے کھڑ پڑ کر رہے ہیں، انجن بھک بھک کرتا، دھواں نکالتا، اور ڈبوں کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا تیزی سے جا رہا ہے۔ انجن اور ریل کی آوازیں مل جل کر بہت سی مختلف آوازیں پیدا کر رہی ہیں۔ ریل کی جنبش سے جانور ایک دوسرے سے ٹکراتے اور دیواروں میں سینگ رگڑنے لگتے ہیں۔

جب بڈھا بیدار ہوتا ہے تو ڈبے کے سوراخوں اور چھوٹی کھڑکی میں سے صبح کا آسمان نظر آنے لگتا ہے۔ اس کی پیٹھ اور پاؤں میں ناقابل برداشت سردی محسوس ہو رہی ہے۔ ٹرین خاموش کھڑی ہے۔ یاشا جس کی آنکھوں میں اب تک نیند بھری ہے، مویشیوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہے۔

بڈھا ہنستا ہوا اٹھتا اور زور زور سے کھنکار کر یاشا کی طرف نگاہ جما کر دیکھنے لگتا ہے جو ایک بیل کو پیچھے سہارا دے کر اسے تھوڑا سا اٹھائے اور اس کے پیر کو رسی سے چھڑانے کی کوشش میں مصروف ہے۔

"میں نے رات کو ہی کہا تھا کہ رسیاں پڑی ہیں۔" یاشا نے جواب دیا "نہیں بابا رسیاں پڑی نہیں ہیں۔ آپ کو کچھ محنت تھوڑی کرنی پڑ رہی ہے، دیکھیے ابھی سب ٹھیک ہوا جاتا ہے۔"

یاشا غصہ میں بھرا ہوا تھا۔ دروازے کو زور سے کھول دیتا ہے۔ ڈبہ میں روشنی ہو جاتی ہے۔ مال گاڑی کے قریب ایک سواری گاڑی کھڑی ہے۔ اس کے پیچھے ایک سرخ عمارت نظر آ رہی ہے۔ پلیٹ فارم پر چھت بھی ہے۔ اسٹیشن بڑا ہے۔ یہاں ہوٹل بھی ہے۔ ٹرینوں کی چھتوں، زمین اور قریب قریب ہر کھلی ہوئی جگہ پر برف جما ہوا ہے۔ سواری گاڑی اور مال گاڑی کے درمیان میں جو جگہ خالی ہے اس پر مسافر ادھر ادھر چل پھر رہے ہیں۔ پولیس کا ایک سپاہی ٹہل رہا ہے۔ ہوٹل کا ایک ملازم اونچا کوٹ اور سفید قمیص پہنے، سردی سے اکڑتا ہوا آنکھیں ملتا کشتی میں ایک کیتلی اور دو چائے کی پیالیاں رکھے ہوئے پلیٹ فارم پر بھاگ بھاگ کر قسمت کی گردش پوری کر رہا ہے۔

بڈھا مشرق رو کھڑے ہو کر نماز شروع کر دیتا ہے۔ مویشیوں کی دیکھ بھال سے فارغ ہو کر یاشا باپ کے ساتھ نماز میں شریک ہو جاتا ہے مگر زور زور سے کچھ نہیں پڑھتا۔ صرف اس کے لب متحرک نظر آتے ہیں۔ باپ بلند آواز سے ہر دعا کے ختم ہونے کے بعد کہتا ہے ...... اور اس زندگی میں جو آخرت میں نصیب ہونے والی ہے ..... آمین۔ اس کے بعد ایک لمبی سانس لیتا ہے۔ پھر

دوسری دعا شروع کرکے آخر میں کہتا ہے ...... اور اسکے بچھڑوں کو اپنی قرباں گاہ پر چڑھالے۔
نماز ختم ہونے کے بعد پاشا باپ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے "پانچ پیسے دیجیے"۔ پیسے لیکر کیتلی اُٹھا اسٹیشن کی طرف چائے لینے کے لیے دوڑتا ہے۔ ریل کی سڑکوں، سلیپروں، برف کے تودوں پر سے پھلانگتا اور باسی چائے کو کیتلی میں سے پھینکتا ہوا ہوٹل کے دروازہ پر جاکر پیسوں سے کیتلی کو بجاتا ہے۔ ہوٹل والا سماور کو اپنی طرف کھینچکر کہتا ہے کہ پانچ پیسوں میں اتنی چائے کیسے مل سکتی ہے۔ لیکن پاشا سماور کو اپنی طرف کھینچکر چائے سے اپنی کیتلی بھر لیتا ہے۔ ہوٹل والا پیچھے چیختا چلاتا رہ جاتا ہے۔

چائے کو دیکھ کر ملاہین کے چہرے پر خوشی کی لہریں دوڑنے لگتی ہیں۔ آپ سے آپ کہنے لگتا ہے "ہمیں کھانا پینا خوب آتا ہے مگر کام سے ہم جی چراتے ہیں۔ کل دن بھر ہم کھاتے پیتے رہے مگر خرچ کا اب تک حساب نہیں رکھا۔ ہم لوگوں کا عجب حال ہے۔ خدا رحم کرے" یہ کہکر کل اور پرسوں سے جو کچھ خرچ ہوا تھا اُس کا حساب یاد کرکرکے زور زور سے بولتا جاتا ہے، اور پھٹی پرانی کتاب یادداشت میں لکھتا جاتا ہے کہ اتنا روپیہ گارڈوں کو دیا اتنا انجن ڈرائیور کو اور اتنے پیسے ریلوے کے ملازمین کو۔

سواری گاڑی جا چکی ہے، خالی پٹریوں پر ایک انجن مصروف گلگشت ہے۔ کبھی تھوڑی دُور تک آگے جاتا ہے پھر پیچھے ہٹتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں جانے کا مقصد ہی نہیں ہے۔ سورج بلند ہو گیا ہے اُس کی کرنیں برف پر رقص کر رہی ہیں۔ اسٹیشن اور ریل کے ڈبوں کی چھت پر سے پگھلے ہوئے برف کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔

چائے سے فارغ ہو کر ملاہین آہستہ قدم اسٹیشن تک جاتا ہے۔ اول درجے کے ویٹنگ روم میں اسکا ننھا سا گارڈ اسٹیشن ماسٹر کے پیچھے کھڑا ہے۔ اسٹیشن ماسٹر نوجوان شخص ہے۔ اس کی داڑھی بہت خوبصورت ہے اور وہ اون کا کوٹ پہنے ہوئے ہے۔ غالباً اسکا جانی ہی میں تقرر ہوا ہے۔ یہ گارڈ کے پاس کھڑا ہے۔ دوڑ کے گھوڑے کی مثل کبھی ایک پیر اُٹھاتا ہے کبھی دوسرا۔ ہر شخص کو دیکھتا، اور آنکھیں مٹکا کر سلام کرتا ہے۔ آدمی چست و توانا ہے۔ رخسار سرخ و سپید ہو رہے ہیں۔ چہرے سے ظرافت، خوش طبعی اور سرگرمی عیاں ہے۔ ملاہین کو دیکھتے ہی گارڈ نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا "ہماری گاڑی چودھویں نمبر پر نہیں جا سکتی۔ ہم بہت لیٹ ہو گئے ہیں۔ دوسری گاڑی اسی نمبر سے جا چکی ہے۔"

اسٹیشن ماسٹر جب نیلے کاغذوں کو جلد جلد دیکھ کر ملاہن کی طرف مخاطب ہو کر مسکراتا ہے
اور پھر اس پر سوالات کی بوچھار کر دیتا ہے۔
" کیا آپ ہی مسٹر ملاہن ہیں۔ آٹھ ڈبوں میں آپ ہی کے مویشی جا رہے ہیں۔ آپ کی
گاڑی لیٹ ہو گئی۔ میں نے رات کو ایک گاڑی چودھویں نمبر سے روانہ کر دی۔ بتلائیے
اب کیا کیا جائے "
اب اسٹیشن ماسٹر ملاہن کے کوٹ کو دو انگلیوں سے پکڑ لیتا ہے اور اخلاق کے ساتھ
سمجھا سمجھا کر کہتا ہے کہ دیکھیے فلاں فلاں نمبر کی گاڑیاں جا چکی ہیں اور فلاں فلاں نمبر کی اب
جانے والی ہیں۔ اس پر بھی جو کچھ میرے اختیار میں ہے کرنے کو تیار ہوں۔ اور واقعی اسکی
صورت سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایسا خوش و خرم ہے کہ نہ صرف ملاہن کی مدد کر سکتا ہے بلکہ
تمام دنیا کی مدد کرنے کو تیار ہے۔ ملاہن گاڑیوں کی آمد و رفت کے پیچیدہ نظام کے متعلق اسٹیشن ماسٹر
کی گفتگو کو خاموش کھڑا سنتا رہا اور وقتاً فوقتاً آہستہ سے گردن ہلا کر اسکے خیالات کی تائید کرتا رہا۔ پھر
کچھ سوچ کر جیب میں سے دس روبل کا نوٹ نکالا اور اس میں کچھ اور نوٹوں کا اضافہ کر کے
اسٹیشن ماسٹر کو دیدیا۔ اسٹیشن ماسٹر نے نوٹ لیکر اطمینان سے جیب میں رکھ لیے اور خوش ہو کر
کہنا شروع کیا:-
" دیکھیے! کیا گاڑیوں کی روانگی کا انتظام اس طرح نہیں ہو سکتا؟ ٹرپ ٹرین آج
لیٹ ہے۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ وہ ابھی تک نہیں آئی ہے۔ اگر آپ کی گاڑی ٹرپ ٹرین
کی حیثیت سے روانہ کر دی جائے تو غالباً نامناسب نہ ہوگا۔ ٹرپ ٹرین کو اٹھاویں نمبر سے
روانہ کر دیا جائیگا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"
گارڈ۔ " جس طرح آپ مناسب خیال فرمائیں "۔
اسٹیشن ماسٹر: " بہت درست۔ تو اس صورت میں آپ کو فوراً روانہ ہو جانا چاہیے
ٹھہرنے کی اب کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ میں آپ کی روانگی کا ابھی انتظام کیے دیتا ہوں "
اتنا کہکر ملاہن کو سلام کیا اور کاغذات کو پڑھتا ہوا کمرے کے اندر چلا گیا۔
ملاہن اس گفتگو سے بہت خوش ہوا اور مسکراتے ہوئے اُن چیزوں کو جو ہوٹل میں
رکھی ہوئی تھیں نظر استعجاب سے دیکھنے لگا۔ پھر گارڈ کا بازو پکڑ کر کہا کہ آیئے کچھ کھا پی لیں۔ گارڈ
نے کہا کہ کیوں تکلیف فرماتے ہیں۔ اس پر ملاہن نے بہ اصرار کہا کہ نہیں، آیئے حضرت

میری خاطر سے صرف .... گلاس

دونوں ہوٹل میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ گارڈ ایک گلاس چڑھا کر فرمائش کرتا ہے کہ حضرت فلاں فلاں چیزیں منگائیے، اور وہ اس وقت بہت خوش ہے۔ جسمانی حیثیت سے مضبوط، قوی اور موٹا تازہ آدمی ہے۔ چہرہ بھرا ہوا ہے۔ لیکن اس کی صورت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شراب کثرت سے پیتا ہے۔ اور باقاعدہ طریقے سے سونے کا عادی نہیں ہے۔ ملاہین اصرار کرکے ایک گلاس اور پیش کرتا ہے، اور پھر یکایک کہنے لگتا ہے "ہاں جناب گارڈ صاحب۔ یہ تو فرمائیے کہ اب میں اطمینان رکھوں کہ بقیہ سفر میں اب کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہوگی۔ آپ خود واقف ہیں کہ میرے ساتھ مویشی ہیں اور اس اعتبار سے ہر لمحہ میرے لیے قیمتی ہے۔ آج گوشت کا ایک نرخ ہے تو کل بدل جاتا ہے۔ اگر خدانخواستہ راستے میں دو چار روز کی تعویق ہو گئی تو فائدہ درکنار اصل لاگت بھی نہ آئیگی۔ معاف کیجیے! واقعہ میں نے یوں ہی عرض کر دیا ہے۔ لیجیے۔ تھوڑی اور سہی۔ مجھے آپ پر پورا اعتماد و اعتبار ہے۔ جو چیز آپ کو پسند اور مرغوب ہو حاضر کر دوں۔ میں تو آپ کا خادم ہوں نا"

گارڈ کو خوب کھلا پلا کر ملاہین ڈبہ میں جا کر یاشا سے کہتا ہے: "گاڑی اب بہت جلد روانہ ہونے والی ہے۔ گارڈ نے کہا ہے کہ اگر ہماری گاڑی یہی نمبر سے چلتی رہی تو ہم کل رات کو آٹھ بجے پہونچ جائیں گے۔ بیٹا اس بات کا دھیان رکھو اگر اتنی جد و جہد نہ کی جاتی تو کام بھی نہ چلے"

پہلی گھنٹی کے بعد ایک کالا کلوٹا، موٹا تازہ شخص سیاہ کپڑے اور اسی رنگ کا ڈھیلے پائنچوں کا پاجامہ پہنے ہوئے ڈبے کے دروازہ کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ یہ ریلوے کا ملازم ہے۔ اور ابھی ابھی گاڑیوں کے نیچے پہیوں کو ہتھوڑے سے ٹھونک ٹھونک کر دیکھ رہا تھا۔ ملاہین سے پوچھنے لگا کہ ان ڈبوں میں کیا آپ ہی کے مویشی ہیں؟

ملاہین "ہاں۔ ہاں۔ کیوں!"

ملازم "دو ڈبے قابل مرمت ہیں، انکو ہمیں روک لیا جائیگا"

ملاہین "خوب۔ یک نہ شد دو شد۔ تم مجھ سے کچھ وصول کرنا چاہتے ہو۔ [illegible] ہے تو کہتے کیوں نہیں"

ملازم "اب جو آپ سمجھیں۔ میرا کام آپ کو اطلاع دینا تھا"

لاہین کا سفر

لاہین نے جیب میں ہاتھ ڈالا - بائیس پیسے ہاتھ میں آئے - یہ پیسے چپکے سے سیاہ فام
شخص کے ہاتھ پر رکھ دیئے - اُس نے اطمینان سے لیکر آنکھوں ہی آنکھوں میں لاہین کا
شکریہ ادا کیا اور کہنے لگا " غالباً انھیں فروخت کرنے کے واسطے آپ لیے جا رہے ہیں
بیشک اچھی تجارت ہے "
لاہین نے ایک آہ سرد کھینچی کہا کہ کسی زمانہ میں مویشیوں کی تجارت واقعی
نفع بخش تھی - مگر اب اس میں سوائے گھاٹے کے اور کچھ نہیں - ...... رہا ....
ریل کے ملازم نے بات کاٹ کر کہا " حضرت میرے ساتھ ایک میرا ساتھی بھی ہے "
لاہین نے اس کو بھی کچھ دیکر اپنا پیچھا چھڑایا - اب ٹرین بہت تیزی سے جا رہی ہے
اور اسٹیشنوں پر بہت کم ٹھہرتی ہے - بُڈھا بہت خوش ہے - شراب نے اپنا رنگ جمایا ہے
موسم خوشگوار ہے - ہر چیز اسکو بھلی معلوم ہوتی ہے - جی چاہتا ہے کہ کسی سے بات چیت کرتا
رہے - جہاں گاڑی ٹھہرتی ہے گارڈ اور انجن ڈرائیور کو اپنے ساتھ ہوٹل میں لیجاتا ہے -
ل کر شراب پیتے ہیں اور آپس میں مختلف موضوع پر مزے مزے کی باتیں ہوتی ہیں - لاہین
کہتا ہے کہ آپ لوگ اپنا کام کیجیے ہم اپنا کرتے ہیں - خدا سب کو بخیر و عافیت رکھے - ہر کام
اُسی کی مرضی سے ہوتا ہے انسان کا اس میں کیا دخل ہے -
بعض وقت ریل میں بیٹھے بیٹھے آپ سے آپ باتیں کرتا ہے - کبھی جیبیں ٹٹول کر اپنے
کاغذات کا بنڈل نکال کر بغور پڑھتا ہے اور کبھی ذہن پر زور ڈال کر کسی بات کو یاد کرتا ہے
جب وہ ذہن میں نہیں آتی تو کتاب یادداشت کو دیکھتا ہے - جب حساب کر کر کے روپوں
کو گنتا ہے تو اپنی فضول خرچیوں پر افسوس کرکے آہیں بھرتا اور ہاتھ ملتا ہے - پھر تاجروں کے
خطوط، تاروں، ڈاکخانہ اور تار کی رسیدوں اور کتاب یادداشت کا حوالہ دے کر اپنے
وہ ایک بلند آواز میں گفتگو کرتا رہتا ہے -
جب ان کاغذوں کو پڑھتے پڑھتے اور مویشیوں کی قیمتوں کا حساب لگاتے لگاتے
تھک جاتا ہے تو گاڑی کے ٹھہرنے کے بعد مویشیوں کے ڈبوں کے پاس جاتا اور اُنکی حالت
کو دیکھ دیکھ کر ازحد افسوس ملتا اور کہتا ہے -
" یہ جانور ہیں - بے زبان ہیں - انسانوں کی مثل انھیں بھی کھانے پینے کی خواہش
ہوتی ہے - چار روز سے انھوں نے کچھ کھایا ہے اور نہ پیا ہے - ہائے افسوس ان بیچاروں

کی کیا حالت ہوگئی ہے۔"

پاشا کبھی باپ کے ہمراہ چلا جاتا ہے۔ باپ کے احکام کی تعمیل اس طرح کرتا ہے جیسے سعادتمند بیٹے کیا کرتے ہیں۔ لیکن اسے یہ بات پسند نہیں کہ باپ ہوٹلوں میں جا جا کر اس طرح روپیہ برباد کرے۔ گو وہ باپ سے ڈرتا ہے مگر اس پر تضیع وہ اسراف کے متعلق باپ کو ٹوکتا ہے۔

"اس قدر روپیہ کیوں برباد کرتے ہیں۔ خرچ کرتے وقت معلوم نہیں ہوتا۔ ہاتھ خالی ہونے کے بعد اسکی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔"

لیکن جب وہ باپ کے ساتھ نہیں جاتا تو ڈبہ میں تنہا بیٹھا رہتا ہے۔ طبیعت گھبرا جاتی ہے تو چہل قدمی کرتا ہوا انجن کے پاس کھڑا ہو کر اس کے کل پرزوں اور پہیوں کو بغور دیکھتا رہتا ہے۔ پھر اسٹیشن تک جا کر دیواری اشتہارات پڑھتا ہے اور تھوڑی دیر ایک ہوٹل کے سامنے کھڑا ہو کر کھانے پینے کی چیزوں کو نظر انتخاب سے دیکھتا رہتا ہے۔ اس کی صورت اور حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر بات سے لاپرواہ ہے۔ اسے یہ بھی خبر نہیں کہ وہ اس وقت گھر پر ہے یا اسٹیشن پر کھڑا ہے۔

شام کے وقت ٹرین ایک بڑے اسٹیشن پر ٹھیرتی ہے۔ لمپ ابھی ابھی روشن کیے گئے ہیں۔ پاشا چاے پینے کے لیے اسٹیشن کی طرف دوڑا جا رہا ہے۔ پلیٹ فارم پر خوش لباس عورتیں اور کالج کے طلاب ٹہل رہے ہیں۔ اسٹیشن سے دور کے فاصلہ پر روشن قندیلیں نظر آ رہی ہیں۔ یہی شہر ہے۔ لیکن یہ کونسا شہر ہے۔ پاشا اس بات سے واقف ہونا نہیں چاہتا۔ اسٹیشن کے اطراف جو عمارتیں ہیں انکو دیکھتا جا رہا ہے۔ مگر جب سرد ہوا کا ایک تیز جھونکا اسے محسوس ہوتا ہے تو خیال کرتا ہے کہ یہ شہر بہت ہی خراب ہے۔

باپ بیٹے ڈبہ میں بیٹھے ہوے چاے پی رہے ہیں۔ سخت تاریکی ہے۔ کل کے مثل ڈبہ میں قندیل جل رہی ہے۔ ریل میں خفیف سا جھٹکا محسوس ہوتا ہے اور وہ پیچھے کی طرف تھوڑی دور چل کر ٹھیر جاتی ہے۔ ایک شخص سگنل کو کھینچکر بلند آواز سے کہتا ہے "ریڈی"۔ اسکے بعد ٹرین آگے بڑھتی ہے۔ پھر کوئی دس منٹ کے بعد پیچھے ہٹتی اور ایک مقام پر جا کر ٹھہر جاتی ہے۔

ماہین جب ڈبہ میں سے اترتا ہے تو اپنی گاڑی کو شناخت نہیں کرتا۔ اسکے آٹھ ڈبے کاٹ کر دوسرے ان ڈبوں کے ساتھ جوڑ دیے گئے ہیں جو دوسری پٹڑی پر کھڑے تھے۔

[illegible] فارم پر چلتے ہوئے ادھر ادھر پھر رہے ہیں وہ بالکل اجنبی ہیں اور وہ ملاہن کے سوالات کا
تشفی بخش جواب نہیں دیتے۔ عجلت میں ہیں کہ جہاں تک جلد ممکن ہو اپنے کام سے فارغ
ہو کر گھر کا رستہ لیں۔ بہت دیر کے بعد جواب ملتا ہے "نمبر اٹھارہ"۔

"اور اپ ٹرین کہاں ہے۔ میرے ڈبوں کو ٹرین سے کیوں کاٹ دیا گیا۔؟"

جب اس کا کوئی جواب نہیں ملا تو ملاہن اسٹیشن میں جا کر سب سے پہلے اپنے شناسا
گارڈ کو تلاش کرتا ہے۔ مگر جب اسکا پتہ نہیں چلتا تو وہ اسٹیشن ماسٹر کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا
ہے۔ اسٹیشن ماسٹر کمرے میں کرسی پر بیٹھا ہوا کاغذات کو الٹ پلٹ کر رہا ہے۔ وہ اپنے کام
میں ایسا منہمک ہے کہ ملاہن کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتا۔ اس کا چہرہ بارعب ہے سر
کے بال سیاہ ہیں۔ کان بڑے بڑے اور ناک لمبی پتلی مگر سرے پر طوطے کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی
ہے۔ گال بھرے ہوئے ہیں۔ ملاہن ایک لمبی چوڑی شکایت شروع کر دیتا ہے۔

اسٹیشن ماسٹر آرام کرسی پر دراز ہو کر غصہ کی آواز میں ملاہن سے کہتا ہے "کیوں کیا ہے؟
جواب دو کہ تمہاری گاڑی اٹھارہ نمبر سے کیوں نہ جائے۔ صاف صاف کہو، تمہاری بات
میری سمجھ میں نہیں آتی۔ جلد جواب دو۔ تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ مارا مارا پھرتا
رہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے"۔

پھر وہ ملاہن پر سوالات کی بوچھار کر کے بغیر کسی وجہ اور سبب کے سخت اور درشت
لہجہ اختیار کر لیتا ہے۔ ملاہن خاموش کھڑا ہوا ہے۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ بک نکالنے
ہی کو تھا کہ اسٹیشن ماسٹر طیش میں آ کر کمرے سے باہر چلا جاتا ہے اور بیچارہ ملاہن شانوں
کو حرکت دیتا ہوا دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ کمرے سے باہر آ کر اس فکر میں تھا کہ کسی اور ہی
شخص سے کچھ کہے سنے کہ یکایک اسکی نظر تار گھر پر پڑ گئی۔ کھڑکی کے پاس جا کر تار بابو
سے کہا کہ ہمارا ایک تار بھیج دیجیے۔ قلم ہاتھ میں لیکر کچھ سوچا اور تار کے فارم پر حسب ذیل
عبارت لکھتا ہے:

"نمبر [illegible] ٹریفک منیجر۔ جانوروں کے آٹھ ڈبوں کی روانگی میں ہر اسٹیشن پر
غیر ضروری تعویق کی جا رہی ہے۔ براہ کرم اس جانب توجہ فرمائی جائے۔
جواب کے لیے رقم ادا کر دی گئی ہے۔"

(ملاہن)

تار دینے کے بعد پھر اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں جاتا ہے۔ دیکھا کہ کرسی پر ایک دوسرا شخص

بیٹھا ہوا ہے۔ یہ خاکی کپڑے کا اُور کوٹ پہنے اور چشمہ لگائے ہوئے ہے۔ اسکے قریب ایک شخص کھڑا ہوا ہے جو ریلوے انسپکٹروں کی وردی پہنے اسٹیشن ماسٹر سے فصیح و بلیغ الفاظ میں دوسری ریلوے کمپنیوں کی بے عنوانیوں، چالاکیوں اور فروگذاشتوں کی شکایت کر رہا ہے۔ ملا ہین دل میں بہت خوش ہوا کہ اب اسے تعلیم یافتہ شخص سے گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ یہ خیال کرکے پہلے اُس نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور بہت شان سے آگے بڑھ کر کہنے لگا۔

"جناب من۔ مثال کے طور پر اس واقعہ کو لیجیے کہ میں آٹھ ڈبوں میں مویشی ...... لیجا رہا ہوں۔ دیکھیے کمپنی نے ہر ڈبہ کا وزن دس ٹن قرار دیا ہے۔ حالانکہ آٹھ مویشیوں کا وزن دس ٹن نہیں ہوتا، بلکہ اس سے بھی بہت کم ہے۔ لیکن اس کا مطلق خیال نہیں۔"

اس موقع پر پاشا ٹہلتا ہوا باپ کی تلاش میں کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ باپ کی گفتگو کو سنتا رہا، ارادہ کیا کہ کرسی پر بیٹھ جائے، لیکن کرسی کی نسبت سے اپنے وزن کا اندازہ کرکے بجائے کرسی کے کھڑکی پر بیٹھ جاتا ہے۔

ملا ہین حسب سابق گفتگو میں مصروف ہے۔ "وہ اس بات کا مطلق خیال نہیں کرتے بیلوں کے ڈبہ میں بیٹھ کر جانے کا میرا اور میرے لڑکے کا تیسرے درجہ کا کرایہ بیالیس روبل لیا ہے دیکھیے یہ میرا لڑکا ہے۔ اسکا نام پاشا ہے۔ دو اور لڑکے بھی ہیں جو گھر پر زیر تعلیم ہیں۔ خیر دوسری بحثوں سے قطع نظر میری رائے یہ ہے کہ ریل نے مویشیوں کی تجارت کو غارت کر دیا۔ وہ ہی زمانہ اچھا تھا جب لوگ مویشیوں کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک لیجایا کرتے تھے۔"

ملا ہین ہر فقرہ ختم کرنے کے بعد پاشا کی طرف دیکھتا جاتا تھا اس امید میں کہ وہ اس بات کی ضرور داد دیگا کہ میں تعلیم یافتہ شخص سے کس فصاحت کے ساتھ گفتگو کر رہا ہوں۔

انسپکٹر نے قطع کلام کرکے کہا کہ میری بات کو ہر شخص دلچسپی سے سنتا ہے اس وجہ سے کہ میں کوئی بات ضابطہ اور قانون کے خلاف نہیں کہتا۔

دوسری گھنٹی بجتی ہے۔ اسٹیشن ماسٹر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ انسپکٹر اسکے ہاتھ میں ہاتھ ڈالکر اس سے گفتگو کرتا ہوا پلیٹ فارم تک جاتا ہے۔ تیسری گھنٹی بجتی ہے۔ اسٹیشن ماسٹر پھر اپنے کمرے میں جا بیٹھتا ہے۔

ملا ہین نہایت عاجزی سے دریافت کرتا ہے، "جناب والا میری گاڑی کون سے نمبر پر جائیگی؟" اسٹیشن ماسٹر جو کاغذات کی دیکھ بھال میں منہمک ہے، فوراً پلٹ کر بہت ہی غصہ سے

جواب دیتا ہے "مسٹر لاہین آپ ہی ہیں؟ اور کیا آپ ہی کے مویشی آٹھ ڈبوں میں جا رہے ہیں؟
آپ کو فی ڈبہ ایک روبل ٹکٹ کے لیے چھ روبل اور بیس کوپک فوراً ادا کرنا چاہیے۔ آپ نے
ٹکٹ کی قیمت نہیں دی۔ کل چودہ روبل اور بیس کوپک ہوئے۔"
رقم وصول کرنے کے بعد کچھ لکھتا ہے۔ سیاہی کو ریت سے خشک کر کے کاغذوں کا ایک
بنڈل میز پر سے اٹھا کر کے باہر چلا جاتا ہے۔
رات کے گیارہ بجے ٹریفک منیجر کا تار آتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ اس گاڑی کو پہلے
روانہ کر دیا جائے۔ تار کو پڑھ کر بوڑھا بہت ہی خوش ہوتا ہے۔
آدھی رات کے وقت ٹرین روانہ ہو جاتی ہے۔ رات اندھیری ہے۔ اسٹیشنوں پر
دیر دیر تک ٹھیرتی ہے۔ ایک ڈبہ میں خاموش بیٹھا ہے مگر لاہین کے خیالات میں بڑا تلاطم پایا
جاتا ہے۔ ایک اسٹیشن پر اسے خیال آیا کہ جو واقعات اس سفر میں پیش آئے ہیں ان کی
پولیس کو اطلاع ضرور دینی چاہیے۔ لاہین کی استدعا پر پولیس کا ایک افسر رپٹ لکھنے میں
مصروف ہے۔
"۱۰ نومبر ۱۸۸۱ عیسوی۔ میں ریلوے کا نان کمیشن افسر الیا گارڈ قانون مجریہ ۱۹
مئی ۱۸۷۱ عیسوی کی دفعہ ۱۱ کے تحت حسب ذیل رپورٹ درج کرتا ہوں۔ اتنا لکھ کر
پولیس افسر نے کہا بتائیے اب کیا لکھوں؟
اس کے جواب میں لاہین نے ڈاکخانہ اور تار کی رسیدیں اور اپنا پورا حساب کتاب
اس کے سامنے رکھ دیا۔ خود اسے خبر نہ تھی کہ وہ پولیس افسر سے کس بات کا خواہاں ہے۔ وہ
اسے صرف اپنا قصہ سنانا چاہتا تھا کہ اس سفر میں اسے کیسے کیسے نقصانات برداشت
کرنے پڑے، اور اسٹیشن ماسٹروں سے کس قسم کی گفتگو ہوئی۔ کچھ سوچ کر کہنے لگا، اچھا لکھیے
ب کے اسٹیشن ماسٹر نے ٹرین سے میرے ڈبوں کو اس لیے علیحدہ کرا دیا کہ میں قبول صورت
نہ تھا۔ اب میری استدعا صرف یہی ہے کہ روزنامچہ میں آپ میرا حلیہ لکھ لیں۔ پولیس افسر نے
لاہین کا پورا بیان لکھ کر عبارت کو اس طرح ختم کیا: "مجھ نان کمیشن افسر گارڈ نے مسٹر لاہین کا
حلیہ اس لیے لکھا ہے کہ اس کو پولیس کے بڑے افسر کی خدمت میں پیش کر دیا جائے اور اس کی
ایک نقل لاہین کو بھی دے دی گئی ہے۔"
لاہین نے اسکو لے کر ان کاغذات میں شریک کر لیا جن سے اس کی جیب بھری ہوئی تھی۔

اور بہت خوش خوش ڈبہ میں جا بیٹھا۔ صبح کے وقت جب وہ بیدار ہوا تو وہ بہت ہی غصہ میں
بھرا ہوا تھا، لیکن اس مرتبہ اُس کا غصہ جانوروں پر اُترا ہے "ہائے انکی کیسی حالت
ہوگئی ہے، اب یہ تھوڑی دیر کے مہمان معلوم ہوتے ہیں۔ خدایا رحم کر، مجھسے اب انکی حالت دیکھی
نہیں جاتی"۔ بیلوں کو کئی روز سے پانی نہیں ملا تھا، پیاس سے بیتاب ہوکر نم دیواروں کو چاٹ
رہے تھے۔ جب ملاہین انکے پاس گیا تو انھوں نے اسکے کوٹ کو چاٹنا شروع کردیا۔ خود انکی
حالت سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بھوک اور پیاس سے بیتاب ہو رہے ہیں۔ اور ریل کے
جھٹکوں سے انکی حالت اور بھی خراب ہوگئی تھی۔ "اے کمبخت۔ میرا خیال تھا کہ تمھیں ریل کے
ذریعہ لانے میں آسانی ہوگی۔ یہ تو بڑی مصیبت ہوئی۔ بہتر تھا کہ تمھارا خاتمہ ہوجاتا"۔ دوپہر کے
وقت ٹرین ایک بڑے اسٹیشن پر ٹھیرتی ہے جہاں قاعدہ کی رو سے جانوروں کو پانی پلانے کا
انتظام کیا جاتا ہے، لیکن جانوروں نے پانی نہیں پیا۔

دو دن اور دو رات کا مزید سفر طے کرنے کے بعد ریل منزل مقصود پر پہنچتی ہے۔ ٹرین کو
اُس مقام پر کھڑا کر دیا گیا جہاں مال اُتارا جاتا ہے۔ ریل میں سے اُترنے کے بعد بیل ڈگمگاتے اور
لڑکھڑاتے ہوئے چل رہے ہیں۔ جب ڈسٹری انسپکٹر نے جانوروں کا معائنہ کر لیا تو پاشا اور ملاہین
شہر کے اُس حصہ میں جہاں مویشیوں کا بازار لگتا ہے ایک سستے اور کثیف ہوٹل میں ٹھیر جاتے ہیں۔
یہاں کھانا اچھا نہیں ملتا اور ایسا شوروغل ہے کہ کان پڑی آواز بھی نہیں سنائی دیتی۔ ملاہین صبح سے شام
تک خریداروں کی تلاش میں سرگرداں پھرتا ہے اور پاشا ہوٹل کے کمرے میں تنہا بیٹھا رہتا ہے۔ جب اسکی
طبیعت گھبراتی ہے تو شہر کی غلیظ گلیوں میں کبھی کبھی سرگشت کے لیے چلا جاتا ہے۔ وہ دکانوں کے سائن
بورڈوں اور مکانوں کی دیواروں کو دیکھتا ہوا پھر ہوٹل واپس آجاتا ہے۔ غرض اسے یہاں کوئی دلچسپی
کا سامان نہیں ملتا۔ آخر کار ایک تاجر نے مویشیوں کو خرید لیا۔ ملاہین ہانکنے والوں کو کرایہ پر لاتا ہے۔
جانوروں کو دس دس کی ٹولیوں میں تقسیم کر دیا گیا اور اب انکو ہانک کر شہر کے دوسرے حصہ میں لیجایا جا رہا
ہے۔ مویشی بھوک اور پیاس سے مرے جارہے ہیں، شہر کے شوروغل میں گردن جھکائے چلے جا رہے ہیں اور
اپنی باقیماندہ زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ گردن اُٹھا اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھ رہے ہیں۔ ہانکنے والے سردی میں
ٹھٹھرتے ہوئے جانوروں کے پیچھے پیچھے اپنے فرائض سے بےخبر چلے جارہے ہیں۔ جب انکو اپنا فرض منصبی یاد آجاتا
ہے تو ذرا سنبھل کر جانور کے پوری قوت سے ڈنڈا رسید کرتے ہیں کہ بیچارہ تلملا کر دس پانچ قدم آگے بھاگ کر

پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے کہ اسے اتنے آدمیوں کے مجمع میں کیوں مارا گیا۔

اس کام سے فارغ ہونے اور فرمائشی چیزیں خریدنے کے بعد پاشا اور ملاحین گھر واپس جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ خریداروں سے گرما گرم بحث کرنے کے سلسلہ میں ملاحین پر تکان غالب ہو چکی ہے۔ ریل کی روانگی سے کوئی تین گھنٹے پہلے پاشا کو ساتھ لیکر ہوٹل میں جاتا ہے۔ اسکی عادت میں داخل ہے کہ تنہا کبھی نہیں کھاتا پیتا۔ ملازم سے کہا کہ مالک ہوٹل سے جا کر کہدو کہ آپ کی بھی دعوت ہے۔ مالک ہوٹل جو بہت ہی موٹا تازہ، ٹھگنا سا شخص ہے آکر ملاحین کے قریب کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ ملاحین نے ہنسکر کہا "حضرت۔ میں نے مویشی کو فروخت تو کر دیا مگر ایکی بڑا گھاٹا رہا۔ جب ہم گھر سے روانہ ہوئے تو گوشت کا بھاؤ تین روبل نوے کوپک تھا، لیکن جب یہاں پہنچے تو تین روبل پچیس کوپک رہ گیا۔ کہتے ہیں کہ ہم بہت دیر میں پہنچے۔ ہمیں یہاں تین روز قبل آنا چاہیے تھا۔ اب گوشت کی وہ مانگ نہیں رہی جو تین روز قبل تھی۔ ایک دوسرا تاجر اس معاملہ میں بازی لیگیا۔ اُفوہ! جانے بھی دو! ایسا تو ہوا ہی کرتا ہے۔ مگر دیکھیے فی راس گویا ۱۲ روبل کا نقصان ہوا۔ ذرا سوچیے کہ انکے لانے میں کیا صرفہ ہوا ہوگا۔ چودہ روبل گاڑی کا کرایہ ہوا، اور یہ سمجھ لیجیے کہ فی راس چھ چھ روبل اور خرچ ہوئے جس میں ریلوے ملازمین کے چائے پانی کا خرچ بھی شامل ہے۔"

مالک ہوٹل چائے پیتا جاتا ہے اور اخلاقاً ان میں ہاں ملاتا جاتا ہے۔ ملاحین اپنے نقصانات کا تذکرہ کر رہا ہے۔ کبھی افسوس کرتا ہے اور کبھی آہیں بھرتا ہے اور کبھی اپنی قسمت پر مذاقیہ جملے کستا جاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اسکے وہ حرکات و سکنات سے یہ بھی ظاہر کرتا جا رہا ہے کہ اُس پر اس نقصان کا زیادہ اثر نہیں ہوا ہے!

ایک گھنٹے کی گپ شپ کے بعد ملاحین اور پاشا اپنے سامان کو لیکر گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں۔ انکو رخصت کرنے کے لیے گاڑی تک ہوٹل کا مالک اور اُسکے ملازمین وغیرہ آتے ہیں۔ ملاحین کی طبیعت اس وقت بہت متاثر ہو رہی ہے۔ جیب میں سے پیسے نکال کر ان لوگوں کی طرف پھینکتا ہے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہتا ہے "آپ لوگوں پر سلامتی ہو۔ اور خدا آپ سب کو بخیریت رکھے۔ پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔ شکریہ۔ شکریہ۔ خدا حافظ۔" "گاڑی ہانک دو۔" گاڑی والا گھوڑے کے ایک ہنٹر رسید کرتا ہے۔ گاڑی روانہ ہو جاتی ہے۔ مگر گاڑی والا پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا اور بڑبڑاتا جاتا ہے کہ ذہن بہت ہے۔

محمد نجم الغنی قریشی

اسلامی کتبخانے

(عہد عباسیہ میں)

از

ڈاکٹر اولگا پنٹو

مترجمہ

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی

اسلامی کتبخانوں پر اُردو میں سب سے پہلے علامہ شبلی مرحوم و مغفور نے ایک مضمون تحریر فرمایا تھا جو اُنکے رسائل میں شامل ہے ؛ اگرچہ یہ مضمون اپنے موضوع کے لحاظ سے نہایت محققانہ ہے مگر تفصیل اور تکمیل کا محتاج ہے - ہمارا ارادہ ایک مدت سے اس موضوع پر ایک رسالہ لکھنے کا تھا جسکے لیے ہم نے متعدد قدیم و جدید کتابوں کا مطالعہ کرکے کافی مواد جمع کر لیا تھا - اسی اثناء میں اسی موضوع پر ایک مفصل مضمون حیدرآباد کے سہ ماہی انگریزی رسالہ (اسلامک کلچر (بابت اپریل ۱۹۲۹ء) میں نظر سے گزرا - ہمارے خیال میں اسلامی کتبخانوں پر یہ پہلا مضمون ہے جو تحقیق اور جامعیت سے لکھا گیا ہے - اور اس لیے ہم نے اسکو اُردو میں منتقل کرنا مناسب سمجھا - آیندہ ایک مستقل رسالہ میں اس موضوع کے تمام متعلقات مفصلاً معرض تحریر میں لائے جائیں گے - ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا -

یہ مضمون اصل اطالوی زبان میں ایک اطالوی خاتون مس اولگا پنٹو کی تحقیق کا نتیجہ ہے - خاتون موصوفہ روما کے مشہور مستشرق پروفیسر لیوی ڈیلا ویڈا LEVI Della Vida کی شاگرد ہے اور اس نے علوم عربیہ کی تحصیل کے ساتھ ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری (سند) حاصل کی ہے - مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر کرینکو

تھے، جو حال ہی میں مسلم یونیورسٹی (علیگڈھ) کی عربی پروفیسری کے لیے منتخب ہوئے ہیں،
صاحبۂ مضمون کی اجازت سے اس کو انگریزی کا جامہ پہنایا ہے۔
چونکہ اصل ماخذ ہمارے پیش نظر تھے، اس لیے حتی الامکان خاص خاص الفاظ
کی رعایت کے ساتھ کہیں کہیں حسب ضرورت اصل عبارتیں بھی نقل کردی گئی ہیں، کہیں
کوئی حاشیہ اپنی طرف سے لکھا ہے تو آخر میں نام کی تصریح کردی ہے، انگریزی مترجم کے
ذیلی حواشی بھی نقل کیے گئے ہیں جن کے آخر میں حرف "ک" کی علامت دیدی ہے۔

اختر

بادی النظر میں یہ امر نہایت تعجب خیز معلوم ہوتا ہے کہ عربوں جیسی ایک بادیہ نشین، جاہل
اور غیر متمدن قوم، جو ایک ایسے وسیع خطۂ ملک پر حکمرانی کرنے لگی جو کبھی دو بڑی سلطنتوں
رومی (بزنطینی) اور ایرانی (ساسانی) کے زیر حکومت رہ چکا تھا، مختصر عرصہ میں اپنے اصلی
موثرات کو ختم کرکے اپنے تمدن پر ایک عاقلانہ، روایاتی اور زبردست "کتابی تہذیب"
کی خصوصیات کا نقش جمادے۔ اس غیر معمولی انقلاب کی وجہ یہ ہوئی، کہ اہل عرب نے،
خصوصاً اپنے زمانۂ فتوحات کے وقت، اپنے غیر مکمل تمدنی ارتقاء کے باعث فی الفور ان تین
قوموں: یونانی، ایرانی اور یہودی کے تمدنوں کے عناصر ترکیبی کو اپنے اندر جذب کرلیا،
جن کو انھوں نے اخلاقی اور سیاسی حیثیت سے فتح کرلیا تھا۔ یہ تینوں قومیں اپنے مادی
ارتقاء کے باعث اس قدر منتہائے عروج اور اوجِ کمال پر پہونچ گئی تھیں کہ عربی۔ اسلامی
تمدن بھی اپنی مجموعی ترکیب میں ازمنہ وسطے (MedAEvalism) کی تمام خصوصیات
کا حامل نظر آتا ہے۔

مسلمانوں (عربوں) کے لیے اس بڑی کتاب "قرآن مجید" سے لیکر ہر کتاب ایک کائنات
اپنے اندر رکھتی ہے، اور تمام اقوام قدیمہ سے بڑھ کر بھی اس کی اندرونی زندگی کے لیے ایک

لہ مستشرقین یورپ کے نزدیک "اسلامی تمدن" اگلے تمدنوں کے اثرات کا نتیجہ ہے اور بس۔ یہ نظریہ
اس لیے قائم کیا جاتا ہے کہ قرآنی تعلیم اور اُسکے اثرات کا کہیں اقرار نہ کرنا پڑے۔ دیکھیے آگے چل کر وہ
کس خوبصورتی سے ان اقوام مشرکہ کے تمدنوں کا وارث مسلمانوں کو بتاتی ہے، سچ ہے:
جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے!
اختر

ادبی سرچشمہ تھا۔ جس وقت یہ قوم تاریخ عالم کے پردہ پر نمودار ہوئی اس وقت پہلی صدی ہجری میں انکے خلیفہ حضرت عمر بن الخطابؓ کے علم سے ایک وحشیانہ فعل یعنی اسکندریہ کے قدیم ترین کتبخانہ کو جلا دینے کا اتہام اس پر عائد کیا گیا۔ مگر یہ اتہام جو عرصہ ہوا ایک من گھڑت افسانہ ثابت کیا جا چکا ہے وہ اس جذبہ کے بالکل مخالف ہے جو عربوں سے بوقت فتوحات ظاہر ہوا اور جو زبردستی تبدیل مذہب یا تخریب و تدمیر کا جذبہ نہ تھا بلکہ اعلیٰ ترین تمدنوں (جن سے انکو سابقہ پڑا) کی تنظیم و تکریم کا تھا، جنکے روحانی ورثہ کے ایک بہت بڑے حصہ کو انھوں نے استعمال کیا۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں کتبخانوں کا تو کیا بلکہ عربی کتابوں کا ذکر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن تقریباً ایک صدی کے بعد دارالحکومت بغداد میں سب سے پہلے ہم ایک کتبخانۂ عامہ کا قیام دیکھتے ہیں۔

اہل عرب کتابوں کا ذکر نہایت محبت اور ادب سے کرتے ہیں گویا وہ انکے نہایت عزیز اور وفادار دوست ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے:

نِعمَ الانیسُ اذا خلوتَ کتابُ	جبکہ تم تنہائی میں ہوتے ہو تو کتاب تمہارا بہترین مونس ہے
تلهو بہ ان خانکَ الاحبابُ	اگر دوستوں نے تم سے ملنا جلنا ترک کر دیا ہے تو اس سے تمہیں تسلی ملے گی
لا مُفشیاً سرًّا اذا استودعتہُ	اگر کوئی راز کی بات اسکے سپرد کرو گے تو وہ کسی سے ظاہر نہ کرے گی
و تفادُ منہ حکمةٌ و صوابُ [1]	اور اس سے تمہیں عقلمندی اور راستی حاصل ہوگی۔

ایک اور شخص کہتا ہے:

انّ الکتابَ ہو الجلیسُ الذی لا یُنافقُ و لا یَمَلُّ ولا یعاتبک اذ جفوتہ و لا یفشی سرک [2]	کتاب ایک ایسا جلیس ہے جو کبھی ساتھ نہیں چھوڑ سکتا اور اگر تم اس سے ساتھ سختی کا برتاؤ کرو تو وہ خفا اور ناراض نہیں ہوتا۔ نہ وہ تمہارا راز فاش کرتا ہے۔

عہد عباسیہ کا مشہور شاعر متنبی کہتا ہے:

اعز مکان فی الدنیا سرج سابح	و خیر جلیس فی الزمان کتاب [3]
دنیا میں معزز جگہ گھوڑے کا "زین" ہے	اور ہمیشہ بہترین ہمدم "کتاب" ہے

[1] عقد الفرید لابن عبد ربہ جلد اول صفحہ ۱۹۹ (طبع بولاق ۱۲۹۳ھ) [2] کتاب الفخری لابن الطقطقی صفحہ ۳ (مطبوعہ یورپ) [3] دیوان المتنبی (طبع دیتریسی برلن ۱۸۶۱ء) (صفحہ ۶۸۳)

کبھی تو وہ اسلحہ کے برابر سمجھی گئی ہیں۔ چنانچہ ثعلبی اپنے بیٹے سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

یا بُنی اذا وقفتم فی الاسواق فلا تقفوا الا علی من تبیع السلاح او یبیع الکتب[۱]

اے بیٹے! جب تم بازار میں کہیں ٹھہرو تو صرف اُنھیں دکانوں پر ٹھہرو جہاں اسلحہ اور کتابیں فروخت ہوتی ہوں

ان کے ہاں کتابوں سے متعلق ہر چیز کو حیرت انگیز ترقی ہوتی رہی۔ چنانچہ کتابوں کی نقلیں کی جاتی تھیں، اور انکی اعلیٰ درجہ کی جلد بندی کیجاتی تھی۔ ساتھ ہی نہایت احتیاط کے ساتھ انکی حفاظت کی جاتی تھی اور یہ کتابیں دوسروں کو بھی دی جاتی تھیں۔ اسلامی تہذیب کا گویا یہ ایک خاص مقصد اور اہم مشغلہ تھا۔ اسکے ساتھ ہی ساتھ خطاطی کا فن بھی معرض وجود میں آیا جس نے بنو مقلہ اور ابن البواب جیسے بہترین آرٹسٹ (ماہرینِ فن) پیدا کیے۔ ان خطاطوں میں مشہور علماء اور مصنفین بھی تھے۔ مثلاً جوہری مصنف صحاح، مشہور محدث ابن جوزی، اور مشہور مفتی عبدالمومن اصفہانی۔ ان مشہور خطاطوں نے نہ صرف کتابیں ہی نقل کرنے پر اکتفا کیا بلکہ اس طرح تصویر کشی کا فن بھی پیدا کیا۔ ابتدا میں یہ فن صرف نباتات اور پھولوں کی تصاویر تک محدود رہا، مگر تھوڑے ہی عرصہ میں جاندار چیزوں کی تصاویر بھی شروع ہوگئیں۔ یہ صناع اس فن میں بھی مہارت اور کمال دکھانے لگے۔

کتابوں کی جلد بندی کا فن بھی نظرانداز نہیں کیا گیا۔ چنانچہ عربی تاریخوں میں قیمتی چمڑے کی بندھی ہوئی[۲]، مختلف الالوان، مطلا و مذہب کتابوں کا اکثر ذکر آتا ہے[۳]۔

فن کاغذ سازی کے رواج سے کتابوں کی ترقی میں اضافہ ہوا کیونکہ کم قیمت ہونے کی وجہ سے ان کو عوام کی دسترس کے قابل بنا دیا[۴]۔ چوتھی صدی (دسویں مسیحی) میں کتابیں قافیر Papyrus اور رق (Parchment) پر لکھی جاتی تھیں، جسکی وجہ سے

---

۱ الفخری صفحہ ۳۔

۲ صلۃ تاریخ طبری لعریب القرطبی صفحہ ۹۰ (لیڈن ۱۸۹۷ء)

۳ ابن خلکان (بولاق ۱۲۷۵ ہجری) جلد اول صفحہ ۲۷، طبع یورپ نمبر ۶۵۹۔

۴ قدیم ترین عربی کتاب جو کاغذ پر لکھی ہوئی ہے وہ ابو عبید کی کتاب غریب الحدیث ہے جسکا قلمی نسخہ لیڈن کے کتبخانہ میں ہے اور ۲۴۳ھ کا لکھا ہوا ہے۔ (ک)

۵ مقریزی (بولاق ۱۲۷۰ھ) جلد اول صفحہ ۴۰۸

کتابوں کی قیمت بہت گراں ہوتی تھی۔ کاغذ سازی کا فن اسلامی دنیا میں براہ سمرقند چین سے
آیا تھا، جس کو فوری ترقی ہوئی اور وسیع مملکتِ اسلام میں کاغذ کے کارخانے بہت بڑے
پیمانے پر قائم ہوگئے تھے۔ سب سے پہلے مصر میں بَردِی[۵] Flax کی بہت وسیع
کاشت کی گئی جس کی وجہ سے وہاں اکثر کارخانے کاغذ سازی کے قائم ہوگئے۔ یہاں
عربوں نے ریشم کے بجائے چیتھڑوں سے کاغذ بنانا شروع کیا۔ پانچویں صدی ہجری
(گیارہویں مسیحی) سے تمام یورپ میں اسلامی دنیا سے کاغذ جاتا تھا۔ یعنی مشرق میں بغداد اور
قاہرہ کے کارخانوں سے اور مغرب میں اس صنعت کے مرکز شہر شاطبہ سے، جسے آج کل
xativa کہتے ہیں۔

کاغذ کے رواج، قیمتوں کی ارزانی، اور تجارت کتب کی کثرت کی وجہ سے ہر اسلامی
شہر میں کتابوں کی منڈیاں قائم ہوگئی تھیں۔ جو نہایت اہم سمجھی جاتی تھیں۔ کیونکہ وہ طلبہ اور
اہل علم کا مرکزِ اجتماع تھیں۔ جہاں وہ کتابوں کی تلاش و جستجو اور اُن کی قیمتوں پر بحث
کیا کرتے تھے۔

تیسری صدی ہجری میں بغداد میں ایک سو کتب فروشوں کی دُکانیں تھیں۔ یہ دُکانیں
چھوٹی چھوٹی، ایک دوسری سے متصل اور عموماً کسی مسجد کے قرب و جوار میں واقع ہوتی تھیں
لکڑی کی چوکیوں پر فروخت کے لیے رکھی ہوئی کتابوں کی پشت پر ایک چِٹ لگا دی جاتی تھی
تاکہ خریدار یا کتب فروش کو کتاب کا نام معلوم کرنے میں آسانی ہو۔ یہ چِٹیں یا تو خود کتب
فروش یا اُنکے مددگار کارکن کتابوں پر لگا دیتے تھے۔ یہ کتابیں خانگی طور پر یا نیلام سے
فروخت کی جاتی تھیں کہ یہی طریقہ تمام اسلامی دنیا میں کتب فروشی کا رائج تھا۔ بعض اوقات
ان دُکانوں کے مالک مشہور نامور اور فضلاء ہوا کرتے تھے۔ شاعر الخطیری[۶] (م ۵۶۹ھ / ۱۱۷۲ء)
اپنے پیشے کی وجہ سے دلال الکتب کے نام سے مشہور تھا، یعنی کتابوں کا ایجنٹ۔ ابھی کا

[۵] یہ آبی نباتات کی قسم سے ایک پودا ہوتا ہے۔ اسی کو اہل عرب قافر بھی کہتے ہیں۔ یہ مصر قدیم میں
وادی نیل اور مصر سفلے میں بکثرت پیدا ہوتی تھی۔ آج کل نواحی فلسطین میں ہوتی ہے۔ اس کی ڈالیوں کو
ایک ہاتھ کے برابر لمبی ہوتی تھیں، چھلکا اُتار کر خوب کوٹتے تھے اور اس کو پتلا کرکے ایک اور تہہ چڑھا کر کاغذ
کی طرح بنا لیتے تھے۔ اسی کو قرطاس مصری یا پاپیروس کہتے ہیں۔ اختر

[۶] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۲۸۶ (طبع یورپ نمبر ۲۵۸)

شاگرد رشید ابو حاتم سہل بن محمد السجستانی[1] اور مشہور مورخ و جغرافی یاقوت[2] (م ۶۲۶ھ / ۱۲۲۹ء) کتب فروش تھے۔

کتابوں کی قیمت اگرچہ کاغذ سازی کے رواج اور اسکے استعمال سے بہت ارزاں ہو چلی تھی تاہم وہ ہمیشہ بہت گراں تھی۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے، جو خود اپنا ذاتی کتبخانہ قائم نہ کر سکتے تھے، عام کتبخانوں کی کس قدر ضرورت تھی۔

پانچویں صدی (گیارہویں) میں جمہرۂ ابن دُرید کا ایک نسخہ ساٹھ دینار پر بکا[3]۔ (ایک دینار دس شلنگ کے برابر ہے۔ تقریباً سات روپئے) طبری کی ضخیم تاریخ کا نسخہ سو دینار پر فروخت ہوا۔ اموی شاعر جریر کا دیوان دس دینار پر بکا[4]۔ ۲۴۸ھ / ۸۶۲ء میں خلیل ابن احمد کی کتاب العین کا ایک نسخہ پچاس دینار پر خریدا گیا[5]۔ اسکندر افردوسی کی کتاب الاکبر کی شرح کے عربی ترجمہ کا ایک نسخہ سو دینار پر بکا[6]۔ اور خلیفہ الحکم والی قرطبہ نے اشعار و روایات عرب کے ادبی مجموعہ کتاب الاغانی کے مصنف کو اس کتاب کی تصنیف پر ایک ہزار دینار عطا کیے[7]۔ ساتویں صدی ہجری (تیرہویں عیسوی) میں کتابوں کی قیمت میں تخفیف ہو چلی تھی۔ یاقوت حموی مرو کے کتبخانہ الضمیریہ سے کتابیں مستعار لینے کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہے:

لا یفارق منزلی منها مائتا مجلد و اکثره — میرا مکان (فرودگاہ) دو سو کتابوں سے کبھی خالی نہ رہتا تھا اور ان میں

بغیر رهن تکون قیمتها مائتی دینار[8] — ۲۰۰ دینار کی قیمت تک کی اکثر کتابیں بغیر رہن کے ہوتی تھیں (یعنی اُنکے لیے کوئی رقم امانتاً نہیں رکھنی پڑتی تھی)۔

---

[1] ابن خلکان جلد اول ص ۳۰۸ (طبع یورپ ص ۲۸۱)
[2] جلد دوم ص ۳۰۲ (〃 〃 ص ...)
[3] یعنی تقریباً ۳۰ پونڈ۔ ابن خلکان جلد اول صفحہ ۴۷۹ (طبع یورپ نمبر ۹۴۹) [4] مقریزی جلد اول صفحہ ۴۰۸ [5] ابن خلکان۔ جلد دوم۔ صفحہ ۵۲۲ (نمبر ۴۵۴) [6] کتاب الفہرست صفحہ ۴۲ [7] تاریخ ابن خلدون، جلد چہارم (طبع فلوجل) [8] عیون الانباء لابن ابی اصیبعہ جلد اول صفحہ ۶۹۔۷۰ [9] صفحہ ۱۴۶ (بولاق ۱۲۸۴ھ)؛ نفح الطیب للمقری جلد اول صفحہ ۱۸۰ (قاہرہ ۱۳۰۲ھ) (یہ کتاب کی قیمت نہیں کہی جا سکتی، کیونکہ الحکم نے صاحب اغانی کو یہ رقم بطور شاہی انعام کے بھیجی تھی۔ ک) [10] معجم البلدان یاقوت جلد ۴ صفحہ ۵۰۹۔۵۱۰ (طبع وسٹنفیلڈ) (یاقوت کے الفاظ صریح نہیں ہیں۔ تاہم یہ سمجھنا مناسب اور معقول ہوگا کہ ان سب مستعار کتابوں کی قیمت دو سو دینار تھی۔ یعنی دس شلنگ فی کتاب۔ اس زمانہ میں کتابیں بہت ارزاں ہونگی۔ لیکن یہ کتابوں کے حجم پر منحصر ہے۔ ک) ہمارے خیال میں مولف اور مترجم دونوں یاقوت کا مطلب نہیں سمجھے۔ یعنی ان کتابوں میں سے اکثر ۲۰۰ روپے تک کی کتابیں وہ بغیر رہن کے لے آتا تھا۔ — اختر۔

اس حساب سے فی کتاب ایک دینار لاگت آتی ہے۔

کتابوں کی گراں قیمت کے باوجود اسلامی دنیا میں کئی کتابوں کے متوالے ایسے تھے جنھوں نے کتب خانے جاری کر رکھے تھے۔ ان میں سے تیسری صدی میں مشہور مصنف جاحظ فتح ابن خاقان، خلیفہ المتوکل کا ندیم اور قاضی اسمٰعیل بن اسحاق تھے۔

جاحظ (المتوفی ۲۵۵ھ / ۸۶۹ء) علاوہ اُن کتابوں کو پڑھنے اور مطالعہ کرنے کے جنکو وہ خرید سکتا تھا، وہ کتب فروشوں اور دلالوں سے روپیہ امانت رکھ کر کتابیں لاتا تھا اور انکو اول سے آخر تک بالاستیعاب مطالعہ کرتا تھا۔ آخرکار بطور ایک سچے "عاشق کتب" کے انھیں کتابوں کی وجہ سے موت کا شکار ہوا۔ اس کی عادت یہ تھی کہ وہ اپنے گرد ضروری کتابیں دیوار کی طرح چن دیا کرتا تھا۔ چنانچہ آخر عمر میں جبکہ فالج نے اسکے آدھے جسم کو بیکار کر دیا تھا، وہ مطالعہ میں مشغول تھا کہ یکایک وہ کتابیں اُس پر گر پڑیں۔ اور اس طرح وہ غریب انکے نیچے دب کر جاں بحق تسلیم ہو گیا!

ایک اور صاحب اسمٰعیل بن اسحاق (المتوفی ۲۸۲ھ / ۸۹۶ء) تھے جو اپنا تمام وقت کتابوں ہی کے پیچھے صرف کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ انکے ایک معاصر کا بیان ہے کہ جب کبھی اُن سے ملنے گئے تو کوئی نہ کوئی کتاب اُنکے ہاتھ میں ہوتی تھی۔[1]

فتح ابن خاقان کے پاس، غالباً بغداد میں، ایک عظیم الشان کتب خانہ تھا، جسکو علی بن یحییٰ المنجم (م ۲۷۵ھ / ۸۸۸ء) نے ترتیب دیا تھا۔ کثرت تعداد اور خوبصورتی کے لحاظ سے یہ کتب خانہ بہت ہی عجیب و غریب تھا۔ یہ بصرہ اور کوفہ کے اعرابیوں اور وہاں کے اہل علم و فن کے لیے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ فتح ابن خاقان ہمیشہ ایک نہ ایک کتاب اپنے ساتھ لیا کرتا تھا جسکو یا تو وہ اپنی آستین میں یا چمڑے کے موزوں میں رکھ لیا کرتا تھا۔ اور جب کبھی موقع ملتا، وہ اُسکے مطالعہ میں مصروف ہو جاتا۔ جب کبھی اسکو خلیفہ سے علیحدہ ہونے کا موقع ملتا، خواہ بیت الخلاء میں ہی کیوں نہ ہو، تو وہ کتاب نکال کر اُسکا مطالعہ کرنے لگتا۔[2]

آستین میں کتاب رکھنے کی عادت ایک اور "کتاب زدہ" ابو داؤد مشہور صاحب سنن کو بھی۔ چنانچہ ضخیم کتاب کو آستین میں رکھنے کے لیے اُنھوں نے لمبی چوڑی آستین بنوا رکھی

---

[1] کتاب الفہرست۔ صفحہ ۱۱۶-۱۱۷۔

[2] ارشاد الاریب لیاقوت جلد ۶ صفحہ ۷۹-۸۰۔

تھی۔[1] اسی طرح علی بن یحییٰ المنجم المذکور نے نواحی بغداد میں قفص کے نزدیک موضع کرکر میں اپنے عظیم الشان قلعہ میں ایک عظیم الشان کتبخانہ خزانۃ الحکمۃ کے نام سے قائم کیا تھا۔ یاقوت کا بیان ہے کہ تمام ممالک سے لوگ مختلف علوم کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے لیے یہاں آتے تھے۔ یہاں تمام کتابیں طالبعلموں کی خواہش کے مطابق دیکھنے کو ملتی تھیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ علی بن یحییٰ کے خرچ سے انکی مہمان نوازی بھی کیجاتی تھی۔ یہ کتبخانہ تمام بلادِ اسلامیہ میں مشہور تھا اور تمام شائقین علم و متلاشیان کتب کے لیے اس میں اس قدر کشش تھی کہ منجم ابو معشر (م ۲۷۲ھ) خراسان سے مکہ جاتے ہوئے اس کتبخانہ کی زیارت کا تہیہ کرلیا۔ چنانچہ وہاں پہنچ کر اسے اس قدر دلچسپی ہوئی کہ وہ مکہ جانا بھول گیا![2]

پانچویں صدی کے مورخ غرس النعمۃ نے (جو صابیوں کے مشہور اہل علم خاندان سے تھا) بغداد میں ایک مختصر کتبخانہ ۴۰۰ کتابوں کا قائم کیا تھا، جس میں صرف محدود طلباء کو داخلہ کی اجازت تھی۔ بعد کو جب مدرسہ نظامیہ کا زبردست کتبخانہ قائم ہوا، اور لوگ اس چھوٹے سے کتبخانے کو چھوڑ کر وہاں جانے لگے تو غرس النعمۃ نے اپنا کتبخانہ فروخت کر دیا۔[3]

مصر کے خانگی کتبخانوں کی نسبت ہماری اطلاع بہت محدود ہے۔ اس ملک میں بڑے مرکزی شہر صرف چند ہی تھے۔ چنانچہ قاہرہ کے کتبخانہ کے ہوتے ہوئے، جو دنیا کا سب سے زبردست کتبخانۂ عام تھا، لوگوں کو اپنے پاس کتابیں رکھنے اور جمع کرنے کی ضرورت نہیں پیش آتی تھی۔

مصر کے فاطمی خلیفہ العزیز باللہ (حکومت ۳۶۵ھ/۹۷۵ء تا ۳۸۶ھ/۹۹۶ء) کا کتبخانہ بالکل خانگی طرز کا تھا۔ جس کی ترتیب و تنظیم اس کے وزیر یعقوب ابن کلس نے کی تھی، جو خود بھی کتابوں کا بہت بڑا شائق تھا۔ خود اس کے ترکہ میں علاوہ اور خزانوں کے ایک قیمتی کتبخانہ بھی تھا۔[4] خلیفہ کا کتبخانہ جسکا مہتمم ابو الحسن علی بن محمد الشابشتی تھا،[5] تعدادِ کتب کے لحاظ سے بہت وسیع تھا۔

---

[1] النجوم الزاہرہ (طبع یورپ) ج ۲ صفحہ ۷۹۔ [2] ارشاد الاریب جلد ۵ صفحہ ۴۶۷ [3] الوافی بالوفیات الصفدی (مخطوطہ متحف بریطانی ۵۳۲۰ ورق ۱۱۰ (صفدی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کتبخانے کے مہتمم کی خیانت بھی اس کے تنزل کی ذمہ دار ہے۔ دیکھو ہمارا مضمون خاندان "صابی" پر، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں۔ [illegible]

[4] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۴۹۵؛ مقریزی جلد ۲ صفحہ ۶ [5] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۴۸۱ (طبع ۱۲۵۶ قسطنطنیہ)

جس میں چالیس کمروں میں مختلف علوم و فنون کی کتابیں رکھی تھیں۔ قرآن مجید کے ۲۴۰۰ نسخے تھے جو مشہور خطاطوں مثل ابن البواب اور ابن مقلہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مذہب و مطلا تھے۔ علاوہ ازیں مشہور مصنفین کی کتابیں تھیں جن میں سے اکثر خود اُن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں۔[1] بعد کو خلیفہ کے جانشین الحاکم بامر اللہ کے زمانہ میں یہ کتبخانہ دار العلم یا بیت الحکمۃ کے کتبخانے میں جو دنیا کے عظیم ترین کتبخانوں میں سے ایک تھا، منتقل ہو گیا۔[2]

صلاح الدین کی فتح مصر ($\frac{۵۶۷ھ}{۱۱۷۱ء}$) کے وقت میں اُس کے وزیر القاضی الفاضل نے اُن کتابوں سے، جو اُسے بادشاہ نے عنایت کی تھیں، ایک کتبخانہ قائم کیا تھا، جو ۶۸ ہزار کتابوں پر مشتمل تھا۔ مگر چند ماہ بعد چوری کتابیں منضبط ہو کر اصل مالک کے پاس واپس آگئیں جن کی تعداد گھٹ کر صرف ۲ ہزار رہ گئی تھی۔[3]

خاندان ایوبیہ کے وزیر ابو الحسن علی القفطی نے، جو قاضی اکرم کے نام سے بھی مشہور رہیں، حلب میں ایک نفیس کتبخانہ قائم کیا تھا جس کی کتابوں کی قیمت پچاس ہزار دینار تھی۔ اور جو انھوں نے الناصر والی حلب کے نام پر وصیت چھوڑی تھیں۔[4]

سلطنت اسلامیہ کے مغربی صوبجات میں ہر جگہ ذاتی اور خانگی کتبخانے قائم تھے، جن میں سے بعض میں پردیسی طلبہ کو داخلہ کی اجازت تھی۔

ایرانی خاندانوں کے سلاطین، جنھوں نے چوتھی (دسویں) صدی ہجری میں خلفاء کی حکومت پر قبضہ کر لیا تھا، اُنکے دربار علم و فن کا ملجا و ماویٰ بن گئے تھے۔ علاوہ اس کتبخانہ کے جو عضد الدولہ (حکومت $\frac{۳۳۸ھ}{۹۴۹ء}$ - $\frac{۳۷۲ھ}{۹۸۲ء}$) نے قائم کیا تھا، اور امراء و روساء کے چھوٹے چھوٹے کتبخانے، مثل مجد الدولہ، معز الدولہ[6] اور اس خاندان کے بعض وزراء،

---

[1] مقریزی جلد اول صفحہ ۴۰۸

[2] مقریزی جلد اول صفحہ ۴۰۹ -

[3] کتاب السلوک مخطوطۂ پیرس ورق ۷۶ -

[4] الوافی للصفدی مخطوطہ متحف بریطانی ورق ۲۳۲ - ۲۳۳

[5] الکامل ابن اثیر طبع یورپ جلد ۲ صفحہ ۷۰ -

[6] ابن اثیر - جلد ۹ صفحہ ۳۴۱ -

مثل ابوالفضل ابن العمید، صاحب ابن عباد، وغیرہ نے قائم کیے تھے۔ آخر الذکر (۳۸۵ھ/۹۹۵ء) نے سامانی خاندان کے ایک فرماں روا کے عہدۂ وزارت کو قبول کرنے سے اس لیے انکار کر دیا کہ اس کا کتبخانہ ساتھ لے جانے میں اسے بڑی دقت ہوگی، جس میں صرف دینیات کی کتابیں چار سو اونٹوں کا بوجھ ہیں۔[1]

ابن العمید کی نسبت اسکے کتبخانے کا مہتمم مشہور مورخ ابن مسکویہ اپنی تاریخ میں تفصیل سے بیان کرتا ہے، کہ "اس وزیر کے مکان کو خراسان کے ڈاکوؤں نے اس قدر لوٹا تھا کہ پانی پینے کا ایک پیالہ اور بیٹھنے کو چٹائی تک باقی نہ رہنے دی۔ لیکن اُسے اسکی کچھ پروا نہ تھی۔ اُس کا دل تو اپنے کتبخانہ میں لگا ہوا تھا، کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ اس کا کیا حشر ہوا، جس سے بڑھکر دنیا کی کوئی شے اُسے عزیز نہ تھی"۔ ابن مسکویہ لکھتا ہے کہ "ہر علم و فن اور فلسفہ و ادب کے ہر شعبے میں اسکے پاس سَو اونٹوں کا بوجھ کتابیں تھیں۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کتبخانہ کی نسبت دریافت کیا، میں نے عرض کی، کتابیں سب کی سب بچ گئی ہیں اور ایک بھی گم نہیں ہوئی۔ اس پر اُس نے کہا: واقعی تم بڑے نیک شگون ہو! ہمیں ہر چیز مل سکتی ہے، مگر یہ کتابیں کہاں سے ملتیں؟ میں نے دیکھا کہ اُسکے چہرے پر بشاشت نمودار ہوگئی"۔[2]

سامانی خاندان کے فرماں روا، جو تیسری (نویں ع) صدی ہجری میں اسلامی سلطنت کے مشرقی حصہ پر حکمراں تھے، اُنھوں نے بھی اپنے درباروں میں تہذیب و تمدن کی نشوونما میں بہت بڑا حصہ لیا۔ سلطان نوح بن نصر (حکومت ۳۶۶ھ/۹۷۶ء - ۳۸۷ھ/۹۹۷ء) کا ایک شاہی کتبخانہ تھا۔ ابن سینا نے، جسے اس کو دیکھنے اور پھر اس کا مہتمم بننے کا موقع ملا تھا، اس کی بہت تعریف کی ہے۔[3] اسکی طرف یہ غلط بات منسوب کیجاتی ہے کہ اس نے کتبخانہ میں آگ لگا دی۔[4]

عام کتبخانوں کی قلت کے باوجود اندلس میں خانگی اور ذاتی کتبخانے بیشمار تھے۔ جن کو نہ صرف امراء اور اہل دول نے بصرف زرِ کثیر جمع کیا تھا، بلکہ ان میں وہ غریب شائقین علم و فن بھی تھے جنھوں نے اپنی قلیل آمدنیوں کو کتابوں کی نذر کر دیا تھا۔[5] اس قسم کے کتبخانے ابتدریج جمع ہوئے تھے، جیسا کہ وہاں کے ایک مدرّس محمد بن حزم نے قرطبہ میں رفتہ رفتہ

---

[1] ارشاد الاریب لیاقوت جلد دوم صفحہ ۳۱۵ [2] تجارب الامم لابن مسکویہ طبع عکسی جلد ۶ ورق ۲۸۶۔

[3] تاریخ ادب العرب از نکلسن صفحہ ۲۶۵-۲۶۶۔ [4] کشف الظنون جلد ۳ صفحہ ۹۹ طبع فلوجل جرمنی۔

ایک ایسا نفیس کتبخانہ قائم کر لیا تھا کہ کئی اہل علم اس پر رشک کرتے تھے اور اسکی قلمی کتابوں
مطالعہ کرتے تھے جن کو اُس نے نہایت احتیاط کے ساتھ نقل کر کے بڑی حفاظت اور اہتمام
رکھا تھا[1]۔ اندلس میں "محبوبانِ کتب" کے سب سے بڑے "شیدائی" قرطبہ کے قاضی فطیس بن [illegible]
المعروف بہ **ابو مطرف** تھے۔ انکے پاس ایک بیش قیمت کتبخانہ تھا، جس میں چھ کاتب ہمہ [illegible]
کام کرتے تھے۔ اور کسی کو اس نایاب ذخیرہ کی قیمت کا حال معلوم نہ تھا۔ مگر جب قاضی مد [illegible]
کا خاندان گردش روزگار کا شکار ہوا تو یہ کتابیں نیلام سے فروخت ہوئیں۔ چنانچہ انکی قیمت
کے عوض چالیس ہزار دینار وصول ہوئے[2]۔

کتابوں کی محبت ان متعدد امراء اور ملوک الطوائف میں بھی متوارث ہو چلی تھی جنھوں [illegible]
۴۲۳ھ میں خلیفہ ہشام کی وفات پر اندلس کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ چنانچہ **المظفر** ابن الافطس
والی **بطلیوس**، سرقسطہ کے فرماں روا، **بنی ہود**، **غرناطہ** کا خاندان **بنی احمر**، **طلیطلہ**
کے **بنو ذوالنون** کے کتبخانے مشہور رہیں، جنھوں نے اپنے ذخیرۂ کتب میں اضافہ کرنے کی
غرض سے **الماروشی** اور کئی اور لوگوں کے کتبخانوں کو لوٹ لینے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا
تونس کے حصید فرماں رواؤں نے بھی تمام اسلامی سلطنت کی تمدنی تحریک
کا ساتھ دیا۔ چنانچہ اس خاندان کے مورث اعلیٰ ابو زکریا (حکومت ۶۲۵ھ/۱۲۲۸ء - ۶۴۷ھ/۱۲۴۹ء)
نے ایک کتبخانہ جمع کیا تھا[5] جو بہت بعد کو اسکے ایک جانشین ابو یحییٰ زکریا اللحیانی (حکومت
۷۱۱ھ/۱۳۱۲ء - ۷۱۷ھ/۱۳۱۹ء) نے جبکہ وہ حکومت سے دستبردار ہو کر قاہرہ (مصر) چلا گیا تھا، فروخت
کر ڈالا[6]۔

بلاد اسلامیہ میں ایسے بلند رتبہ امراء بھی تھے جو انتہائی تکلفات سے آراستہ کتبخانے
قائم کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ جن میں الماریاں نہایت نفیس، اور طلاکار مجلد کتابوں سے
بھری ہوئی ہوتی تھیں، مگر وہ کبھی سوائے گرد صاف کرنے کے نکالی نہ جاتی تھیں۔ اسکی مثال

---

[1] تکملۂ ابن الابار، کتاب الصلۃ، تذکرہ نمبر ۲۱۲ [2] کتاب الصلۃ لابن بشکوال صفحہ ۳۰۴-۳۰۵
[3] تکملۂ ابن ابار جلد اول صفحہ ۱۲۸ [4] "شائقین کتب" از ریبیرا (اسپینی) صفحہ ۴۲-۴۵ [5] تاریخ
ابن خلدون جلد اول صفحہ ۵۰۳ (فرنچ ترجمہ جلد ۲ صفحہ ۳۳۶) [6] مقدمہ ابن خلدون صفحہ
۱۰۴ طبع پیرس۔

وہ واقعہ ہے جو ایک اندلسی عالم اور محب کتب الحضرمی کو قرطبہ میں پیش آیا تھا۔ انھیں کسی خاص کتاب کی بڑی تلاش و جستجو تھی، اور آخرکار وہ انھیں کسی نیلام میں مل گئی۔ مگر اتفاق سے وہاں اس کتاب کا ایک اور خریدار پیدا ہوگیا، جس نے ان سے زیادہ قیمت لگائی اور آخر بڑھتے بڑھتے قیمت کتاب کی حیثیت سے اس حد تک بڑھ گئی کہ الحضرمی نے اسکو لینے کا خیال ترک کر دیا۔ مگر انھوں نے یہ جاننا چاہا کہ یہ شخص کون ہے جو میری طرح کتابوں کا اس قدر شایق ہے اور پھر متمول آدمی معلوم ہوتا ہے۔ انھیں یہ معلوم کرکے سخت تعجب ہوا اور غصہ آیا کہ اس خریدار کو اس کتاب کی نسبت کسی طرح کا علم نہ تھا۔ وہ تو اس کی خوبصورت جلد اور حجم کو دیکھ کر محض اس لیے گرویدہ ہوا کہ یہ کتاب اسکے کتبخانہ کی الماری میں جگہ حاصل کر لیگی۔[1]

کسی قوم کے تمدن کے آثار اسکے خانگی نہیں بلکہ عام کتبخانے ہیں۔ چنانچہ اسلامی عہد سلطنت میں ان کتبخانوں کو بڑی ترقی ہوئی۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ وسیع اسلامی سلطنت کے ان اضلاع میں جو یورپ سے قریب تھے (اور جو اسوقت ازمنہ مظلمہ کی تاریکی میں گم تھے) گو کئی بیش بہا پرائیوٹ کتبخانے موجود تھے، مگر ایک بھی عام کتبخانہ (پبلک لائبریری) نہیں تھا۔ مثلاً اندلس کہ جہاں ایک بھی ایسے کتبخانہ کا وجود نہیں تھا جو عوام کے لیے کھلا ہوا ہو۔ برخلاف اسکے مشرق کے بڑے مرکزوں بغداد، قاہرہ، شیراز، وغیرہ میں صدہا کتبخانے موجود تھے۔

عام طور پر اسلامی فرمانروا اور حکام تحصیل علوم و فنون کو کسی خاص فرقہ یا جماعت کے ساتھ مخصوص نہ جانکر ہر طرح سے کتابوں اور انکے مطالعہ کی ضرورت اور اہمیت کو بخوبی سمجھتے تھے۔ بلکہ انکے خیال میں علوم و فنون کی تحصیل ہر نیک خیال انسان کے لیے ضروری تھی خواہ وہ غریب ہو یا امیر، مفلس ہو یا تونگر، آزاد ہو یا غلام۔ ابتدا میں انکے کتبخانوں میں صرف ان لوگوں کو داخل ہونے کی اجازت دی جاتی تھی جن کو کتب بینی کی خاص ضرورت ہو۔ لیکن بعد کو انھوں نے صحیح معنوں میں عام کتبخانے قائم کر دیے۔

حکومت کا سب سے پہلا مرکز جہاں بلا شبہ سب سے پہلا کتبخانہ قائم ہوا، وہ بغداد ہے جہاں تیسری صدی ہجری (نویں ع) میں خلیفہ مامون الرشید (حکومت ۱۹۸ھ / ۸۱۳ء - ۲۱۸ھ / ۸۳۳ء) کے حکم سے سب سے پہلا کتبخانہ قائم کیا گیا، جو دار العلم یا بیت الحکمۃ سے متعلق تھا

[1] نفح الطیب للمقری۔ جلد اول صفحہ ۳۰۲ طبع لیڈن۔ جلد اول صفحہ ۲۱۵ طبع قاہرہ۔

اس کے بعد پایہ تخت خلافت میں دیگر مرکزی شہروں میں اس قسم کے کتب خانے قائم ہونے لگے۔ جنھوں نے شہرت عام حاصل کی، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ فرانس کے بادشاہ لوئی یازدہم کو، جبکہ وہ مشرقی ممالک میں تھا، پیرس میں ان کتبخانوں کی تقلید کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ اس قسم کا جو ذخیرہ کتب اس نے جمع کرایا تھا، وہ آگے چل کر ایک پبلک کتبخانہ بن گیا۔[1]

بغداد، شام، اور عراق کے مرکزی شہروں کے بعد مصر نے، جو ایک بہت بڑا مرکز تھا، ان کا اتباع کیا، پھر مشرقی صوبجات نے جو اگرچہ مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگئے تھے، تاہم وہاں عربی تہذیب کا ایک گہرا اثر موجود تھا۔ اور آخر میں عربی دنیا کی اس آخری شاخ اندلس نے انکی تقلید کی جہاں عربوں کے اور مفتوحہ ممالک کی طرح ان کی تہذیب نے بتدریج ایک حیرت انگیز ترقی حاصل کی، جو بہ نسبت دوسرے ممالک کے بہت بڑھ چڑھ کر تھی۔

کچھ اس وجہ سے کہ آخری دور عباسی کے متعلق ہماری معلومات کے ماخذ بہت کم اور منتشر ہیں، اور زیادہ تر عربی تمدن کے تنزل اور اقوام جدیدہ مثل اہل عجم، ترکوں اور مغلوں کے عروج کی وجہ سے اگرچہ میں نے اپنی تحقیقات کو صرف اسلامی سلطنت کے زوال اور عہد عباسیہ کے اختتام تک محدود رکھنا مناسب سمجھا ہے، تاہم عہد حاضر کے کتبخانوں کی حالت اور ان کے ارتقاء پر بھی میں ایک مختصر تبصرہ کروں گی، تاکہ قدیم کتبخانوں کے ساتھ انکا موازنہ ہوسکے، اور انکی نئی حیثیات اور مشرقیات کے مطالعہ کے لیے ان کی اہمیت دکھاؤں گی۔

جیسا کہ میں خانگی کتبخانوں کی نسبت اوپر بتا چکی ہوں کہ ان میں سے اکثر کتبخانوں (مثل علی بن یحیی اور غرس النعمۃ وغیرہ کے) میں طالب علوم کو داخلہ کی اجازت تھی، مگر ان کی عمومی حیثیت تو ان تین قسم کے بڑے کتبخانوں کی وجہ سے ظہور میں آئی، جو رفتہ رفتہ ترقی کرتی رہی۔

(۱) سلاطین کے کتبخانے جنھوں نے اپنے کافی وسائل کے ذریعہ کتابوں کے بڑے ذخیرے جمع کیے اور انکو عوام کی دسترس کے قابل بنایا۔

(۲) مسجدوں کے کتب خانے،

---

[1] Lalanne. Curiosities. P. 160, 161 (Paris 1851)

چنانچہ یورپ میں سب سے پہلے مقامات ہیں جہاں کتابوں سے شغف اور ان کی حفاظت کے شوق کا پتہ چلتا ہے، یا پھر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کتبخانے تھے۔ اس زمانہ میں مشرق میں بہت کتب کے ذریعہ خانگی کتبخانے عام ہو چلے تھے، جبکہ مغرب میں صرف پندرہویں صدی میں اسکا پتہ ملتا ہے۔

اسلامی کتبخانوں نے نہایت سرعت کے ساتھ بہت بڑی ترقی کی۔ ان کو بحیثیت اعلیٰ علامت تمدن کے نہ صرف خلفائے بنی عباس کی طرف سے (جو مشرق و مغرب کی زبردست حکومتوں پر قابل تفوق واقتدار سلطنت کے فرماں روا تھے) زبردست امداد و اعانت حاصل ہوئی تھی، بلکہ اُن متعدد امراء کی طرف سے بھی بہت بڑی امداد ملی جو ہجرت کی ابتدائی صدیوں سے بغداد کے ساتھ اپنا رسوخ قائم کرنے کے خواہشمند تھے۔ ابتداء میں یہ امراء گورنروں کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور بعد کو اسلامی سلطنت کے مختلف صوبجات پر قابض اور خود مختار ہو گئے۔ عربی تمدن میں بھی ہم یہی طریق عمل پاتے ہیں جو ہمیں اطالوی نشاۃ الثانیہ میں نظر آتا ہے اگرچہ ایک وسیع سلطنت کا چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہو جانا یقیناً اس سلطنت کو کمزور کر دینے کے برابر ہے، تاہم ان امراء کی باہمی مسلسل منافست اور مسابقت علمی زندگی کے لیے زبردست محرک ثابت ہوئی۔ چنانچہ حلب کا خاندان بنو حمدان اس کی بین مثال ہے۔ خصوصاً سیف الدولہ ($\frac{۳۳۳ھ}{۹۴۴ء}$ - $\frac{۳۵۶ھ}{۹۶۷ء}$) جسکے عہد میں حلب تہذیب و تمدن کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا۔ یا طرابلس بہ زیر حکومت بنو عمار۔ ایران کے دور دراز صوبجات کا بھی یہی حال تھا جو سامانی، بویہی، اور غزنوی حکومت کے ماتحت تھے۔ نیز اندلس بہ زیر حکومت بنو ذوالنون طلیطلہ میں، بنو افطس بطلیوس میں، اور بنو ہود سرقسطہ میں۔ قلقشندی ($\frac{۸۲۱ھ}{۱۴۱۸ء}$) اپنی ضخیم کتاب صبح الاعشیٰ فی صناعۃ الانشاء میں، جو سلاطین مملوک کے حکام کی تعلیم کی ایک دائرۃ المعارف ہے، اُن زبردست کتبخانوں کا فخریہ طور پر ذکر کرتا ہے جو پہلے قائم ہوئے تھے۔ وہ لکھتا ہے :-

"قد كان للخلفاء في القديم مزيد اهتمام بالكتب حتى حصلوا منها على العدد الجم وحصلوا منها الخزائن الجليلة، والخزائن في الاسلام ثلاث احدها خزانة العباسيين ببغداد وكان فيها من	اگلے زمانہ میں خلفاء اسلام کو کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ انھوں نے کتابوں کی بیشتر تعداد جمع کرلی اور عظیم الشان کتبخانے قائم کیے۔ اسلام میں کتبخانے تین ہیں (۱) بغداد میں خلفاء عباسیہ کا کتب خانہ

الكتب ما لا يحصى كثرة ولا يقوم عليه نفاسة ولم
تزل على ذلك الى ان دهمت التتار بغداد
فذهبت الكتب فيما ذهب وذهبت معالمها
ومحيت آثارها ۔ والثانية خزانة الفاطميين
بمصر وكانت من اعظم الخزائن واكثرها جمعا
للكتب النفيسة من جميع العلوم ولم تزل على
ذلك الى ان انقرضت دولتهم بموت العاضد
آخر خلفائهم واستيلاء السلطان الصلاح الدين
على المملكة بعدهم * * * * * *
والثالثة خزانة خلفاء بني امية بالاندلس وكانت
من اجل خزائن الكتب ايضا ولم تزل على
ذلك الى انقراض دولتهم باستيلاء ملوك
الطوائف على الاندلس فذهبت كتبها كل مذهب
الا الآن فقد قلت عناية الملوك بخزائن الكتب
اكتفاء بخزائن المدارس التي اتخذوها من حيث
انها بذلك اس[2] ۔"

جس میں بے شمار نفیس کتابیں موجود تھیں۔ تاتاریوں نے
جب بغداد کو تاخت و تاراج کیا تو یہ کتابیں بھی برباد ہو گئیں
اور ان کا نام و نشان مٹ گیا۔[1]

(۲) مصر میں خلفاء فاطمیہ کا کتب خانہ جو (بیش بہا
اور) نفیس کتابوں کی وجہ سے تمام کتبخانوں سے بڑھ چڑھ
کر تھا۔ انکے آخری خلیفۃ العاضد کی وفات کے بعد
یعنی دولت فاطمیہ کے انقراض تک یہ کتب خانہ موجود
تھا۔ جبکہ سلطان صلاح الدین مملکت مصر پر قابض
ہو گیا تھا

(۳) اندلس میں خلفاء بنی اُمیہ کا کتبخانہ جو عظیم الشان
کتب خانوں میں سے تھا۔ اندلس میں ملوک الطوائف
کے غالب آجانے سے انکی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اسوقت تک
یہ کتبخانہ موجود تھا۔ اسوقت اسکی کتابیں ہر جگہ منتشر ہو گئیں اور
اس زمانہ میں تو سلاطین کی توجہ کتبخانوں کی طرف سے بہت کم ہو گئی ہے
کہ اپنے قائم کردہ مدارس میں جو کتبخانے ہیں وہی کافی سمجھے جاتے
ہیں کیونکہ ان مدارس میں ان کتبخانوں کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

---

[1] ڈاکٹر پنٹو کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ اگرچہ زوال بغداد کے وقت اکثر کتابیں برباد ہو گئیں، تاہم مدرسہ مستنصریہ
کا کتبخانہ ایک صدی بعد تک موجود تھا۔ میں نے ابن الفوطی کے تذکرہ (مطبوعہ مجلہ "لغۃ العرب"
بغداد۔ جلد ۶۔ صفحہ ۶۴۷ - ۶۴۹) میں لکھا ہے کہ وہ کئی برسوں تک اس کتب خانہ کا مہتمم رہا
تھا۔ اس تذکرہ میں میں نے اس وسیع کتب خانہ کا بھی ذکر کیا ہے جو نصیر الدین طوسی نے تبریز
کے قریب شہر مراغہ میں قائم کیا تھا۔ ک۔
کرنیکو صاحب کا پنٹو پر اعتراض کرنا بیجا ہے، اس لیے کہ یہ قول قلقشندی کا ہے، جسکے
لیے وہ ذمہ دار نہیں ہو سکتے۔ آختر

[2] صبح الاعشیٰ جلد اول صفحہ ۴۶۶۔

مقام سیڈ واپر ہونے سے پیدا ہوگئی تھی اِس واقعہ کو ہر نہج سے ختم کر دیا جیسا کہ ہم پیشتر ذکر کر چکے ہیں برطانیہ سے بھی
صلح ہوگئی اور تمام معاملات طے ہوگئے -

ہیز صدر کے زمانے میں ملازمت کی خرابیوں کی اصلاح کی گئی اور جنوب کے سفید رہنماؤں کو خوش کرنے کیلیے
وہاں سے فوجیں ہٹائی گئیں جو خانہ جنگی کے زمانے سے ابتک چلی آتی تھیں ، آرتھر صدر کے زمانے میں دو بیویوں کو
حدود مملکت سے باہر رکھنے کا قانون بھی پاس ہوا ، ۱۸۸۲ء میں شرح محاصل کا مسودۂ قانون بھی پاس ہوا جس نے
بعض اشیاء پر کم محصول کر دیا اور بعض اشیاء پر بڑھا دیا اور اس طرح مصنوعات ملکی کی حفاظت کی گئی -

کلیولینڈ صدر کے زمانے میں کارخانوں کا قانون پاس ہوا جسکی وجہ سے چند اشیاء پر محصول معاف کیا گیا
جب وہ دوبارہ صدر منتخب ہوا تو برطانیہ عظمیٰ سے وینیز ولا کی سرحد کے سوال کا تصفیہ ہوا ، اور جزیرۂ ہوائی کو ریاستہائے
متحدہ میں شامل کر لیا گیا ، میک کلنے صدر کے زمانے میں چاندی کے سکے کی بجائے سونے کا سکہ تسلیم کیا گیا اور ڈالر کو
جاری کیا گیا ، نیز اسکے زمانے میں بیرونی حکمت عملی کا رجحان توسیع کی طرف رہا ، اسپین سے جزیرہ کیوبا کے معاملہ میں
جنگ شروع ہوئی اور صلحنامۂ پیرس سے ۱۰ دسمبر ۱۸۹۸ء کو ختم ہوئی ، اسپین نے اپنے امریکی مقبوضات سے دست برداری
دیدی اور کیوبا عارضی طور پر ریاستہائے متحدہ کے قبضے میں آگیا تاکہ بعد ازاں وہ بالکل آزاد ہوجائے - اور
پورٹو ریکو ، گام اور جزیرۂ فلپائن تاوان جنگ کی ادائگی میں ریاستہائے متحدہ کے حوالے کیے گئے - اب امریکہ دُنیا کی
طاقت شمار ہونے لگا اور شہنشاہیت کی حکمت عملی شروع ہوئی چنانچہ بہت جلد امریکہ نے چین میں بکسر کی بغاوت کے
معاملے میں دخل دینا شروع کیا ، جزیرۂ فلپائن میں امریکی حکومت کے خلاف اگی نالڈو نے بغاوت کی جو ۱۹۰۲ء میں
جا کر فرو ہوئی ، میک کلنے دوبارہ صدر منتخب ہوا لیکن اسکے دوبارہ صدر ہونیکے کچھ دنوں بعد جبکہ وہ ۱۴ ستمبر ۱۹۰۱ء کو
نمائش گاہ دیکھنے گیا تھا ایک شخص نے اُسے گولی سے مار ڈالا ، مسٹر روزولٹ جو نائب صدر تھا امریکہ کے رواج کے
مطابق صدر بنا دیا گیا یہ شخص نہایت مدبر اور زبردست حکمراں تھا ، اسنے بغاوت بکسر کے معاملے میں روسیوں کے
دعاوی کے خلاف اعتراضات کیے ، جنگ روس وجاپان کے خاتمے پر صلحنامۂ پورٹسمتھ اسی کی تحریک سے ہوا ۱۹۰۳ء
میں نہر پناما کے بنانیکا حق امریکہ کو عطا ہوا ، اسکو ۱۹۰۴ء میں دوبارہ منتخب کیا گیا ۱۹۰۷ء میں قانون جلاوطنی
پاس کیا گیا جس سے امریکہ میں آباد ہونیوالے کیلیے انگریزی زبان کا علم ضروری اور مناسب مالی حالت لازمی قرار دیگئی

سنہ ۱۹۰۹ء میں مسٹر ولیم۔ایچ ٹیفٹ صدر بنایا گیا اُسنے ڈاکخانے کے سیونگس بینک کا طریقہ رائج کیا۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں ڈاکٹر ووڈرو ولسن کا انتخاب ہوا۔ سنہ ۱۹۱۴ء کی مشہور جنگ یورپ میں جرمنی کے خلاف اور انگریزوں کی موافقت میں امریکہ بھی لڑائی میں شریک ہوا۔ جب سنہ ۱۹۱۸ء میں ابتدائی صلح ہوگئی تو ولسن کے چودہ اصول تمام دنیا میں مشتہر کیے گئے اگرچہ اُنپر عملدرآمد نہوا یعنی کسی نہ کسی بہانے سے دوسری چھوٹی اور کمزور قوموں کو آزادی نہیں دی گئی ڈاکٹر ولسن کے بعد مسٹر ہارڈنگ اور ان کے بعد مسٹر ہوور صدر منتخب کیے گئے۔ مسٹر ہوور موجودہ صدر ہیں۔

نقشہ صدورِ امریکہ ذیل میں درج ہے

نمبر	نام	سنہ	نمبر	نام	سنہ
(۱)	جارج واشنگٹن	سنہ ۱۷۸۹ء۔ سنہ ۱۷۹۶ء	(۱۱)	جیمس کے۔پوک	سنہ ۱۸۴۵ء۔ سنہ ۱۸۴۸ء
	(دوبار)		(۱۲)	زیچری ٹیلر	سنہ ۱۸۴۹ء۔ سنہ ۱۸۵۰ء
(۲)	جان ایڈمس	سنہ ۱۷۹۷ء۔ سنہ ۱۸۰۰ء		(جولائی سنہ ۱۸۵۰ء میں وفات پائی)	
(۳)	تھامس جیفرسن	سنہ ۱۸۰۱ء۔ سنہ ۱۸۰۸ء	(۱۳)	ملرڈ فلمور	سنہ ۱۸۵۰ء۔ سنہ ۱۸۵۲ء
	(دوبار)		(۱۴)	فرینکلن پیرس	سنہ ۱۸۵۳ء۔ سنہ ۱۸۵۶ء
(۴)	جیمس میڈیسن	سنہ ۱۸۰۹ء۔ سنہ ۱۸۱۶ء	(۱۵)	جیمس بوچانن	سنہ ۱۸۵۷ء۔ سنہ ۱۸۶۰ء
	(دوبار)		(۱۶)	ابراہیم لنکن	سنہ ۱۸۶۱ء۔ سنہ ۱۸۶۵ء
(۵)	جیمس منرو	سنہ ۱۸۱۷ء۔ سنہ ۱۸۲۴ء		(دوبار) (۱۴ اپریل سنہ ۱۸۶۵ء کو قتل کیا گیا)	
	(دوبار)		(۱۷)	اینڈرو جانسن	سنہ ۱۸۶۵ء۔ سنہ ۱۸۶۸ء
(۶)	جان کوانسی ایڈمس	سنہ ۱۸۲۵ء۔ سنہ ۱۸۲۸ء	(۱۸)	یولیسس ایس گرانٹ	سنہ ۱۸۶۹ء۔ سنہ ۱۸۷۶ء
(۷)	اینڈرو جیکسن	سنہ ۱۸۲۹ء۔ سنہ ۱۸۳۶ء	(۱۹)	رتھر فورڈ بی۔ہیز	سنہ ۱۸۷۷ء۔ سنہ ۱۸۸۰ء
(۸)	مارٹن فان برن	سنہ ۱۸۳۷ء۔ سنہ ۱۸۴۰ء	(۲۰)	جیمس اے۔گارفیلڈ	سنہ ۱۸۸۱ء
(۹)	ولیم ہنری ہیریسن	سنہ ۱۸۴۱ء		(قتل کیا گیا)	
	(۴ اپریل سنہ ۱۸۴۱ء کو وفات پائی)		(۲۱)	چیسٹر اے۔آرتھر	سنہ ۱۸۸۱ء۔ سنہ ۱۸۸۴ء
(۱۰)	جان ٹائلر	سنہ ۱۸۴۱ء۔ سنہ ۱۸۴۴ء	(۲۲)	گروور کلیولینڈ	سنہ ۱۸۸۵ء۔ سنہ ۱۸۸۸ء

(۲۳) بنیمن ہیری سن سنہ ۱۸۸۹ء۔سنہ ۱۸۹۲ء (۲۶) تھیوڈور روزولٹ سنہ ۱۹۰۱ء۔سنہ ۱۹۰۸ء
(۲۴) گروور کلیولینڈ سنہ ۱۸۹۳ء۔سنہ ۱۸۹۶ء (دوبار)
(۲۷) ولیم ایچ ٹیفٹ سنہ ۱۹۰۹ء۔سنہ ۱۹۱۲ء
(۲۵) ولیم میک کلنے (دوبارہ) سنہ ۱۸۹۷ء۔سنہ ۱۹۰۰ء (۲۸) ڈاکٹر ووڈرو ولسن سنہ ۱۹۱۲ء۔سنہ ۱۹۲۱ء
(دوبار منتخب ہوا گر سنہ ۱۹۰۱ء میں قتل ہوگیا) (۲۹) ہارڈنگ سنہ ۱۹۲۱ء۔سنہ ۱۹۲۳ء
(۳۰) مسٹر کالون کوئج سنہ ۱۹۲۳ء۔سنہ ۱۹۲۸ء (۳۱) ہوور (موجودہ صدر ہیں)

باب سیزدہم (۱۳)

کناڈا اور درجہ مستعمرات

باب ہشتم میں صلحنامہ پیرس (۱۰ فروری سنہ ۱۷۶۳ء) کا ذکر کیا جا چکا ہے جس کی رو سے نوا کوشیا، کناڈا کیپ برٹن، قطعات سیسی اور دیگر جزائر فرانس کو انگلستان کے حوالہ کرنے پڑے تھے۔ برطانیہ عظمیٰ نے کناڈا کے اہل کیتھولک کی جان و مال کی حفاظت کا اقرار کیا تھا اور یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ فرانسیسیوں کے حقوق ماہی گیری ساحل نیوفاؤنڈلینڈ پر بدستور جاری رہیں گے۔ اسی صلحنامہ کی رو سے اسپین نے بھی فلوریڈا کو برطانیہ عظمیٰ کے حوالہ کر دیا تھا۔

فوجی حکومت

سنہ ۱۷۶۳ء سے سنہ ۱۷۶۶ء تک اس صوبہ کی حکومت زیادہ تر وہاں کے باشندوں کے منشا کے مطابق کام کرتی رہی اگرچہ یہ حکومت فوجی حکومت تھی لیکن منصف مزاج اور عادل تھی۔ نیز وہاں کے باشندوں کے مزاج کے مطابق بھی کیونکہ اس زمانہ میں وہ زیادہ تر خود بھی بہادر اور فوجی تھے۔ بادشاہ جارج سوم کے شاہی اعلان سنہ ۱۷۶۳ء نے حکومت میں ایک قسم کی تبدیلی ضرور پیدا کر دی تھی جو زیادہ تر برطانوی احساسات اور رسوم کے مناسب حال تھی۔ اس زمانہ سے نئی رعایا کے تمام تنازعات جو حقوق اراضی یا جائداد غیر منقولہ کے بارہ میں مثل وراثت اور تقسیم ابین ورثاء پیدا ہوتے تھے ان کا تصفیہ جیسا کہ فتح سے پیشتر رواج تھا اب بھی خود انکے ہم وطن ججوں ہی کے فیصلوں سے ہوتا تھا۔ لیکن عدالتوں کے نظام کو انگلستان کے طرز پر ترتیب دینے کی

بدستور قائم رکھا گیا۔

بادشاہ نے اس صوبہ کے معاملات طے کرنے کے لیے ایک کونسل مقرر کی جس میں تیئیس ۲۳ سے زائد اور سترہ سے کم ممبر نہیں ہو سکتے تھے اور جو گورنر یا کمانڈر انچیف کی مرضی سے جیسا موقع ہو صوبہ کے معاملات طے کر سکتی تھی۔ اس کو یہ بھی اختیار دیا گیا کہ وہ صوبہ کی عمدہ حکومت کے لیے عارضی قوانین بنائے۔ اُس کو ٹیکس لگانے کا اختیار نہیں دیا گیا تھا سوائے اُن معمولی ٹیکسوں کے جو سٹرکوں یا دیگر رفاہ عام کے کاموں کے لیے لوگوں کی مرضی کے مطابق لگائے جاتے تھے۔

اس اہم قانون نے کناڈا کے مفتوحہ اشخاص کو تقریباً ایک قومی جماعت تسلیم کر لیا تھا اور جب تک شمالی اور جنوبی حصوں میں اس کو ۱۷۹۱ء میں تقسیم نہ کر دیا یہی قانون نافذ رہا۔ چونکہ امریکی انقلاب رونما ہو گیا تھا اس لیے اس کے دوران میں بھی قانون جاری رہا۔

وفاشعارانِ برطانیہ

۱۷۸۳ء میں ریاستہائے متحدہ سے صُلح ہو گئی جس کی وجہ سے کناڈا کو نفع بھی ہوا اور نقصان بھی دریائے اوہیو کی زرخیز وادی اور بڑی جھیلوں کے اردگرد کا کل جنوبی اور مغربی حصۂ ملک جو براعظم شمالی امریکہ کے نہایت زرخیز خطوں میں شمار ہوتا ہے ہمیشہ کے لیے کناڈا سے لے کر ریاستہائے متحدہ کے حوالہ کر دیا گیا لیکن اس نقصان کے مقابل اس کو یہ فائدہ بھی ہوا کہ امریکی وفاشعاران جن کو ریاستہائے متحدہ میں عام طور پر قدامت پرست کہا جاتا تھا یہاں آکر آباد ہو گئے جن کی وجہ سے کناڈا کی ترقی اور مرفہ الحالی میں بےحد امداد ملی کناڈا کے ایک نامور مورخ نے ان کی بابت لکھا ہے کہ "یہ ایک حقیقت ہے کہ وفاشعاران برطانیہ ہی کناڈا کے بنانے والے تھے، وہ رہنماؤں کی ایک جماعت تھے۔ نہایت بااثر جج ان، نہایت ممتاز وکلا، نہایت قابل اور سربرآوردہ اطباء، جماعت پادریان کے نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ، مختلف نوآبادیوں کی کونسل کے ارکان شاہی افسران، شائستہ اور دولت مند اشخاص یہ تمام وفاشعاران تھے۔ کناڈا اپنے جنوبی بھائیوں کا بےحد ممنون ہے۔ جنھوں نے مین سے لے کر جیورجیا تک اپنی نہایت عمدہ قابلیتوں کا اظہار کیا اور اُن کو ہمارے شمالی وحشیوں تک پہنچایا۔" یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ ۱۷۸۶ء تک پچاس ہزار سے زائد اشخاص برطانوی شمالی

امریکہ میں آباد ہو گئے تھے۔ ہزاروں نوا سکوشیا میں اور ہزاروں سنٹ جان کی وادی میں چلے گئے جہاں انھوں نے صوبۂ نیو برنزوک آباد کیا۔ دوسری بڑی جماعت مغرب کو روانہ ہو گئی اور شمالی کناڈا کی بنیادوں کو قائم کر دیا جو آئندہ اونٹریو ہونے والا تھا۔

صوبۂ کوئی بیک کے باشندے ۱۷۷۴ء کے قانون سے ہرگز مطمئن نہ تھے اور نہ ہوئے اور نئے بسنے والوں کی جماعت کو فرانسیسی قانون کی ماتحتی میں رہنا سخت ناگوار تھا۔ پھر اُن میں موروثی جذبہ نیابتی حکومت بھی کارفرما تھا۔ لہٰذا ایسی تبدیلی کے مطالبات جن میں حکومت خود اختیاری کے اصول جاگزیں ہوں زور شور کے ساتھ پیدا ہو گئے۔ لارڈ ڈارشیسٹر جو اس وقت کناڈا پر حکمراں تھا قائل ہو گیا کہ نئے حالات کیلیے نئے قوانین ہونے چاہییں۔ چنانچہ اس نے دیوانی کے مقدمات میں بھی جج کے ساتھ جوری کو اختیار سماعت دے دیا۔ اس کے بعد اس نے صوبہ کی ضروریات کا مطالعہ کیا جن کو اس نے وزیر نوآبادی ہا کے سامنے اپنی عمدہ رپورٹ میں پیش کیا۔

آئین سیاسی

لارڈ ڈارشیسٹر کی تحریک پر ارل گرنیول نے برطانوی پارلیمنٹ میں ایک مسودہ قانون پیش کیا جو آئین سیاسی کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں یہ تجویز کی گئی تھی کہ ملک کو دو صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے جو علٰحدہ علٰحدہ حکومتوں کے ماتحت ہوں ہر صوبہ کے لیے ایک قانون ساز مجلس کا انعقاد کیا گیا جو ایکٹ کونسل اور دارالنمایندین پر مشتمل تھی۔ برطانوی پارلیمنٹ میں مسٹر فاکس نے اس کی سخت مخالفت کی کہ کناڈا کو دو صوبوں میں تقسیم کیا جائے لیکن مسٹر پٹ کے اثر سے مجوزہ مسودہ قانون پاس ہو گیا۔ اس وقت زیریں کناڈا کی آبادی ایک لاکھ پچیس ہزار تھی اور بالائی کناڈا کی آبادی بیس ہزار سے بھی کم تھی۔ یہ آئین سیاسی جس پر ۱۷۹۲ء سے عمل درآمد کیا گیا ۱۸۱۲ء تک جب کہ انگلستان اور ریاستہائے متحدہ میں جنگ ہوئی کسی اہم واقعہ کے بغیر جاری رہا۔ فرانسیسی اہل کناڈا اس کے سخت خلاف تھے۔ جب ۱۸۱۵ء میں انگلستان اور ریاستہائے متحدہ میں صلح ہو گئی تو پچیس سال کے نزاعی اور شور و شغب کے زمانہ کا آغاز ہوا۔ دونوں صوبوں میں یہ جھگڑا شروع ہوا کہ ارکان حکومت پر قانون ساز مجلسوں کو تفوق حاصل ہو۔ زیریں کناڈا میں

یہ قضیہ اور بھی اس وجہ سے اہم ہو گیا تھا کہ انگریزی زبان بولنے والی اقلیت ارکان حکومت اور قانون ساز کونسلوں پر قابو رکھتی تھی اور قانون ساز مجلس پر فرانسیسی اہل کناڈا چھائے ہوئے تھے۔ لہذا تمام جھگڑے کی بنیاد نسلی مخاصمت پر تھی۔ لارڈ ڈرہم نے ۱۸۳۹ء میں فرمایا تھا کہ میں نے دونوں قوموں کو ایک ہی سلطنت کے اندر جنگ کرتے ہوئے پایا۔ میں نے یہ جنگ کسی اصول پر مبنی نہ دیکھی بلکہ یہ لڑائی صرف نسلی تھی"۔ قانون ساز مجلس نے یہ مطالبہ کیا کہ افسران حکومت اس کے جواب دہ رہیں اور پارلیمنٹ کی ذمہ داری کے نظریہ کو تسلیم کر لیں اور جس وقت عوام ان سے ناراض ہو جائیں تو وہ اپنے عہدوں سے دست بردار ہو جایا کریں آخرکار برطانوی پارلیمنٹ نے ایک کمیٹی ۱۸۲۸ء میں مقرر کی جو تمام امور نزاعی کی تحقیقات کرے۔ چنانچہ اس نے تحقیقات کے بعد چند اصلاحات پیش کیں جن کا نفاذ دونوں صوبوں میں کیا گیا۔ لارڈ ڈلہوزی کو جو سخت گورنر تھا اور وہاں کے باشندے اس سے سخت ناراض تھے وہاں سے ہٹا کر ہندوستان بھیج دیا گیا اور پیپنو کو مجلس ملی کا صدر منظور کر لیا گیا جس کو عوام منتخب کر چکے تھے لیکن ڈلہوزی نے مجلس ملی کو اسی بنا پر منتشر کر دیا۔

کناڈا میں بغاوت

کچھ عرصہ تک دونوں فرقے خاموش رہے لیکن بعد ازاں پھر بے چینی کے آثار نمایاں ہو چلے چنانچہ ۱۸۳۵ء میں ایک شاہی کمیشن مقرر کیا گیا کہ وہ صوبہ کے معاملات کی تحقیقات کرے اس نے اپنی رپورٹ برطانوی پارلیمنٹ میں ۱۸۳۷ء میں پیش کی۔ یہ رپورٹ مصلحان قوم کے انتہائی مطالبات کے خلاف تھی۔ لارڈ رسل نے اس رپورٹ کے مطابق ایک مسودہ قانون بنایا لیکن یہاں کے لوگ اس کے سخت خلاف ہو گئے۔ ماہ اکتوبر میں ایک باقاعدہ بغاوت کا آغاز ہوا۔ پہلا بلوہ مانٹریل میں نومبر کے شروع میں ہوا لفٹنٹ ویر کو باغیوں نے رستے میں گرفتار کر لیا اور اس کو گولی سے مار دیا۔ کرنل گور نے ایک توپ اور پانسو آدمیوں سے ۲۳ نومبر کی شب میں باغیوں پر حملہ کیا لیکن اسے شکست فاش ہوئی اور سخت نقصان کے بعد وہ واپس ہو گیا۔ وہ اپنی توپ بھی نہایت ذلت کے ساتھ کیچڑ میں ڈال کر فرار ہو گیا۔ بعد ازاں کرنل ویدرال نے باغیوں کو شکست دی اور پیپنو جو سلسلہ بغاوت میں خود شریک نہیں ہوا تھا اگرچہ اسی نے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کیا تھا اس شکست کی خبر سن کر بھاگ گیا۔ ۵ دسمبر کو مانٹریل کے ضلع میں مارشل

فوجی قانون) کا نفاذ ہوگیا۔ ۱۳ دسمبر کو سرجان کالبورن تیرہ سو آدمیوں کی باقاعدہ فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا اس حملہ میں بہت سے باغی ہلاک ہوئے اور آخر کار انھوں نے ہتھیار ڈالدیے اور اس طرح پہلی بغاوت کا خاتمہ ہوگیا

بالائی کناڈا میں بغاوت

کناڈا کے بالائی صوبہ میں میکینزی نے جبکہ زیرین کناڈا میں بغاوت ہو رہی تھی اعلان کیا کہ عارضی حکومت قائم کردی گئی ہے اور تمام محبان وطن کو اس میں حصہ لینا چاہیے۔ دسمبر کے پہلے ہفتہ میں باغیوں کا اجتماع ہونا شروع ہوگیا اور اگر وہ فوراً حملہ کردیتے تو ٹورونٹو انکے قبضہ میں آجاتا لیکن انھوں نے گورنر سے گفت وشنید شروع کردی جس نے ان کے مطالبات میں سے ایک کو بھی تسلیم نہ کیا اس عرصہ میں کافی فوج وہاں جمع ہوگئی جس نے باغیوں پر حملہ کردیا۔ ایک مختصر لیکن سخت لڑائی کے بعد باغیوں نے شکست کھائی اور میکینزی فرار ہوکر ریاستہائے متحدہ میں چلا گیا۔ عارضی حکومت اپنے صدر مقام دریائے نیاگرا کے بحری جزیرہ میں قائم رہی اور اپنا جھنڈا جس پر "آزادی اور مساوات" الفاظ تحریر تھے قائم کیا لیکن یہ حکومت زیادہ دنوں تک نہ چل سکی اور باغیوں کو سزائیں دی گئیں البتہ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ حکومت کناڈا کو بہتر طریقے پر چلانے کا قانون بنایا گیا۔

لارڈ ڈرہم کناڈا میں

زیرین کناڈا کی بغاوت کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ شاہی اراکین حل وعقد نے صوبہ کے آئین سیاسی کو موقوف کردیا اور عارضی حکومت چلانے کے لیے ایک خاص کونسل بنائی لارڈ ڈرہم کو گورنر جنرل مقرر کیا گیا اس نے ملکہ وکٹوریہ کی تاجپوشی کے دن سے فائدہ اٹھا کر تمام باغیوں کو معافی دیدی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر ان پر مقدمات چلائے گئے تو جوری ان کو کبھی مجرم نہیں قرار دے گی تا وقتیکہ ان کے دشمنوں کو جوری میں مقرر نہ کیا جائے۔ البتہ اس نے چند سرغنہ لوگوں کو جزائر برمودہ کا حکم تحقیقات کے بغیر دے دیا جس پر لارڈ ڈرہم کے مخالفین پارلیمنٹ نے بہت اعتراضات کیے اور اس نے اپنے عہدہ سے سبکدوشی کا ارادہ کیا۔ لیکن ڈرہم کی پالیسی کو عام طور پر اہل کناڈا نے پسند کیا۔ ڈرہم کے جانے کے بعد سر جان کولبورن گورنر جنرل مقرر ہوا اس نے سختی سے بغاوت کو فرو کیا۔ چنانچہ باغیوں کے بہت سے سرغنہ سولی پر چڑھا دئیے گئے

سنہ ۱۸۴۰ء کا قانون اتحاد

مسٹر تھامپسن جو فہیم اور بڑی ترکیب کا آدمی تھا کالبورن کے بعد دونوں صوبوں کا گورنر جنرل مقرر ہوا۔ اُسنے دونوں صوبوں کی قانون ساز مجلسوں کو آمادہ کیا کہ جو مسودہ قانون برطانوی پارلیمنٹ تجویز کر رہی ہے اس کو منظور اور قبول کرلیں۔ چنانچہ ۲۳ جولائی سنہ ۱۸۴۰ء کو ایک قانون نافذ کیا گیا جس سے زیریں و بالائی کناڈا متحد کر دیے گئے۔ قانون ساز مجلس میں دونوں کناڈوں کے ممبروں کی تعداد مساوی رکھی گئی۔ بالائی کناڈا کی باغی جماعت نے اس قانون کو ادھورا اور ناقص سمجھا لیکن زیریں کناڈا کے محبان وطن نے اس کو اہل کناڈا کی جمہوری سلطنت کی ابتدا قرار دیا۔ بہر حال مسٹر تھامپسن کے حسن انتظام سے برطانوی پارلیمنٹ بیحد خوش ہوئی اور اس کو لارڈ سڈنہم بنا دیا۔ نیز اس کو کناڈا کا گورنر جنرل بھی بدستور رکھا۔

ذمہ دار حکومت کا قیام

قانون اتحاد میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس میں اس اصول کو تسلیم کر لیا گیا تھا کہ گورنر کے وزرا باشندوں کے دار الندوین کے اعتماد پر کام کریں گے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ حکومت خود اختیاری کی بنیاد سنہ ۱۸۴۸ء تک نہ صرف کناڈا میں پڑ گئی بلکہ نیو برنزوک اور نوا سکوشیا بھی اسی اصول کے ماتحت ہو گئے اور سنہ ۱۸۵۱ء تک شہزادہ ایڈورڈ کا جزیرہ بھی اسی طرز حکومت سے سرفراز ہو گیا۔ لوگوں میں بھی یہ احساس ہو گیا کہ نسلی اور مذہبی فریق بندی کو خیرباد کہا جاے اور زبان کے اختلافات کو بالائے طاق رکھا جائے۔ سب کو چاہیے کہ ملک کی بہتری کے لیے کوشش کریں اور یہی ان کا اعلیٰ فرض ہے۔

بغاوت کے نقصان کا مسودہ قانون

لارڈ ایلگن کے زمانہ میں جو اس وقت وہاں کا گورنر جنرل تھا دو وزیر بالڈون اور لیفانٹین مقرر ہوے انھوں نے ایک مسودۂ قانون پیش کیا کہ ایک لاکھ پونڈ ان نقصانات کا معاوضہ دیا جاے جو لوگوں نے سنہ ۱۸۳۷ء کی بغاوت میں اٹھائے تھے۔ فوراً برطانوی یا قدامت پرست فریق نے آواز بلند کی کہ "باغیوں کو کوئی تنخواہ نہ ملنی چاہیے"۔ اور نسلی اور فرقہ وارانہ احساس غالب آگیا لیکن سخت مخالفت کے باوجود یہ قانون پاس ہو گیا اس قانون کے مخالفین نے لارڈ ایلگن کو ترغیب دی کہ وہ اپنے حکم سے اس کو مسترد کر دے لیکن اس نے

یہ سمجھ کر کہ باشندگان کی یہی خواہش تھی جیسا کہ ان کے وزراء نے مطالبہ کیا تھا اپنی منظوری دیدی اور ذمہ دار حکومت کو یہ پہلی فتح حاصل ہوئی۔ جب لارڈ الگن پارلیمنٹ کے کمرے سے قانون منظور کرنے کے بعد روانہ ہوا تو عوام نے جن میں نہایت تعلیم یافتہ اور روشن خیال اصحاب بھی شریک تھے نعرہ ہائے خوشی سے اس کا خیر مقدم کیا اور پارلیمنٹ کے مکان میں زبردستی گھس کر آگ لگادی اور ممبران کو نکال باہر کیا۔ برطانوی حکومت نے لارڈ الگن کو تو اپنی جگہ پر رہنے دیا لیکن مونٹریل کو یہ سزا دی کہ وہاں سے دارالسلطنت منتقل کر دیا۔ اور ۱۸۵۸ء میں آخر کار اٹاوا کو دارالحکومت بنا دیا۔

کچھ دنوں بعد یہ تجویز کی گئی کہ نوا سکوشیا اور نیو برنزوک کو بھی کناڈا سے ملحق کر دیا جائے۔ نیوفاؤنڈلینڈ اور شہزادہ ایڈورڈ کا جزیرہ کچھ عرصہ تک اس الحاق سے علٰحدہ رہے لیکن آخر کار ۲۹ مارچ ۱۸۶۷ء میں برطانوی شمالی امریکہ ایکٹ پاس ہو گیا اور یہ سب ایک آئین سیاسی کے ماتحت ہو گئے۔ کناڈا کا شمالی مغربی حصہ جو سمور کی تجارت کے لیے مشہور تھا اور صوبہ مینی ٹوبا سے موسوم تھا ۱۸۷۰ء میں کناڈا ہی سے ملحق کر دیا گیا۔ اب وہاں برطانوی پارلیمنٹ کی طرح لوگوں کے نائبین کام کرتے ہیں جن کا افسر اعلیٰ وزیر اعظم ہوتا ہے اور وہ تنہا تمام امور سلطنت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ انگلستان اپنی طرف سے صرف گورنر جنرل مقرر کرتا ہے جو بادشاہ کا نائب سمجھا جاتا ہے۔ اس کو ملکی انتظام اور امور سلطنت میں صرف اتنا ہی دخل ہے جتنا شاہ انگلستان کو اپنے ملک کی پارلیمنٹ میں دخل ہے

باب چہاردہم (۱۴)

فتح میکسیکو

میکسیکو قدرتی طور پر تین خطوں میں منقسم ہے خلیج میکسیکو سے جانب غرب گرم خطہ ہے جہاں کثرت سے
نباتات ہیں بعض مقامات پر ریگستان بھی ہیں آب و ہوا بعض موسموں میں خراب ہو جاتی ہے اس گرم خطہ سے ساٹھ میل بعد
معتدل خطہ شروع ہوتا ہے۔ اس خطہ کی پیداوار اکثر وہی اشیاء ہیں جو یورپ کے نہایت زرخیز ممالک میں پائی جاتی ہیں
اس دوسرے خطے سے گذر کر سرد خطہ آتا ہے جہاں کوہ انڈیس سات آٹھ ہزار فیٹ سطح سمندر سے بلند ہے، صنوبر کے
جنگلات ہیں اور آب و ہوا خوشگوار ہے۔ اس سطح مرتفع کے اندر پانچ جھیلیں واقع ہیں۔ ان جھیلوں کے کناروں پر
بہت سے شہر آباد تھے جنکے نشانات تک پائے جاتے ہیں اور سب سے بڑی جھیل کے بیچ میں ایک ٹاپو تھا جس پر شہر میکسیکو آباد تھا۔
لہذا پایۂ تخت شہنشاہ مونٹی زوما کا یہی دار السلطنت تھا اور وہیں رہتا تھا۔ اہل سپین کی آمد کے وقت مونٹی زوما جسکے معنی
[illegible] ہیں تمام وسطی امریکہ پر جو خلیج میکسیکو اور بحر الکاہل کے درمیان واقع ہے فرمانروائی کر رہا تھا۔
۱۵۱۸ء میں ایک ہسپانوی جسکا نام کورٹیز تھا ڈیاگو ویلاسکیز کی مہم میں اسکے ہمراہ کیوبا کو روانہ ہوا اُسنے اس جزیرہ
کی فتح میں کارہائے نمایاں انجام دیے بعد ازاں وہ ۱۸ نومبر ۱۵۱۸ء کو ایک مہم لیکر وہاں سے چلا۔ اسکا بیڑہ گیارہ چھوٹے جہاز
و کشتیوں کا تھا۔ پانسو آٹھ سپاہی، ایک سو نو ملاح کل چھ سو سترہ آدمی تھے۔ چند اشخاص کے پاس بندوقیں تھیں ورنہ زیادہ تر کمان
تلواریں اور نیزے تھے صرف سولہ گھوڑے تھے اور دس چھوٹی توپیں۔ اس طاقت کیساتھ کورٹیز ایک قوم سے لڑائی کرنے کو نکلا تھا

پیغامبر فوراً مونٹی زوما کے پاس روانہ کیے گئے جو چند روز میں واپس آگئے اور بہت سے تحائف کورٹیز کیلیے
لائے اور اپنے بادشاہ کی طرف سے یہ درخواست کی کہ وہ اپنے ملک کو واپس چلا جائے لیکن اہل اسپین اُن ہدایا کو دیکھکر بیحد
خوش ہوئے اور اُنسے اُنھوں نے اندازہ کیا کہ ملک نہایت خوشحال اور مالدار ہے ایسے ملک کو فتح کیے بغیر چھوڑنا
دانشمندی کے خلاف ہے۔ مونٹی زوما کو جب کورٹیز کا ارادہ معلوم ہوا تو اور بھی قیمتی تحائف روانہ کیے اور ساتھ ساتھ
یہ بھی پیغام بھیجا کہ وہ ملک سے اپنی فوج لیکر باہر چلا جائے لیکن ہسپانوی مونٹی زوما کے اس فعل سے میکسیکو کے فتح کرنے
اور زیادہ تل گئے۔ اسی دوران میں بعض ہمراہیوں نے جو کورٹیز کے خلاف تھے واپسی کیلیے اصرار کیا۔ کورٹیز نے فوراً حکم دیا
کہ واپس چلنے کیلیے جہازات تیار ہو جائیں۔ اسپر اور لوگ بیحد برافروختہ ہوئے اور کورٹیز سے ملکر دریافت کیا کہ ایسا حکم
کیوں دیا گیا ہے۔ اُنھوں نے کہا ہم تو اسکو سخت بزدلی سمجھتے ہیں کہ یہاں سے بے نیل مرام واپس جائیں۔ کورٹیز نے کہا کہ
مجھ کو آپ صاحبان کی رائے سے اتفاق ہے لیکن فلاں فلاں اصحاب واپسی کیلیے مصر ہیں۔ اسپر سب لوگ اُن آدمیوں کے
خلاف ہو گئے اور اُنکو مجبور کیا کہ وہ بھی اُنکے ہمخیال ہو جائیں۔ اس طریقے سے کورٹیز نے سب کو اپنے حکم کا تابع بنا لیا۔ جب
کورٹیز نے دیکھا کہ اُسکے ہمراہی اُسکے کہنے میں ہیں تو اُسنے حکم دیا کہ تمام جہازات توڑ ڈالے جائیں اور اُنکی تمام قیمتی اور
کارآمد اشیا خشکی پر اتار لی جائیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس امر سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کورٹیز کا اثر اپنے ہمراہیوں پر
کس درجہ تک تھا، چھ سو آدمی بقیہ دنیا سے تعلقات قطع کر کے ایک مخالف ملک میں جسکے باشندے جنگجو اور خونخوار تھے
بخوشی تمام بند ہونے پر راضی ہو گئے۔

اب کورٹیز نے محسوس کیا کہ وہ فتوحات کی منزل پر روانہ ہونیکے لیے بالکل تیار ہے۔ چنانچہ وہ سیمپولا کی طرف بڑھا،
وہاں وہ مذہبی جوش سے مغلوب ہو کر اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ مندروں کے بتوں کو توڑ ڈالا اور اُنکی جگہ صلیب اور
حضرت مریم کی تصویر رکھوا دی۔ پجاریوں نے باشندوں کو تلوار اٹھانے کیلیے ترغیب دی لیکن کورٹیز کا خوف اُنکے دلوں پر
اسقدر طاری تھا کہ وہ اسکی اطاعت کے سوا اور کوئی چارہ نہیں دیکھتے تھے۔ اسی اثنا میں کورٹیز نے اپنے کچھ آدمی اُس مقام کی
حفاظت کیلیے چھوڑے جو بیمار بھی تھے اور لڑنیکے قابل نہ تھے صرف پانسو آدمیوں کو اپنے ہمراہ لیکر وہ اندرون ملک
جا رہا تھا کہ اسکی مڈبھیڑ فرقہ ٹیلیکس کالا سے ہوئی۔ اس فرقہ نے اپنی فوج تیار کی اور اہل اسپین پر حملہ کیا، چند آدمی
زخمی کیے اور دو گھوڑے مار ڈالے۔ ان حالات میں یہ نقصان بھی کورٹیز کیلیے بہت زیادہ تھا پس اُس نے آئندہ

سیری تشفی ہوگئی لیکن ہسپانیہ والے اس وقت تک مطمئن نہ ہوئے کہ آپ ہمارے لشکر میں چلکر رہیں، مونٹی زوما اس بات سے نہایت
پریشان ہوا لیکن اسکے سوا اور کوئی چارہ کار بھی نہ تھا اور وہ کورٹیز کے ہمراہ روتا ہوا اور رنج کرتا ہوا اگرچہ شاہانہ
شان و شوکت کیساتھ اہل اسپین کے لشکر میں چلا گیا، وہاں وہ چھ ماہ تک قید رہا اور کورٹیز تمام احکام اسکی بجاے جاری
کرتا رہا، تمام ملک کو اہل اسپین نے دیکھ ڈالا، کورٹیز نے بعض گورنروں کو معزول کر دیا جو اسکے خلاف خیالات رکھتے ہوے
پاے گئے اور انکی جگہ دوستانہ تعلقات رکھنے والوں کو مقرر کر دیا، مونٹی زوما اپنی اس نظربندی سے اسقدر تنگ ہوا کہ اسنے
اپنے آپکو شاہ اسپین کا باجگذار بھی تسلیم کر لیا، جب ویرا کروز کا گورنر آیا تو اسکو اور اسکے بیٹے اور پانچ چھ افسروں کو اہل اسپین کے
حوالے کر دیا گیا، کورٹیز نے ان سب کو آگ میں ڈلوا دیا، میکسیکو کے باشندے اس نظارہ سے نہایت خوفزدہ ہوے
بعد ازاں کورٹیز نے مونٹی زوما سے کہا کہ آپ اپنا مذہب تبدیل کر لیں لیکن وہ اسپر راضی نہوا، اور کورٹیز نے غصے میں آکر تمام
مندروں کے بتوں کو پھکوا دیا، اسپر مندروں کے پجاریوں نے لوگوں کو مشتعل کیا اور وہ لڑنیکے لیے تیار ہوگئے، کورٹیز نے یہ حال دیکھکر
اپنا حکم واپس لیا اور مذہبی مداخلت کرنے سے آئندہ باز رہنے کا وعدہ کیا تاہم وہاں کے لوگ اہل اسپین سے تنگ آگئے تھے
اب انھوں نے یہ کوشش کی کہ کسی طرح انسے مخلصی حاصل کیجاے، مونٹی زوما کو بھی اس مشورہ میں شریک کیا گیا، چنانچہ ایکدن
مونٹی زوما نے کورٹیز سے کہا کہ ہم سب لوگ آپکے اطاعت گزار ہیں اور آپکا جو مقصد تھا وہ حاصل ہوگیا، اب آپ واپس
تشریف لیجایے ورنہ لوگ برسرپیکار ہیں اور پھر آپکی تباہی یقینی ہے، کورٹیز نے اسپر کوئی اعتراض نہ کیا اور اسکو اطمینان
دلایا کہ ہم سب بہت جلد واپس چلے جائیں گے، چنانچہ بظاہر واپسی کے لیے تیاری بھی شروع کر دی،

جب کورٹیز اس بات پر غور کر رہا تھا کہ میکسیکو کے باشندوں کی مخالفت کا توڑ کیا جاے اسے ایک وحشتناک
اطلاع پہنچی، ڈیاگو ویلاسکیز گورنر کیوبا نے یہ معلوم کرکے کہ کورٹیز اپنے طور پر میکسیکو فتح کر رہا ہے اور تمام نام آوری اور شہرت
اسکے حصے میں آئیگی اٹھارہ جہازوں کا ایک بیڑہ تیار کیا اور اپنے ایک ماتحت کو اس بیڑہ کا سردار بنا کر بھیجا تاکہ وہ وہاں پہنچکر کورٹیز
اور اسکے ماتحت افسروں کو قتل یا گرفتار کرے، جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ویرا کروز میں قیام پذیر ہوے ہیں تو کورٹیز میکسیکو سے
صرف ستر آدمی اپنے ہمراہ لیکر روانہ ہوا، اور چولولا کے مقام پر اپنے دوسرے آدمیوں سے جنکو وہ پیچھے چھوڑ گیا تھا آن کر ملا،
اسکے بعد یہ لوگ سیمپولا پہنچے اور یہاں انسے نبرد آزما ہوے، ناروئز کی ایک آنکھ میدان کارزار میں جاتی رہی اور کورٹیز نے
اسے گرفتار کرکے ویرا کروز بھیجدیا، ناروئز کے ہمراہی کورٹیز کے کچھ خلاف نہ تھے چنانچہ وہ سب اسکے جاں نثار سپاہیوں میں

مرزا رجب علی سرور مرحوم

- فسانۂ عجائب ۸ر
- انشائے سرور ۴ر

امیر مینائی مرحوم

- امیر اللغات (نامکمل) عہ
- صنم خانۂ عشق ۸ر
- مرآۃ الغیب عہ
- محامد خاتم النبیین ۸ر
- [illegible]

جلال لکھنوی

- سرمایۂ زبان اردو
- رسالہ تذکیر و تانیث
- قواعد المنتخب

مرزا محمد عباس ہوش

- فسانۂ نادر جہاں
- پیاری سہیلی ۸ر
- دفتر سحر

چودھری [illegible] الزماں

- سیتا ۲ جلد
- شہید جفا

منشی موہن لال [illegible]

- سلطانہ کامل عہ
- رنگین [illegible]

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- فسانۂ آزاد ۴ جلد
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلیٰ بطرز ناول
- کامنی

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین
- حاجی بغلول
- پیاری دنیا
- کایا پلٹ
- میٹھی چھری
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

منشی جوالا پرشاد برق

- [illegible]
- مار آستین
- بنگالی دولھن
- معشوقۂ فرنگ
- پرتاب
- رومنی

منشی پریم چند

- پریم پچیسی ۲ جلد
- بازار حسن
- چوگان ہستی
- خاک پروانہ
- پریم پچیسی ۲ جلد

مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم

- جنید بغدادی
- خواجہ معین الدین چشتی
- تذکرۂ شاہ عالم
- [illegible]
- قیس و لبنیٰ
- مقدس نازنین
- ایام عرب
- فتح اندلس
- ماہ ملک
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرامپور
- الفانسو
- مفتوح فاتح
- فلپانا
- زوال بغداد
- لعبت چین
- نیکی کا پھل
- جویائے حق
- بابک خرمی
- طاہرہ
- شوقین ملکہ
- مینا بازار
- یوسف و نجمہ
- گذشتہ لکھنؤ
- شاعرانہ و عاشقانہ مضامین
- تاریخی و جغرافیہ مضامین
- سیر رجال
- سیر نسواں
- عصر قدیم

حکیم محمد علی خاں مرحوم

- رام پیاری [illegible]
- عبرت
- حسن سرور
- اختر و حسینہ
- دیول دیوی
- نیل کا سانپ

شوق قدوائی مرحوم

- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ
- عالم خیال
- نیرنگ جمال
- گنجینہ
- میکفرن اور لوسی

خواجہ عبدالرؤف عشرت

- آب بقا
- زبان دانی
- اصلاح زبان اردو
- قواعد میسر
- اصول اردو
- جان اردو
- شاعری کی چار کتابیں
- لغات اردو

منشی محمد احسن وحشی

- [illegible]
- جام زہر
- میلاد نغمہ حرم

مولانا حکیم عبدالحی مرحوم

- یاد ایام
- گل رعنا

حکیم احمد حسین الہ آبادی

- تاریخ ابن خلدون جلد اول
- دوم
- سوم
- چہارم
- پنجم
- ششم
- ہفتم
- ہشتم
- نہم
- دہم
- یازدہم
- دوازدہم
- سیزدہم
- سلطان صلاح الدین
- نور الدین محمود

مولوی محمد حلیم انصاری

- الاسلام والنصرانیۃ
- ابو مسلم خراسانی
- تاریخ عرب

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی

- سیرۃ الصدیق
- علمائے سلف
- اسلامی اخلاق

حافظ اسلم جیراجپوری

- [illegible] الرسول
- خلافت راشدہ
- خلافت بنو امیہ
- خلافت بنو عباس
- عباسیہ بغداد
- عباسیہ مصر
- علوم عرب
- تاریخ نجد

قاضی سلیمان منصور پوری

- رحمۃ للعالمین ۲ جلد
- سفرنامۂ حجاز

مولوی خلیل الرحمن

- اخبار الاندلس ۳ جلد
- تاریخ مولدین
- مختصر تاریخ اسلامی

مولوی محمد انشاء اللہ مرحوم

- سیرۃ الرسول
- تاریخ آل عثمان
- حالات عراق عرب و افغان
- حالات قسطنطنیہ
- تاریخ مراکش مغرب الاقصیٰ

منشی سعید احمد مارہروی

- حیات خسرو
- امرائے ہنود
- حیات صالح

ہو المستعان

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۷۸

الناظر

ایڈیٹر ـــــ ظفر الملک ـــــ علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ للعہ ر

قیمت فی پرچہ ۸ ر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو کی بہترین کتابیں

محصول معاف

پندرہ روپے کی روانگی پر آدھا
اور
پچیس روپے کی روانگی پر پورا

ہدیۃً لیجیے

پچاس روپے کی روانگی پر الناظر ایک سال
اور
سو روپے کی روانگی پر دس روپے کی کتابیں

مرزا غالب مرحوم

- اردوے معلیٰ
- عود ہندی
- دیوان غالب مرد جہ
- کمل دیوان غالب

سر سید مرحوم

- خطبات احمدیہ
- کمل مجموعہ لکچر
- اسباب بغاوت ہند
- مضامین تہذیب الاخلاق
- خطوط سر سید

نواب محسن الملک مرحوم

- مضامین تہذیب الاخلاق
- کمل مجموعہ لکچر
- تقلید و عمل بالحدیث
- کتاب المحبت والشوق
- مکاتیب
- مسلمانوں کی تہذیب

خلیفہ محمد حسین مرحوم

- اعجاز التنزیل
- سفرنامہ ہرمز ۲ جلد

مولانا آزاد مرحوم

- آب حیات
- دربار اکبری
- سخندان فارس
- نگارستان فارس
- نیرنگ خیال
- سیر ایران
- ڈرامۂ اکبر
- مجموعہ مکتوبات آزاد
- مجموعہ نظم آزاد
- نصیحت کا کرنپھول
- جانورستان
- بیاض آزاد
- تذکرۂ علما
- لغت آزاد
- دیوان ذوق مرتبہ آزاد

پروفیسر شہباز مرحوم

- زندگانی بے نظیر
- خیالات شہباز

مولوی سید ممتاز علی

- تذکرۃ الانبیا
- شیخ حسن

مولانا نذیر احمد مرحوم

- حمائل شریف مترجم
- الحقوق والفرائض
- بنات النعش
- مراۃ العروس
- توبۃ النصوح
- موعظۂ حسنہ
- رویاے صادقہ
- ایامیٰ
- فسانۂ مبتلا
- ابن الوقت
- مصائب غدر
- مجموعہ نظم بے نظیر
- کمل مجموعہ لکچر ۲ جلد
- منتخب الحکایات
- چند پند
- مبادی الحکمۃ

مولانا شرر مرحوم

- حیات انیس
- ایشیائی شاعری
- نور جہاں بیگم
- حیدر علی سلطان
- لغات الخواتین

مولانا حالی مرحوم

- یادگار غالب
- حیات سعدی
- مقدمۂ شعر و شاعری
- حیات جاوید
- دیوان حالی
- مسدس حالی مجلد
- مجموعہ نظم حالی
- بیوہ کی مناجات
- شکوۂ ہند

مولوی بشیر الدین مرحوم

- واقعات دار الحکومت دہلی
- تاریخ بیجاپور
- حرز طفلاں
- نشاط عمر
- عصاے پیری
- لخت جگر
- حسن معاشرت
- اصلاح معیشت
- اقبال دولھن
- شمع ہدایت
- انشاے بشیر
- دیوان بشیر

مولانا شبلی مرحوم

- سیرۃ النبی جلد اول
- 〃 دوم
- 〃 سوم
- الفاروق
- سیرۃ النعمان
- الغزالی
- المامون
- سوانح مولانا روم
- سفرنامہ مصر و روم و شام
- علم الکلام
- الکلام
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- شعر العجم جلد اول
- 〃 دوم
- 〃 سوم
- 〃 چہارم
- 〃 پنجم
- موازنۂ انیس و دبیر
- مضامین عالمگیر
- آغاز اسلام
- مجموعہ کلام شبلی اردو
- مکاتیب شبلی ۲ جلد

مولانا ذکاء اللہ مرحوم

- تاریخ ہندوستان
- کرزن نامہ
- آئین قیصری
- محاربات عظیم
- معادن الحساب
- مساحت ٹوڈرمل

سید محمود مرحوم

- کتاب الطلاق
- کتاب الشفعہ
- لکچر
- شرح قانون شہادت

مولوی رشید احمد انصاری

- المدینۃ والاسلام
- تحریر المراۃ

مولوی ابو الحسن فرید آبادی

- ترجمہ تاریخ مصر
- ترجمہ رشحات
- ترجمہ عوارف المعارف
- ترجمہ مکتوبات لارڈ ڈفرن
- علم السیاست

ملنے کا پتہ - الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ

فہرست مضامین بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۳۰ء

نمبر ۵ — جلد ۳۷

جبری تعطیل

ظ

نئی کتابیں

تالیفات جناب حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس دتاؤلی ضلع علیگڈھ

اسلامی خلافت کا کارنامہ (پہلا حصہ) اسلام سے پہلے دنیا کی مذہبی اور اخلاقی حالت، تاریخ کی ورق گردانی کرنے کے بعد نہایت تحقیق سے لکھا ہے۔ قیمت ۱۲؍

ایضاً (دوسرا حصہ) جلد اول موسوم بہ "مولود ہمایوں" جسمیں نبی کریمؐ کے اجداد کے حالات، حضور کی ولادت باسعادت، مذہبی اور اخلاقی اصلاحات کے لیے جد و جہد، کفار کی ایذادہی اور ہجرت کا حال وضاحت کے ساتھ درج ہے۔ قیمت عہ؍

ایضاً " جلد دوم موسوم بہ "مصطفائی کمال" اس میں ہجرت کے بعد جو جو واقعات پیش آئے ہیں اور جن سے مذہبی، اخلاقی اور انتظامی اصلاحیں فرمائی گئی ہیں وہ سب درج ہیں۔ آخر میں حدود شرعیہ کا بھی ذکر ہے قیمت ۱۲؍

مولود نبوی اور سلسلۂ تعلیم بنی نوع انسان پر جناب سرور کائناتؐ کے احسانات اور حضور کے وسیلہ سے برکات الٰہی کا بندوں پر نزول۔ قیمت ۸؍

ہندی قوم جس میں ہندی قوم کی بناوٹ، اسکی ترتیب، ہندی قوم کے وطنی کارنامے اور ہندوستان کے آثار عظمت کا بیان ہے۔ قیمت ۸؍

نقش و نگار

مسٹر جلیل احمد قدوائی بی اے (علیگ) سابق سب اڈیٹر الناظر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ۔ قیمت عہ؍

سادھو اور بیسوا

پنڈت کشن پرشاد کول بی اے رکن انجمن خادمان ہند کا اصلاحی افسانہ۔ جسے مشہور مغربی فسانہ نگار اناطول فرانس کے ایک لاویز افسانہ کا نقش ثانی کہنا بیجا نہ ہوگا۔ ۱۲؍

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے طلب کیجیے

جبری تعطیل

غالباً ناظرین کرام اس خبر کو استعجاب کے ساتھ پڑھیں گے کہ مولوی حاجی ظفر الملک صاحب ایڈیٹر الناظر (راقم سطور کے والد ماجد) جنگ آزادی کے سلسلہ میں تاریخ ۲۴ مئی گرفتار ہوئے اور اسی روز ڈسٹرکٹ جیل لکھنؤ میں مقدمہ پیش ہو کر فوراً ۶ ماہ قید سخت اور سو روپیہ جرمانہ کی سزا ہو گئی۔ جس نے نہ صرف مئی نمبر کی اشاعت میں غیر معمولی تعویق کے اسباب پیدا کر دیے بلکہ الناظر کو کچھ زمانہ تک تعطیل پر مجبور بنا دیا۔

سنہ ۲۰ء میں جب ایڈیٹر صاحب الناظر کو دو سال کے لیے شاہی مہمان سرا کی سکونت نصیب ہوئی تو انکی عدم موجودگی میں ۶ ماہ تک الناظر نکالا گیا مگر اتنی مدت میں جو نقصان دفتر کو برداشت کرنا پڑا وہ ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ اس بنا پر ابکی یہ طے کیا ہے کہ اس پرچہ کی اشاعت کے بعد ایڈیٹر صاحب کی رہائی تک الناظر بند رہیگا۔ اس ششماہی کا بقیہ ایک پرچہ جو معمولی حالات میں اسی طرف شایع کیا جاتا ایڈیٹر صاحب کی رہائی کے بعد غالباً نومبر یا دسمبر میں شایع کیا جا سکے گا اور جملہ خریداروں کی میعاد میں ۲ ماہ کا اضافہ کر کے انشاء اللہ جنوری سنہ ۳۱ء سے باقاعدہ اشاعت کا انتظام کیا جائیگا۔
اس طریقہ پر ناظرین کرام کو الناظر کے عارضی طور پر بند ہونے سے کوئی مالی خسارہ نہ ہوگا۔

ایڈیٹر صاحب سے جو احباب مراسلت کرنا چاہیں وہ خواہ بہ توسط دفتر کے پتہ پر خطوط بھیجیں یا ڈسٹرکٹ جیل لکھنؤ کے حسب ذیل پتہ پر:- اسحاق علی علوی عرف ظفر الملک قیدی ۱۴۵۴ اے کلاس ڈسٹرکٹ جیل لکھنؤ۔

حکومت نے ایڈیٹر صاحب کو اے کلاس کا قیدی قرار دیا ہے۔ جسکی رو سے اپنے کپڑے پہننے، کھانے کا زیادہ سامان اپنے صرف سے منگانے، اخبار اور کتابیں پڑھنے، پندرھویں روز ملاقات کرنے اور پندرھویں روز خط لکھنے کی اجازت ہے۔ رات کو صحن میں لیٹنے کی بھی اجازت ہے۔

آخری ملاقات ۱۵ جون کو ہوئی تھی اور آخری تحریر ۱۸ جون کو موصول ہوئی تھی۔ اسوقت تک ایڈیٹر صاحب موصوف کی صحت درست تھی۔ احباب متشوش نہ ہوں۔ اور جو اصحاب خاص ہمدردی و اعانت کرنا چاہتے ہوں انکو اپنی توجہ الناظر ایجنسی کی قدر افزائی پر مبذول کرنا چاہیے کیونکہ ایڈیٹر صاحب کی ذاتی معیشت اور آزادانہ ملکی و قومی خدمت کا سامان زیادہ تر اسی کی بدولت ہے

اُن کی عدم موجودگی میں انکے اہل وعیال کی کفالت بھی اسی سے منسلک ہے۔
ناظرین کرام کو جو انتظار کی زحمت برداشت کرنا پڑی ہے اُس کے لیے ہم دل سے نادم ہیں لیکن ہم اُنکے لطف وکرم پر وثوق رکھتے ہیں کہ موجودہ حالات سے واقف ہونے کے بعد اُن کو محل شکایت باقی نہ رہیگا۔

نوٹ :- ایک کرم فرمانے والد ماجد کی خبر اسیری سے متاثر ہو کر چند شعر محبت سے تحریر فرمائے ہیں، اُن کا یہاں درج کرنا غالباً بے محل نہ ہوگا :-

اے عہد ستم پیشہ اے فتنۂ دورانے
ناکردہ گناہے را کردی تو بزندانے

عرفش ظفر الملک ست، اسحاق علی نامش
دیدیم نہ دامانش آلودہ بہ عصیانے

پاک ست ز معصیت، در قید غم ومحنت
کردست ادا سنت، از یوسف کنعانے

دارد بدلش سوزے، سوزیست دل افروزے
باشد کہ رسد روزے، ایں درد بدرمانے

مجبور چو دیوانہ، دارد غم جانانہ
گوید بہ کہ افسانہ، جز حضرت سبحانے

خادم

حافظ محمد داؤد ابن مولانا ظفر الملک علوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۵ جلد ۳۷ — مئی سنہ ۱۹۳۰ء

ٹراٹسکی

(Trotskey)

اس دور سیاست و حریت کے دیکھنے والوں پر ظاہر ہے کہ آجکل دنیا تمدن و معاشرت کے اعتبار سے آخری منزلوں کے نزدیک پہونچ گئی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب اہل عالم بالکل وحشی تھے۔ پھر وہ آپس میں رہنے سہنے لگے۔ دیہات و قریات آباد کیے، زراعت و تجارت شروع کی، بڑے بڑے شہر بنائے، سلطنتیں قائم کیں اور یہ اُجڑی دنیا بنی آدم کا خوشگوار گھر ہو گئی۔ ایسی حالت میں ضمیر انسانی کو جو ذات بے نیاز کی نمایاں دلیل ہے ایک مقدس مذہب، اعلےٰ معاشرت اور راہِ راست پر لانے والے قوانین نافذ کرنے کی خواہش ہوئی اور یہ ضرورت بڑے بڑے پیغمبروں اور مہاتماؤں کے وجود سے پوری ہوتی رہی اور عالموں نے اُنکے ایجاد کردہ قوانین کو اپنے علم کے ذریعے اہل عالم پر اور بھی روشن کر دیا۔ لیکن بیسویں صدی عیسوی سے دنیا کا تمدن ایک نئی منزل کی طرف مائل ہو گیا جہاں پہونچانے کے لیے خداوند کریم نے بجائے پیغمبروں اور اوتاروں کے محبان وطن اور فدایان قوم پیدا کرنے شروع کر دیے، جو مظلوم قوموں کو ظالموں کے دست تعدی سے ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیں۔

اس نئے انتظام کی بنا پر جب باری تعالیٰ کسی قوم میں خودداری اور احساس قومی پیدا کرتا ہے تو خود اُسی قوم سے کوئی نہ کوئی ہستی ایسی اُٹھ کھڑی ہوتی ہے جو منزل حریت تک اُنکی

رہنمائی کر سکے۔ کہیں وہ ٹالسٹائی ہو کر فسانے سناتی ہے، کہیں واشنگٹن ہو کر خود سپہ سالاری
کے لیے تیار ہو جاتی ہے، کہیں مصطفےٰ کمال ہو کر ڈوبتے ہوئے بیڑے کو سنبھالتی ہے، کہیں
سابرمتی آشرم سے نکل کر قومی ایثار و ذاتی قربانی کی مثال بہم پہونچاتی ہے۔ کہیں ایک سچے
امام الاحرار اور فدائے ملت کی صورت میں اسٹیج پر آ کر ایسی ایسی تقریریں کرتی ہے کہ سننے
والے غفلت سے بیدار ہی نہیں ہو جاتے بلکہ راہ عمل میں اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے آمادہ
ہو جاتے ہیں۔

غرض جب حکومت شخصی کے مظالم نے اہل روس کو بالکل تباہ و برباد کر دیا، جب اہل
روس خود غرض قوموں کی پالیسیوں اور اپنے مطلق العنان اور جابر بادشاہ سے عاجز آ کر
آتش زیر پا ہو گئے تو خدا کو بھی اُنکی حالت پر رحم آیا۔ اور حکم ہوا کہ "روسیو! اگر تم مجھے بھول گئے
مگر میں کسی قوم کو نہیں بھولا، نہ تمہیں بھولتا ہوں۔ تو تمہاری رہنمائی کے لیے ٹراٹسکی عنایت کیا
جاتا ہے۔ شاید تمہاری بگڑی بن جائے"۔

۱۹۱۷ء کے معرکہ میں لینن ٹراٹسکی نے جو شہرت حاصل کی اُس سے کون واقف نہ ہوگا
یہ ٹراٹسکی اور نکولی لینن (Nicolai Lenin) ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ روس پر
بولشویک قبضہ مستقل طور پر ہو گیا۔ ان دونوں فدایان قوم میں سے موخر الذکر نے اپنا مشن
پورا کر کے ابدآباد کی دنیا جا بسائی مگر ٹراٹسکی سے ابھی بہت کچھ امیدیں وابستہ رہیں۔

انیسویں صدی کے اختتام پر روس طرح طرح کے انقلابوں کا جولاں گاہ بنا ہوا تھا۔ اس
وقت بالشویکوں کا نام سوا روس کے دنیا میں شاید ہی کہیں لیا جاتا ہو۔ لیکن ٹراٹسکی اُٹھا اور
نہایت جرات سے ثابت کر دیا کہ کسی قوم میں اللہ تعالیٰ نے کوئی طبقہ ذلیل نہیں پیدا کیا اور
اُس نے بالشویکوں کو اپنی قوم میں نمایاں کر کے چھوڑا۔ جیسے کہ امید کی جاتی ہے کہ کسی زمانے
میں ذات پات کی تمیز کو جو ہندوستان کے تمدن میں دیمک ہو کر لگی ہے، گجرات کا ایک بنیا
توڑ کر رہے گا اور ثابت کر دے گا کہ دنیا میں مہاتما ہر طبقہ کا فرد ہو سکتا ہے۔

جو سچے فدایان قوم ہوتے ہیں اُنکو فلک کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ ظفر علی کو دیکھیے
تمام عمر قید فرنگ میں کٹی۔ ایسی مثالیں سیکڑوں اور ہزاروں موجود ہیں۔ ٹراٹسکی بھی ۱۸۹۹ء
میں جلا وطن کر دیا گیا اور سائبیریا کے برفانی میدان اُس کا مسکن بنائے گئے۔ مگر مجاہد ریف عبد الکریم
نہ تھا کہ اسکے مددگار نہ ہوتے۔ بولشویک اُسے سائبیریا سے نکال لائے اور اپنے مشن پر پھر اسکو

نکولی لینن فرقۂ اقلیت یعنی نشویکوں کا لیڈر تھا - اور اگر سچ پوچھیے تو ٹراٹسکی اور لینن میں ربط مستند تھا، کیونکہ ایک نے دوسرے کے کاموں کو مکمل کیا - سیاسی و اقتصادی معاملا میں ایک نے دوسرے کو اپنے اصولوں سے بہت کچھ مدد پہونچائی - دونوں نے بولشویکوں کے دل میں اس بات کا یقین ڈال دیا کہ " اگر فوری کامیابی حاصل ہوسکے تو نہایت بے رحمی اور بغیر انجام کو سوچے ہوے اسکے حاصل کرنے پر آمادہ ہوجانا چاہیے "-

الغرض جب پیٹروگریڈ سے بولشویک انقلاب شروع ہوا تو وہ ٹراٹسکی ہی تھا جس نے جگہ جگہ پر انقلابیوں کو کمانڈ کیا، اُنکی ہمدردی کی، اُنکے دل بڑھائے، اُن کو لکچر سنائے، اُنکو امیدیں دلائیں اور کہا کہ " بس تمہارا امتحان ہوچکا، اب نتیجہ کے منتظر رہو "- یہ کام شاید لینن سے نہ ہوسکتا کیونکہ سوائے حکومت اور صدارت کے اس سے سپہ سالاری و لیڈری ناممکن تھی -

جب المانوی قیصریت[1] سے صلح ہوئی تو ٹراٹسکی سکرٹری امور خارجہ مقرر ہوا. شاید قیصریت کے خلاف جنگ قائم رہتی مگر ٹراٹسکی نے کھلے الفاظ میں لکھ[2] دیا کہ " جرمن معاشرتی انقلاب کے موقع پر قیصریت کے خلاف جہاد کرنا ایک وحشیانہ مہم ہوگی جس سے آیندہ انقلاب روس کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے "- اور اس کی یہ دوراندیشی اب تک بولشویکوں کے کام آرہی ہے -

البتہ جرمن صلح جو ۲۴ فروری ۱۹۱۸ء کو ہوئی اُسکے خلاف ٹراٹسکی نے پہلے ہی اپنی رائے ظاہر کردی تھی - باوجود صلح کے اہل جرمن پیٹروگریڈ پر بڑھتے چلے آرہے تھے - انکو روسیوں پر اعتماد نہ تھا - گو ٹراٹسکی کی ذات سے اُنکو کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا - زار نے جرمنی کو تباہ کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا تھا - اہل جرمن کے دلوں میں وہ رنجش قائم رہی - اس حالت کو دیکھ کر روسیوں نے مجبوراً ماسکو کو دارالصدر بنایا اور یہ تبدیلی بعینہ انکو اسکے دارالصدر ہونے سے مطابق ہے - آئے دن کے خطرات کو دفع کرنے کے لیے ایک بڑی فوج قائم کی گئی جسکا نام جیش احمر[3] رکھا گیا - عرصہ تک بالشویکوں نے اس قسم کی اسکیم سے اختلاف رکھا مگر جیش احمر نے تمام بیرونی خطرات کو دفع کردیا - اور اس بڑی فوج کے انتظام کا ذمہ دار بھی فدائے قوم ٹراٹسکی تھا -

---

[1] German Imperialism

[2] مشہور اخبار The Pravada

[3] Red Army

جب سنہ ۱۹۲۴ء میں لینن کی وفات ہوئی تو ٹراٹسکی اور چند بولشویک لیڈروں میں اختلاف پیدا ہوگیا - کیونکہ ٹراٹسکی کی بڑھتی ہوئی طاقت انکی نگاہوں میں کھٹکنے لگی۔ حتیٰ کہ جیش احمر کو ان لوگوں نے اپنے قبضے میں کر لیا - اسکے ایک ماہ بعد ٹراٹسکی نے ایک اعلان شایع کیا جس میں روسی فرقہ بندیوں کی غلطیاں ظاہر کی گئیں - اس اعلان کی وجہ سے بولشویک پھر کسی قدر چوکنے ہوگئے -

ٹراٹسکی عرصے تک انقلابی فوجی کونسل کا صدر رہا اور جیش احمر کا انتظام اسی کے ہاتھ میں رکھا گیا - اس کی ذات سے روسیوں کو اب تک بہت کچھ تقویت رہی اور ایسی ہی ہستیاں قوموں کے لیے رہنمائے ترقی ہوا کرتی ہیں -

آخر میں ٹراٹسکی کے چند نیم سیاسی و نیم معاشرتی مقالات پر نظر ڈالنا زیادہ مناسب ہے گا - اُس نے روسی عوام الناس سے بڑی ہمدردی ظاہر کی - اس نے اکثر کہا کہ غریب روسی قوم تاریخ میں بہت مفلس ہیں، مگر اس بات سے اُنکو بددل ہونے کی کوئی ضرورت نہیں - اُنکو چاہیے کہ محنت، مشقت، صفائی، تعلیم اور اوقات کی پابندی کو قومی بنیاد کا ذریعہ سمجھیں - اُس نے یہ بھی کہا کہ حکومت کو قوم کے ذاتی اور خاندانی معاملات میں دخل نہ دینا چاہیے ۔ اس سے خود حکومت کو بہت سے خطرات کا اندیشہ ہے - نوجوان طبقے کو خطاب کر کے کہا کہ جب انقلاب کامیاب و فتحمند ہو جائے اُسوقت دیوہ و شیری ہونا آسان ہے، خوبی تو انقلاب سے پہلے کچھ کر کے دکھانے میں ہے -

ٹراٹسکی کے اقوال ہر ہندوستانی بچے کو یاد ہونا چاہئیں ؎

شفقت اپنا شیوہ اور محنت اپنی عادت ہو
ہماری زندگی پابند قانونِ صداقت ہو
جو محنت کے نتائج ہیں اُنھیں پر ہو مدار اپنا
کہ محنت قومیت ہے، قومیت سے ہمکو قوت ہو
جو خود کر کے دکھاؤ گے اُسی میں ساری خوبی ہے
اُسے انساں نہ کہیے جو گدائے اہلِ دولت ہو

سید مقبول حسین - احمد پوری

چراغ سے چراغ

میرے لیے قیامِ حیدرآباد میں زندگی کے سکون آشنا لمحات وہی ہیں جو کشمکشِ حیات کے اس دورِ ابتلا میں وجدانِ صحیح اور ذوقِ سلیم رکھنے والے علم دوست احباب کی بدولت ہر صورت میسر آجاتے ہیں، انکی روحانی دلچسپیاں میری اجباری خستگی کے اوقات کو وقفۂ راحت میں تبدیل کردیتی ہیں، اور اگر اس سے کلیۃً مجھے محروم کردیا جائے تو میری موجودہ کشاکش آفریں لیل و نہار کسیر [illegible] اس مستقبل سوگوار کی صورت اختیار کرلیں، جو میری شخصیت کی تفضیح کے بعد ان اعزہ و احباب کیلیے نمونہ راز ہوگا، جن کو میری ذات سے خلوص و ہمدردی ہے، اور جن سے کبھی نہ کبھی انکا دوچار ہونا ضروری ہے۔ بہرحال دکن کی دنیا میں بھی میرے لیے التفات و محبت کی کمی نہیں، اور خوش ہوں کہ غربت میں بھی کچھ نہ کچھ لطفِ وطن حاصل ہو ہی جاتا ہے۔ خصوصاً حضرت حکیم آزاد انصاری کی شعری خلوص فرمائیاں تو میرے لیے نسخۂ راحت ہیں، جو نہایت متانت و سنجیدگی کے ساتھ ملک و ملت کی منظومانہ اصلاح میں مصروف ہیں۔ اور انتہائی سکون و اطمینان کے ساتھ اپنی حکیمانہ شاعری کا فطری استعمال فرما رہے ہیں۔ ایک غزل ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں، اور مسلسل فرماتے ہیں ؎

اس سمت بھی نظر ڈال اُس سمت بھی نظر ڈال — ہر چیز سے اثر لے، ہر چیز پہ اثر ڈال

بیکاریوں سے رغبت یک لخت ترک کر ڈال — طاقت نہیں مگر اُٹھ، عادت نہیں مگر ڈال

امدادِ ملک و ملت کر اور بے دھڑک کر — بنیادِ اوج و عزت ڈال اور بے خطر ڈال

ہر خطرہ کو مٹا کر، خوف و خطر بھگا کر — ہر روک کو ہٹا کر میدان صاف کر ڈال

ہاں عقدہ سخت لاحل لیکن کوئی جتن سوچ — ہاں کام سخت مشکل، لیکن کوئی ڈگر ڈال

دنیا بدل چکی ہے، تو بھی بس اب بدل جا — عالم نکھر چکا ہے تو بھی بس اب نکھر ڈال

ذرات کی چمک پر کب تک نثار ہیگا — اُٹھ اور اُٹھ کے یکدم ہاتھ آفتاب پر ڈال۔

آزاد گو جفائیں پامال کر کے چھوڑیں
لیکن فضائے عالم شورِ وفا سے بھر ڈال

مرحوم مولانا سلیم دوسرے شعر کی مرتے دم تک داد دیا کیے۔ میں آخری شعر پر پھڑک اٹھا، تو آزاد صاحب نے نہایت دیانتداری سے فرمایا کہ اسکی داد کے حقیقی مستحق مولانا عرفی ہیں۔ میں نے تو انکے شعر کا ترجمہ

کر دیا ہے ؎

ما و عنانِ تعلق بدست ہر ذرّہ | برآرد سے دیدۂ [illegible] [illegible] [illegible] انداز

نہ صرف یہی پہلا اتفاق ہے بلکہ اور بھی متعدد اساتذہ کے اشعار اُردو میں منتقل کیے ہیں۔ اسداللہ خاں غالب نے کہا ہے

آں راز کہ در سینہ نہان است نہ وعظ است | بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

آزاد کی اُردو غزل کا شعر ہے

بیانِ رازِ دل کی خواہشیں اور وہ بھی منبر پہ | خبر بھی ہے یہ باتیں دار پر کہنے کی باتیں ہیں

کسی کے فارسی قطعہ کا مشہور شعر ہے

از صحنِ خانہ تا لبِ بام از آنِ من | وز بامِ خانہ تا بہ ثریا از آنِ تو

آزاد کی تفریحی غزل "جہاں تمہارا، مکاں ہمارا" میں وارد ہے

صحنِ مکاں سے ہر شے تا حدِ بام میری | بامِ مکاں سے سب کچھ تا آسماں تمہارا

علامہ سر اقبال فرماتے ہیں

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم | ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت | ہستم اگر می روم گر نروم نیستم

آزاد کا اُردو قطعہ ملاحظہ فرمائیے

کسی کنارۂ ساکن نے بحر سے یہ کہا | اگرچہ خلق ہوئے مجھ کو مدتیں گزریں
مگر ہنوز عجب گو مگو کا عالم ہے | نہ زندگی ہے مسلّم نہ موت کا ہے یقیں
سنا جو موج نے لہرا کے یہ جواب دیا | اگر رواں ہوں تو زندہ کچھ نہیں تو نہیں

مولانا عرفی کی حمد میں مقبول ترین رباعی کس اہلِ دل اور صاحبِ ذوق کو یاد نہ ہوگی، اللہ اکبر ؎

فقیہاں دفترے را می پرستند | حرم جویاں درے را می پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد | کہ یاراں دیگرے را می پرستند

آزاد نے بھی برجستہ ترجمہ کیا ہے ؎

یہ دیواروں دروں کو پوجتا ہے | وہ انجیلوں صحیفوں کو پوجتا ہے
مناسب ہو تو اب پردہ اٹھا دے | کہ جو ہے دوسروں کو پوجتا ہے

حضرت سلطان ابو الخیر ابو سعید علیہ الرحمہ کی دو رباعیاں مع ترجمۂ آزاد حسب ذیل ہیں۔

رباعی حضرت ابو سعیدؒ

در کعبه اگر دل سوے غیر است ترا
سبحه زنار و کعبه دیر است ترا
ور دل بحق است و ساکنِ میکده
خوش باش که عاقبت بخیر است ترا

رباعی جناب آزاد انصاری

کعبے میں اگر دل ہے ترا مائلِ غیر
سبحہ ترا زنار ہے کعبہ ترا دیر
اور ہے جو خرابات میں بھی حق سے لگا
کچھ خوف نہ کر کہ عاقبت ہے بالخیر

ایضاً

نے باغ نہ بستان نہ چمن می خواہم
نے سرو نہ گل نہ یاسمن می خواہم
خواہم ز خداے خویش کنجے کہ دراں
من باشم و آں کسے کہ من می خواہم

ایضاً

ہم مائلِ دَیر اور نہ صنم طالب ہیں
ہم سائلِ حُور اور نہ ارم طالب ہیں
ہم ہیں اور صرف یہ تمناے دلی
ہم ہوں اور وہ کہ جس کے ہم طالب ہیں

مدت دراز کی بات ہے، جب میرا قیام بھوپال میں تھا تو مسٹر تاج الدین حیدر بیرسٹر ایٹ لا نے، جو وہاں صیغۂ جوڈیشل کے ایک اعلیٰ ترین عہدہ پر مامور تھے، اپنی رباعیاں سنائی تھیں، جو رباعیاتِ خیام کا لفظی ترجمہ تھیں۔ ایک دو نہیں، تقریباً تمام رباعیات کا ترجمہ مکمل ہو گیا تھا۔ اور خوبی یہ تھی کہ اُردو میں بھی چوتھے مصرعہ کی بالکل وہی طاقت قائم رکھی گئی تھی جو فارسی میں ہے۔ جو شخص سنتا تھا سر دُھنتا تھا۔ معلوم نہیں اجتماعی صورت میں وہ معرضِ اشاعت میں آئیں یا نہیں، منتشرہ صورت میں تو شاید ان کی نظر میں بھی اُن کا نمونہ شایع ہو چکا ہے۔ جناب آزاد نے بھی یہ سعی کی ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے ۳ رباعیاں درج کی جاتی ہیں

حکیم عمر خیام نیشاپوری

(۱)

دَورے کہ درو آمدن و رفتنِ ماست
آں را نہ بدایت نہ نہایت پیداست
کس می نزند دمے دریں معنی راست
کیں آمدن از کجا و رفتن بکجاست

حکیم آزاد سہارن پوری

(۱)

یہ دھر کہ اپنی آمد و شد ہے جہاں
ہے اُس کی بدایت بھی نہایت بھی نہاں
اے کاش کوئی یہ عقدہ حل کر سکتا
آتے ہیں کہاں سے اور جاتا ہے کہاں

(۲)

دریاب کہ از روح جدا خواہی رفت
در پردۂ اسرار فنا خواہی رفت

(۲)

جانا ہے تجھے یہاں سے ہاں جاتا ہے
آیا ہے تو بے شبہ گماں جاتا ہے

وہی ہم ہیں اور شغلِ بیکارِ عشق — وہی فرصتِ تام ہے اور بس
زمانہ ہے اور کوشش و جد و جہد — مگر ہم ہیں آرام ہے اور بس
نہ آزاد و میکش نہ شاہد پرست
وہ کمبخت بدنام ہے اور بس

خدا اس ضعیف العمر اور عدیم الصحت شاعر کو ادبِ اُردو کی خدمت کے لیے عرصۂ دراز تک تندرستی کے ساتھ زندہ رکھے۔ آمین۔

ارشد تھانوی

غزل

اپنی ہستی کو مٹا کر ترے در تک پہونچے — خاک ہو کر تو تری رہگذر تک پہونچے
نالہ وہ نالہ ہے اے دردِ شبِ تنہائی — دل سے نکلے اِدھر اور بابِ اثر تک پہونچے
خنجرِ ناز سے دل کا تو کیا قصہ پاک — سجدۂ شکر کروں بڑھ کے جو سر تک پہونچے
جلوہ گہ اُسکی کہاں دیدۂ بیتاب کہاں — شوق لیجائے بھی تو حدِ نظر تک پہونچے
ترچھی نظروں کی تو اے ترک نہیں کوئی سند — تیر ایسا تو ہو سیدھا جو جگر تک پہونچے
نیستی میری ہے شرمندۂ کنِ صد ہستی — خاک ہو پاک مری اُنکے جو در تک پہونچے
ضعف نے کر ہی دیا رازِ محبت افشا — ہاتھ اُٹھا کر نہ مرے دیدۂ تر تک پہونچے
وصل کی شب ہے نہ چھیڑ شبِ غم کا قصہ — بڑھتے بڑھتے نہ کہیں بات سحر تک پہونچے
میری قسمت کا چمک جائے ستارہ تجوید — اُنکی تلوار جو کھینچ کر مرے سر تک پہونچے

شہاب الدین احمد تجوید
(عظیم آبادی)

شریف آدمی کی سیرت

یہ کہنا کہ "وہ کسی کو ایذا نہیں پہونچاتا" تقریباً ایک شریف آدمی کی تعریف ہے۔ یہ تعریف اچھی ہی نہیں، بلکہ جہاں تک اس کا تعلق ہے، درست بھی ہے۔ وہ ہمیشہ اُن رکاوٹوں کے دور کرنے میں لگا رہتا ہے جو اُسکے ہمسایوں کے آزادانہ کام میں روڑے اٹکاتی ہیں۔ وہ اُنکے ساتھ متحد ہو کر کام کرتا ہے۔ خود کسی کام کی ابتدا نہیں کرتا۔ اسکی مہربانیاں ان آسائشی اشیاء کے برابر خیال کی جا سکتی ہیں جو انسان ذاتی طور پر اپنے آرام کے لیے مہیا کرتا ہے مثلاً آگ اور آرام کرسی جو سردی اور تھکن کو دُور کرتی ہیں۔ حالانکہ فطرت بغیر اُنکی امداد کے ہر متنفس کے لیے حرارت اور آرام پیدا کرتی ہے۔

اسی طرح سے ایک شریف آدمی اُن تمام باتوں سے پرہیز کرتا ہے جو اُسکے ہمجلیسوں کی دلآزاری کا باعث ہو سکتی ہیں۔ مثلاً خیالات کی مخالفت، قیود، بدگمانی، غصہ، ناراضی وغیرہ وغیرہ۔ اُسکی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہر شخص اُسکے پاس بے تکلف و بآرام رہے۔ وہ اپنے تمام دوستوں کو ایک نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ شرمیلے کے ساتھ نرمی، غیر شناسا یعنی (Distant) کے ساتھ شرافت اور بیہودہ کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرتا ہے۔ دورانِ گفتگو میں مخاطب کا ہر وقت خیال رکھتا ہے، اور کوئی ایسی بات نہیں اٹھاتا جو اشتعال انگیز اور برافروختہ کرنے والی ہو۔ گفتگو میں وہ کبھی نمایاں حصہ نہیں لیتا اور نہ زیادہ [illegible] جس سے سامع اُکتا جائے اور تنگ آجائے۔ وہ اُن مہربانیوں کو جو وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کرتا ہے کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اور جب کبھی وہ اُنہیں کچھ دیتا ہے تو اس انداز سے دیتا ہے گویا خود اُن سے کچھ لے رہا ہے۔ وہ اپنے متعلق کوئی بات نہیں کہتا تاوقتیکہ مجبور نہ ہو جائے۔ کسی کی بُرائی نہیں سنتا۔ غیروں کی مداخلت کو کسی خاص تجربہ یا مقصد کی طرف منسوب نہیں کرتا۔ اور ہر بات کی توضیح اُسکے بہترین پہلو سے کرتا ہے۔ وہ بحث کرتے وقت کمینی حرکتیں نہیں کرتا۔ بیجا فائدہ نہیں اُٹھاتا۔ ذاتی حملوں کو دلیل نہیں سمجھتا۔ اور کسی ایسی بُرائی کی طرف اشارہ نہیں کرتا جسکے بتانے کی اس میں ہمت نہ ہو۔ اپنی ہوشیاری اور دوراندیشی کی وجہ سے وہ بزرگوں کی اس کہاوت پر عمل کرتا ہے

کہ ہم کو اپنے دشمن کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا چاہیے گویا وہ ایک دن ہمارا دوست ہو جائیگا۔ وہ
اتنا سمجھدار ہوتا ہے کہ کسی کی بدزبانی سے چڑھ نہیں جاتا۔ اتنا مشغول رہتا ہے کہ نقصان
کو بھول جاتا ہے اور اتنا متحمل ہوتا ہے کہ کسی کے خلاف بغض اور کینہ نہیں رکھتا۔ وہ صابر
اور حلیم ہوتا ہے اور فلسفی اصولوں کی متابعت کرتا ہے وہ تکلیف کو برداشت کرتا ہے کیونکہ وہ ناگزیر ہے
کسی عزیز کی موت پر صبر کرتا ہے کہ وہ زندہ نہیں ہو سکتا اور اپنی موت کے
لیے آمادہ رہتا ہے کیونکہ یہ اسکی تقدیر ہے۔ اگر وہ کسی مباحثہ میں حصہ لیتا ہے تو اسکی تربیت یافتہ
عقل اسکو بداخلاق اور بے ادب ہو جانے سے بچاتی ہے۔ جیسے کہ بالعموم اس سے بہتر مگر
کم تعلیم یافتہ لوگوں کا دستور ہے کہ وہ کند ہتھیار کی طرح ٹھیک نہیں کاٹتے۔ دلیل کی باریکی
کو نہیں سمجھتے۔ معمولی باتوں پر بحث کرنے میں قوت ضایع کرتے ہیں۔ اپنے مخالف کا غلط اندازہ
لگاتے ہیں اور اصلی بحث کو اور زیادہ الجھا کر چھوڑ دیتے ہیں۔

اس کا ذاتی خیال خواہ درست ہو یا نہ ہو مگر وہ دوسروں کے ساتھ بے انصافی نہیں
کر سکتا۔ اسکی بات جس قدر موثر ہوتی ہے اسی قدر سادہ بھی ہوتی ہے۔ اور جتنی قطعی یعنی
(Decisive) اتنی ہی مختصر بھی ہوتی ہے۔ اس قدر صاف گوئی، غور و خوض اور
رواداری Indulgence ہم کہیں نہیں دیکھ سکتے۔ وہ اپنے مخالف کا اچھی طرح
اندازہ لگا لیتا ہے اور اسکی غلط فہمی کے اسباب معلوم کر لیتا ہے۔ وہ انسانی دماغ کی
کمزوریوں اور اسکی رسائی کی حد کو اچھی طرح جانتا ہے۔ چاہے وہ مذہب کا منکر ہی کیوں نہ ہو مگر اتنا
فراخ دل ہوتا ہے کہ اسکا مضحکہ نہیں اڑاتا اور اسکی مخالفت میں کوئی کام نہیں کرتا۔ وہ اتنا سمجھدار ہوتا
ہے کہ اپنے ملحدانہ خیالات کی وجہ سے متعصب نہیں ہوتا۔ وہ زہد اور عبادت کی تعظیم کرتا ہے اور ان مذہبی
اداروں کی حمایت کرتا ہے جنکو وہ خود تسلیم نہیں کرتا۔ وہ پادریوں کی عزت کرتا ہے اور مذہب
کے رموز و اسرار (Mysteries of Religion) پر حملہ نہیں کرتا بلکہ انکو پسند نہ کرنے
پر ہی اکتفا کرتا ہے۔ وہ مذہبی رواداری کا حامی ہے اس وجہ سے نہیں کہ اسکے فلسفہ نے
نے اسے ہر مذہب کو انصاف کی نظر سے دیکھنے کا سبق پڑھایا ہے بلکہ ان نیک احساسات
کی بنا پر جو تہذیب کے ہم رکاب چلتے ہیں۔

(ترجمہ از جے۔ ایچ۔ نیومین)

ہرسرنداس کمبوہ

ناسخ پر ظلم

جناب مدیر صاحب الناظر۔ تسلیم۔

جناب کے رسالہ میں گذشتہ ماہ دسمبر کی اشاعت میں ایک مضمون "ناسخ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جو مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا وکیل غازی آباد کے قلم سے ہے۔ مضمون مذکور کو پڑھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ہنوز ادب اردو میں صحیح تنقید کا مذاق پیدا نہیں ہوا۔ جناب ناسخ اردو غزل گوئی میں مسلم الثبوت استاد گزرے ہیں۔ آنکے کلام کے خاص خاص پہلوؤں پر اعتراض کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اسے گندہ یا سر تا سر عیوب قرار دینا میرے خیال میں زیادتی ہے۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ ناسخ پانچ سیر کھاتے تھے یا کچھ کم۔ اسی طرح آنکے دیگر سوانح زیست سے بھی جو تنہا صاحب نے تحریر فرمائے ہیں مجھے کوئی سروکار نہیں۔ بحث اس تبصرے سے ہے جو انکے کلام پر مولوی صاحب موصوف نے فرمایا ہے۔ ابتدا ہی میں تنہا صاحب ناسخ کے کلام کو بے مزہ اور ان کی تمام غزلیں پھیکی بتاتے ہیں۔ آپ نے اتنا بھی مناسب خیال نہ فرمایا کہ کسی ایک غزل کو مستثنیات سے قرار دیتے۔ فرماتے ہیں کہ کہیں کہیں ایک آدھ شعر [illegible] آتا ہے۔ میں جناب ناسخ کی ایک سادہ غزل درج کرتا ہوں اور جناب تنہا سے دریافت کرتا ہوں کہ اس غزل میں کیا ہر شعر بامزہ ہے یا ایک آدھ چھوڑ کر تمام۔

دیر کس کا کعبۂ مقصود ہے — بت اگر ہمسے [illegible] موجود ہے
ہے بجز انجامِ دل غم کیا — سوزِ فرقت آتشِ نمرود ہے
بت کبھی سجدے کرتے ہیں جسکے حضور — وہ مرا [illegible] خدا معبود ہے
سود کیا الماس کھا کر مر رہوں — زندگی ہجر میں بے سود ہے
جل رہا ہوں آہ میں کرتا نہیں — داغِ فرقت آتشِ بے دود ہے
کیا غرض چاہوں وفا سودا نہیں — دل جو دے ڈالا تجھے [illegible] ہے
ہے مرا مقصود حاصل ہر جگہ — ہر مقام اب منزلِ مقصود ہے
شعلہ ور ہوتے گئے داغِ فراق — دل ہمارا [illegible] ہے
سر جھکا ناسخ اسی کے سامنے — کیا بتائیں بت خدا معبود ہے

بخوفِ طوالت اور غزلیات درج نہیں کی جاتیں لیکن تنہا صاحب کے کلیہ کی تردید کے
لیے ایک ہی کافی ہے -

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ناسخ کے کلام میں مشکل الفاظ بہت پائے جاتے ہیں - یہ اعتراض صحیح ہے مگر یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس سے ناسخ کے پایۂ شاعری میں کوئی فرق نہیں آتا - عام شعراء کے یہاں بالعموم ایسا پایا جاتا ہے - اس سلسلہ میں جناب غالب کا نام لینا بے موقع نہ ہوگا جنھیں خود تنہا صاحب نے بہترین شاعر مانا ہے اور جنکی غزلیات میں مشکل الفاظ اور غریب بندشیں اس قدر ہیں کہ کسی دوسرے اُردو شاعر کے یہاں نہ ملیں گی -

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ ناسخ کے کلام میں حُسنِ بیان نہیں - مثال کے طور پر ناسخ کے دو اشعار درج کیے گئے ہیں

آج گو قبضے میں سارا ربع مسکوں ہوگیا
کل ہے اک دو گز زمیں رہنے کو بعد از قبضِ روح

موجبِ نقصاں ہوا جب ماہ کامل ہوگیا
کچھ بھی حاصل باکمالوں کو نہیں ہے جز زوال

معلوم نہیں کہ تنہا صاحب کو ان اشعار کے اندازِ بیان میں کیا نقص نظر آیا - اگر آپ پہلے شعر میں لفظ "اک" کی خوبی پر غور فرماتے اور دوسرے شعر میں لفظ "نقصان" کی جامعیت کو مدنظر رکھتے تو شاید آپ ان اشعار کو حُسنِ بیان سے خالی نہ پاتے - لیکن کوئی جائے تعجب نہیں - جو ناقد جناب حالی کے طرز ادا کا قائل ہو اُسے ناسخ کے ان اشعار میں حُسنِ بیان نظر نہ آنا بالکل فطری ہے -

چوتھے ضمن میں جناب تنہا ناسخ کے اشعار کا دیگر اساتذہ کے ہم مضمون اشعار سے مقابلہ کر کے ناسخ کے کلام کو پست قرار دیتے ہیں - مثلاً

ناسخ - فصلِ گُل ہے چار دن ایام توبہ ہیں مدام
عمر بھر لے میکشو باب اجابت باز ہے

داغ - مے پی تو سہی توبہ بھی ہو جائیگی زاہد
کمبخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی

آپ کے نزدیک شراب پینے کی ترغیب دوسرے شعر میں بہتر انداز سے ہے مگر آپ نے اس فرق پر دھیان نہ دیا کہ پہلے شعر میں روئے سخن میکشوں کی طرف ہے اور دوسرے میں زاہد کی طرف - کیا آپ کے نزدیک اگر جناب ناسخ میکشوں کو بھی کمبخت کہکر مخاطب کرتے تو لطفِ سخن المضاعف ہو جاتا - میکشوں کو زاہد کی طرح قیامت کا خیال کہاں - اُنھیں تو اسی عمر سے کام ہے - اسی لیے یہ کہا گیا کہ عمر بھر باب اجابت باز ہے -

ناسخ - جینا فراق کا نہیں ہرگز حساب میں
مدت ہوئی کہ مر چکے ہیں ہم حساب سے

غالب۔ کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں — شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

آپ فرماتے ہیں کہ ناسخ کا شعر بنیے کی طرح حساب کر کے بتلاتا ہے کہ بہت دنوں تک ہم فراق یار میں زندہ رہے - اگر اعتراض لفظ حساب کی وجہ سے ہے تو وہ دونوں اشعار میں موجود ہے - درازیٔ شب فرقت دونوں اشعار میں بیان کی گئی ہے - لیکن ناسخ کے یہاں یہ مزید لطف ہے کہ شب فرقت کی زیست کو موت کے مانند سمجھتے ہیں -

ناسخ۔ گزر گئے گلبن چمن میں رشک سے تیرے حضور — اب زرِ گل صاف تاروں کا خزانہ ہو گیا

آتش۔ زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف — قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

ہم تنہا صاحب سے متفق ہیں کہ آتش کا شعر بہتر ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ آتش کی جس غزل کا یہ شعر درج کیا گیا ہے وہ ناسخ کی چوٹ پر کہی گئی تھی - اور اسی لیے کوشش کر کے ناسخ کے مضمون کو بہتر طریقے سے ادا کیا گیا ہے - جن اصحاب نے "آب حیات" کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے کبھی منکر نہ ہونگے -

اس کے بعد ناسخ کے اشعار کا مقابلہ غالب اور مومن کے اشعار سے کیا گیا ہے - ان ہر دو شعرا کا طرز ادا بیشک زبان اردو میں لاجواب ہے لیکن بے عیب ذات خدا کی ہے - انکے یہاں ثقل و ابہام کے نقائص موجود ہیں - یہاں یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تنہا صاحب نے جو ذیل کے اشعار کا مقابلہ کیا ہے

ناسخ - کرتے ہیں آئینہ ساز آئینہ روشن خاک سے — مل گئے ہیں جو ہزاروں روئے روشن خاک میں

غالب - سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

اسکے عوض ناسخ کا یہ شعر مقابلہ میں رکھنے کے قابل تھا ،

ناسخ - ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں — اسلیے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا

سخن سنج اصحاب سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ غالب کا جو شعر درج کیا گیا ہے وہ انکا بہترین مطلع ہے - آخر میں ان اشعار کا مقابلہ کیا گیا ہے

ناسخ - مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا — طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

میر - اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے — دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

ناسخ کے مضمون کو جناب تنہا اس شعر کا مصداق فرماتے ہیں -

ہر بو الہوس نے حسن پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

خدا جانے مولوی صاحب کو ناسخ کے شعر میں بوالہوسی کی بو کہاں سے آ گئی - اس شعر کی بنا پر آپ

فرماتے ہیں کہ ناسخ نے ...... در اصل زبان اور شاعری کو نقصان پہنچایا۔" اگر تنہا صاحب
اس شاعری کے قائل ہیں کہ

ہاتھی کو کھڑا کیا کھڑا ہے　　لٹھے کو بڑا کیا بڑا ہے

تب تو کچھ کہنا ہی نہیں لیکن اگر مبالغہ شاعری میں جائز ہے تو ناسخ کا شعر اردو کے بہترین اشعار
سے ہے۔ کچھ روز ہوئے کہ پروفیسر فنگار (فارسی لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی) سے تنہا صاحب کے اس
اعتراض کا ذکر آیا، ہنس کر فرمایا کہ مولوی صاحب نے شاید مصرعوں کو دو لخت خیال فرمایا ہوگا
ورنہ گریباں کا قافیہ کسی اردو شاعر کے مطلع میں ایسا نہیں بندھا۔ اس شعر سے خفگی اس وجہ
سے ہے کہ ناسخ نے بلند الفاظ میں اپنے مفہوم کو کیوں ادا کیا۔ مگر تنہا صاحب نے ناسخ کے اس
مطلع سر دیوان کے جواب میں میر کا شعر لکھتے وقت یہ خیال نہ فرمایا کہ میر صاحب سوز فرقت کو
اپنے مطلع سر دیوان میں کیونکر بیان کرتے ہیں

ہنگامہ گرم کن جو دل ناصبور تھا　　پیدا ہر ایک نالہ سے شور نشور تھا

کیا اس میں بھی تنہا صاحب کے نزدیک اثر مفقود ہے اور کیا اس سے میر کی بوالہوسی ٹپکتی ہے۔
پانچواں اعتراض یہ ہے کہ ناسخ کے گیارہ ہزار اشعار میں صرف ٢٠ شعر بمشکل قابل
انتخاب مل سکے ہیں۔ افسوس کہ تنہا صاحب نے شاعر ممدوح کے کلام کو متعصب نظروں سے
دیکھا، ورنہ دونوں دیوانوں میں سیکڑوں اشعار ایسے ملتے جو دل پر نشتر کا کام کرتے ہیں۔
آپ کا یہ دعوے کہ ان بہتر[٢] اشعار کے علاوہ جو آپ نے نقل کیے ہیں مشکل سے ٢٧، اور اشعار
قابل انتخاب ملیں گے، محض باطل ہے۔ بخوف طوالت آخر میں صرف ردیف الف کے ٢
منتخب اشعار درج کیے گئے ہیں۔ سخن فہم حضرات خود انصاف کر لیں گے۔
چھٹا اعتراض صاف الفاظ میں نہیں کیا گیا، ناسخ کے چند اشعار لکھ کر ناظرین کے
ذوق سخن فہمی پر چھوڑ دیے گئے ہیں کہ آیا ان اشعار کا مصنف شاعر کہلانے کے قابل ہے یا نہیں
ان اشعار میں چونکہ لفظی صنایع ہیں اسی لیے شاید مولوی صاحب بیزار ہو گئے۔ بہرحال اگر آپ
اپنے اعتراض کو واضح کرتے تو کچھ سمجھ میں آتا۔ مگر آپ نے یہ زحمت گوارا نہیں فرمائی۔
ساتویں اعتراض میں آپ ناسخ کے تشبیہات و استعارات کو مضموں آفرینی اور بلند خیالی
سے خالی بتاتے ہیں اور چند اشعار اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن کوئی سخن فہم ان میں سے
بیشتر اشعار پڑھ کر بغیر لطف اٹھائے نہیں رہ سکتا۔ پہلا ہی شعر لیجیے

وہ کون جا ہے جہاں چاہ زیر کاہ نہیں — سوائے مکر زمانہ میں رسم و راہ نہیں

حقیقت میں ناسخ مرحوم نے محاورہ کو اس خوبی سے باندھا ہے کہ اس سے بہتر باندھنا مشکل ہے۔ شکایت زمانہ نہایت موثر الفاظ میں کی ہے۔ مضمون بھی مطلع میں ادا کیا ہے۔ پھر بھی تنہا صاحب کو پسند نہ آئے تو ناسخ را چہ گناہ۔

آٹھواں اعتراض ناسخ کی تلازمہ بندی پر ہے۔ چونکہ اس میں تنہا صاحب کے نزدیک برجستگی نہیں پائی جاتی۔ جناب تنہا چونکہ خود غزل گوئی سے دلچسپی نہیں رکھتے اس لیے شاید اُنھیں یہ خیال ہوگیا ہے کہ تلازمہ زبردستی ٹھونسا گیا ہے۔ لیکن ناسخ کے خمیر میں جوہر شاعری تھا۔ وہ سیدھی بات کہنا جانتے ہی نہ تھے۔ بلاشبہ یہ اُن کی خصوصیت ہے اور اس پر لکھنؤ والوں کو فخر ہے۔ ہمارے نزدیک یہ شاعری نہیں:—

اے آدم زاد سر تمھارا — دونوں کونوں کے درمیاں ہے

آخری شعر جو اس ضمن میں آپ نے تحریر فرمایا ہے وہ ملاحظہ ہو

زاہدا کفر ہے بس عشق بت سنگیں کا — بت پرستی ہے مری اور خدا شنا ہے

مولوی صاحب اگر پہلے مصرعہ کے آخری ٹکڑے کو انصاف کی نظر سے دیکھتے اور بالخصوص لفظ "اور" کے محل استعمال کو غور فرماتے تو بغیر داد دیے نہ رہ سکتے۔ لیکن اگر اُنھوں نے ناسخ کے کلام کی داد نہ دینے کا عہد کرلیا ہے تو مجبوری ہے۔ ایک اور شعر لیجیے

دھیان آیا ہے تجھے کس کے لب شیریں کا — آج ہوتا ہے دلا درد جو میٹھا میٹھا

شاید یہ آپ کو اس لیے ناپسند ہے کہ لب شیریں کے لیے کڑوا کیوں نہیں آیا۔ کیوں صاحب اگر ناسخ یہ کہتا کہ اے دل یہ میٹھا میٹھا درد جو اُٹھا ہے یہ کس کے خیال سے اُٹھا، تب آپ کچھ نہ کہتے بلکہ تعریف کرتے۔ لیکن اس بیچارہ کا قصور یہ ہے کہ لب شیریں کا لفظ استعمال کرکے لطف دوبالا کیوں کردیا۔ کیا کہیں۔ بباید گریست۔

اس ضمن کے آخر میں تنہا صاحب جو عبارت تحریر فرماتے ہیں اُس سے یہ حقیقت بے نقاب ہوجاتی ہے کہ ناسخ پر اتنے اعتراضات کرنے کی علت ثانی دلی کی جانب داری ہے۔ چونکہ تنہا صاحب کا تعلق بیشتر دلی والوں سے رہا ہے اس لیے عام روش کے بموجب لکھنؤ کے ایک مشہور شاعر پر اعتراض کرنا فرض منصبی تھا۔ فرماتے ہیں کہ

"تلازمہ نہ صرف ناسخ کے دیوان میں بکثرت پایا جاتا ہے بلکہ شعرائے لکھنؤ کا عام شیوہ

یہی ہے یوں تو اب اہلِ زمانہ ایسے تلازموں سے عام طور پر نفور ہیں لیکن دلی والوں نے کبھی اسے
ہنر نہیں سمجھا۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ جن کو مضمون نہ سوجھے وہ اس پر اپنے شعر کی بنیاد رکھیں،
اور جن کو قدرت نے حسن ادا، حسن بیان عطا فرمایا ہے وہ کیوں اس لغویت میں مبتلا ہوں۔"
سبحان اللہ "لغویت" نے یہاں بہت لطف دیا ہے۔ بیشک انگور کھٹے ہیں۔ دلی اور لکھنؤ کی بحث
میں پڑنا اب بے سود ہے۔ اردو کا مرکز حیدرآباد ہو چکا۔ اب گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ۔
لکھنؤ والوں کو تنہا صاحب کے نزدیک مضمون نہیں سوجھتے اس لیے وہ تلازمہ بندی کرتے ہیں گویا
تلازمہ بندی اور مضمون آفرینی ساتھ ساتھ غیر ممکن ہے۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ آتش،
رند، انیس، دبیر، نسیم وغیرہ کو جانے دیجیے، ان پر تو مضمون آفرین نہ ہونے کا الزام لگانا تف
بر روئے آسمان کرنا ہے۔ اگر اسی صدی کے شعراء پر نظر ڈالی جائے تو عزیز، صفی، چکبست مرحوم،
محشر اور ثاقب کا کلام تنہا صاحب کے اعتراض کا جواب شافی ہے۔

نویں اعتراض میں تنہا صاحب نے ناسخ کے دو متروکات کا ذکر کیا ہے۔ اول تو زور
بمعنی بہت، دوسرے کاندھا بمعنی کندھا۔ دوسرے لفظ پر اعتراض فضول ہے۔ لکھنؤ میں آج تک
کاندھا دینا بولتے ہیں۔ یوں تو کندھا کہتے ہیں مگر جنازہ کے لیے کاندھا دینا ہی مستعمل ہے۔ رہا لفظ
زور، ناسخ کے ہزارہا اشعار میں صرف یہی لفظ مولوی صاحب کو قابلِ اعتراض مل سکا۔ اور میرا
دعویٰ ہے کہ وہ کوشش کرکے بھی چار سے زیادہ متروکات دونوں دیوان میں نہیں نکال سکتے۔ میرے
خیال میں یہ اعتراض اس غرض سے کیا گیا ہے کہ ناسخ کی جانب سے یہ عام اعتقاد جاتا رہے
کہ انھوں نے زبان کو صاف کیا ہے اور اردو پر کوئی احسان کیا ہے۔ لیکن جادو وہ جو
سر پہ چڑھ کے بولے۔ آخر میں خود جناب ناقد نے اس امر کا اعتراف کیا ہے۔

دسواں اعتراض ناسخ کے رکیک اشعار پر ہے۔ یہ اعتراض ناسخ پر نہیں بلکہ تمام اردو شاعری
پر ہے۔ دلی کے مشہور شعراء مومن اور داغ کے یہاں (جنکا کلام تنہا صاحب نے فخریہ پیش کیا ہی)
یہ عیب بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ ولی کے وقت سے لیکر گذشتہ صدی کے آخر تک سوا
معدودے چند شعراء کے سب کا دامن اس داغ سے آلودہ ہے۔

گیارھواں اعتراض ناسخ پر یہ ہے کہ انھوں نے سنگلاخ زمینوں میں غزلیں کیوں کہیں۔ کیا
خوب۔ جسکو تو عیب سمجھتا ہے وہ جوہر ہے مرا۔ تنہا صاحب کے نزدیک نقص شاعری ہے۔
اگر آپ یہ دکھلاتے کہ سنگلاخ زمین میں کہنے کی وجہ سے ناسخ ادائے مضمون میں قاصر رہ گئے تب تو ایک

خاتمہ بالشر اس عبارت پر کرتے ہیں کہ ناسخ کے اشعار میں جو باتیں نہ پائی جائیں وہ شعر کی خوبیاں ہیں، تو کوئی دقیقہ باقی نہیں رہ جاتا۔ آپ کا مضمون کسی حیثیت سے تنقید نہیں کہا جا سکتا اور جس لفظ کا اس پر اطلاق ہو سکتا ہے وہ آپ کے مضمون میں موجود ہے چونکہ مضمون طویل ہو جانے کا اندیشہ ہے لہذا ناسخ کے اشعار کا مقابلہ دیگر شعراء کے اشعار سے نہیں کیا جا سکتا (ردیف الف سے ناسخ کے بہتر اشعار علاوہ اُنکے جو تنہا صاحب کے انتخاب میں آئے ہیں)

۱- سیہ خانہ مرا روشن ہوا ویران ہونے سے
کیا دیوار کے رخنوں نے یاں عالم چراغاں کا

۲- پیری میں کیسے زیست کی امید ہے ناسخ
ناداں کوئی جھونکا ہے نسیم سحری کا

۳- نام رکعت ہے کہیں لغزش مستانہ کہیں
نہیں شغل حرم و خانۂ خمار جدا

۴- کہتے ہیں زاہد مری دیوانگی کو دیکھ کر
بت پرستی کے سبب قہر خدا نازل ہوا

۵- جب تصور یار کا باندھا ہم آپ آئے نظر
سامنے آنکھوں کے آئینہ ہمارا دل ہوا

۶- خود بخود ہوتا ہے پرزے آتے ہی فصل بہار
یاں گریباں لے جنوں گل کا گریباں ہو گیا

۷- راز پوشی میں ہوا ناسخ مجھے ایسا کمال
یار بھی ہرگز نہ میرے عشق سے محرم ہوا

۸- پاک طینت جو کہ ہیں ان سے تعلق دور ہے
خار سے کیا الجھے گوشہ چادر مہتاب کا

۹- جور اعدا پہ بھی کر سکتا نہیں ترک وطن
دھیان آتا ہے جو ناسخ فرقت احباب کا

۱۰- دل سے لوں گا میں کام رہبر کا
کیا پتہ چاہیے ترے گھر کا

۱۱- جو ہیں حسین انکو ہے نفرت جہان سے
ہوتا نہیں ادھر کبھی رخ آفتاب کا

۱۲- کیوں فکر عمارت ہے دنیا میں تجھے ناسخ
ویرانے میں گھر کوئی تعمیر نہیں کرتا

۱۳- سخاوت جسکو کہتے ہیں کہانی ہے زمانہ میں
بخیلوں کی بدولت رہ گیا ہے نام حاتم کا

۱۴- رات اپنا انتظار یار میں بیتاب تھا
بستر گل پر نہ تھا میں آگ پر سیماب تھا

۱۵- گر مے نہیں تو صوم ہے مستی صلوٰۃ ہے
ورنہ یہاں بھی شغل ہے صوم و صلوٰۃ کا

۱۶- تو نے آنکھیں پھیر لیں یاں کام آخر ہو گیا
طائر جاں پائے بند رشتۂ نظارہ تھا

۱۷- خون سب جاتا رہا دل سے عذاب ہجر کا
نقد جاں دینا گناہ عشق کا کفارہ تھا

۱۸- نجات ہو گی عذاب حساب سے سب کو
جو پہلے روز قیامت مرا حساب ہوا

۱۹- سمجھے تھے بعد فنا پائیں گے راحت ناسخ
حشر تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

۲۰- ملاقات دو روزہ کو یہاں آئے تھے ہم لیکن
سرائے دہر کو سب نے مقام [illegible] ٹھیرایا

۲۱- ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس جا
اس لیے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا

۲۲ - ہم ضعیفوں کو کہاں آمد و شد کی طاقت / آنکھ کی بند ہوا کو [illegible] پیدا

۲۳ - صدمہ دل کو جو ہوا نالۂ سوزاں نکلا / جس طرح سنگ سے ہو آتش پنہاں پیدا

۲۴ - آدمی پر ہے تعلق کو جہاں میں سبقت / بید کانٹوں کے ہوا گوشۂ داماں پیدا

۲۵ - تری ہی رہگذر میں گبر و مومن کرتے ہیں سجدے / ترے نقش قدم سے ہو گئے دیر و حرم پیدا

۲۶ - عیاں ہے ہر حباب دہر سے کیفیت دنیا / ہوئے چشم حباب میں ہزاروں جام جم پیدا

۲۷ - بس میں ہوتا نہ پرائے میں کبھی اے ناسخ / آہ میرا مرے قابو میں اگر دل ہوتا

۲۸ - کون ہے جسکو نہیں امر مباح عصمت کی پناہ / گھر میں بیٹھے بیٹھے اک نامرئی دل [illegible]

۲۹ - فصل گل میں بھی نہ زندان تعلق سے چھٹا / ناتوانی سے مرا طوق گریباں رہ گیا

۳۰ - کھلے دروازے ہر شب چمن سے سوتے ہیں ہم جب / دیا ہے خانۂ ویراں کو عہدہ پاسبانی کا

۳۱ - جو دل ہی ٹوٹ گیا کیا ہوں شعر تر پیدا / ہوئے ہیں شانۂ شکستہ سے کب ثمر پیدا

۳۲ - وہ نخل باغ جہاں میں ہوں میں کہ جو بے برگ ہے / ہر ایک شاخ پہ دستۂ تبر پیدا

۳۳ - کیا ہے آتش غم نے مرا یہ خشک لہو / کہ مثل سنگ رگوں میں ہوئے شرر پیدا

۳۴ یہ سرکشی سے ہے افتادگی کی قدر بلند / کہ آگ سے ہوئے جن خاک سے بشر پیدا

۳۵ (نعتیہ) بنا ہے خاک سے یوں آپ کا تن پرنور / کہ جیسے ہو شب تاریک سے سحر پیدا

۳۶ - بلا ہے چشم ہے حسن اور فتنہ آفت گوش / کریں وہ چین ہوئے ہیں جو کور و کر پیدا

۳۷ - خدا کے کام کچھ آلات پر نہیں موقوف / ابوالبشر ہوئے بے مادر و پدر پیدا

۳۸ - رنگ عشرت باغ عالم میں نظر آتا نہیں / گل کو گلچیں کا خطر بلبل کو غم صیاد کا

۳۹ - آتی ہے نا فہم بالا ئے [illegible] سوزن / آستاں کو بھی میں لیکن کبھی سائل نہ ہوا

۴۰ - ہے عجب راہ عدم بھی جو چلا اس راہ میں / اک قدم میں پیش قدموں کے [illegible] ہو گیا

۴۱ - فرقت ساقی میں ایسے بنگئے ہم پارسا / محو خاطر سے خیال جام و مینا ہو گیا

۴۲ - جب مرے دل کو اضطراب ہوا / سارے عالم میں انقلاب ہوا

۴۳ - رحمت حق ہے سبب میری گنہگاری کا / [illegible] کا

۴۴ - جھک جھک کے شیشے ملتے ہیں ہنس ہنس کے جام / یہ میکدہ مقام نہیں ہے غرور کا

۴۵ ایسا کوئی گناہ ہم زمانے میں نہ ہوگا / کم ہو وہ نہیں جسے کہتے [illegible] ہمارا

۴۶ - ناسخ کہیں جلد آ کے کہے قاصد جاناں / خط لیجیے دلوائیے انعام ہمارا

۴۷- ہوگیا جوش جنوں چلنے لگی بادِ بہار
لالۂ نو دیکھ کر داغِ کہن یاد آگیا

۴۸- آج مجھکو دشتِ وحشت میں وطن یاد آگیا
بوے گُل کو دیکھ کر بادِ چمن یاد آگیا

۴۹- او محتسب سمجھ کے تو شیشہ کو توڑیو
دل بھی نہ ٹوٹ جائے کسی بادہ خوار کا

۵۰- ساقی شراب صاف کی تاثیر دیکھنا
جامِ سفال ساغرِ بلّور ہوگیا

۵۱- یوں ہو کے سبکدوش جو چلنے کو ہو تیار
کچھ تو کہو تا سمجھ کہ ارادہ ہے کہاں کا

۵۲- انتظار یار میں دن رات رہتا ہے کھلا
نقشہ ہے دروازہ میرے دیدۂ بیدار کا

۵۳- سفر چلے ہیں تو اب سب مل ہیں لے آج
خدا ہی جانے کہ جانا ہو اب کہاں اپنا

۵۴- ہے اصل ایک میں عاشق ہوا ہوں تو معشوق
مرا خطاب جدا ہے ترا خطاب جدا

۵۵- یہ لال لال بھلا نشہ کے کہاں ڈورے
تمہاری آنکھیں جدا دیدۂ غزال جدا

۵۶- کسی کو معلوم ہوتی نہیں شب کی سی آسائش
مجھے پیری میں یاد آئے نہ کیوں عالم جوانی کا

۵۷- اس سے بہتر ہے کہیں عریاں پھرا کرتے جنوں
جامۂ ہستی نہایت اب پرانا ہوگیا

۵۸- مر رہا تھا آپ میں ناحق ہوا بدنام تو
اونگھتے کو ٹھیلتے کا اک بہانہ ہوگیا

۵۹- جو نمک تجھ میں ہے کہاں اُس میں
کیوں نہ پھیکا ہو رنگ سونے کا

۶۰- چشم بے نور ہو گئی پُرنور
کیا وہ یوسف جمال آ پہونچا

۶۱- ہے میکشو یہ حال مرے روح و جسم کا
وہ ہوگئی شراب یہ میخانہ ہوگیا

۶۲- کرتے ہیں تم کو دیکھ کے سجدے تمام بُت
مسجد تمہارے عہد میں بتخانہ ہوگیا

۶۳- بھول تلخی بھی اگر یاد نہیں شیرینی
نوش کا شکر نہیں تو گلۂ نیش ہے کیا

۶۴- انسان کو انسان سے کینہ نہیں اچھا
جس سینے میں کینہ ہو وہ سینہ نہیں اچھا

۶۵- گھر مرا فرقت میں سُونا ہوگیا
کُنجِ مرقد کا نمونہ ہوگیا

۶۶- آ گئے تھے امید وصل اب ہم ہجر
غم ترے آنے سے دونا ہوگیا

۶۷- تو جو دم بھر نہ مرے پاس ہوا
جی مرا جینے سے اُداس ہوا

۶۸- ہجر میں بجلی کی تلوار دکھاتی ہے مجھے
آج مانند فلک ہو گئی خونخوار گھٹا

۶۹- جھومتی آتی ہے متوالی گھٹا
ہے سیہ مست آج کی کالی گھٹا

۷۰- کیا فراق یار کو آتے ہیں نحو انقلاب
جب خوشی آئی مرے دل میں اُسے غم کر دیا

۷۱- مری آنکھوں سے کیا نسبت کہ قطرہ ابر نیساں کا
دُرِ نایاب ہو سکتا ہے آنسو ہو نہیں سکتا

۲۷- گدائے کو جو کیا دروشِ صحرا گرد کے آگے　　کوئی کُتّا کبھی وحشت کے آہو ہو نہیں سکتا

جن اشعار میں نازک تشبیہات تھیں وہ تہذیب صاحب کے خوف سے درج نہیں کیے گئے۔

خادم احسن لکھنوی

غزل

دعوتِ سعیِ عمل دیتی ہے ہر مشکل مجھے　　خضرِ منزل ہے خیالِ دوریِ منزل مجھے

اضطرابِ دل ہے تمہیدِ سکونِ دل مجھے　　اب وہ عالم ہے کہ ہر اک موج ہے ساحل مجھے

ایک شوقِ مضطرب ہوں ایک جوشِ مستقل　　کر دیا ہے ذوقِ الفت نے سراپا دل مجھے

آفریں صد آفریں ذوقِ فریبِ جستجو　　ذرے ذرے میں نظر آنے لگی منزل مجھے

جنبشِ ہر موج پیغامِ فنا دینے لگی　　دے رہا اب دھوکا فریبِ حسرتِ ساحل مجھے

غم کی فطرت ہی بدل دی غم پسندی نے مری　　کوئی مشکل اب نظر آتی نہیں مشکل مجھے

دو قدم کا فاصلہ ہے بس یہی کہتا ہوا　　لے گیا کوسوں فریبِ حسرتِ منزل مجھے

جمع اک مرکز پہ کر لوں روح کی سب قوتیں　　آج ہے منظور شرحِ اضطرابِ دل مجھے

کر چکا ہوں طے مذاقِ دید کی سب منزلیں　　کیا حجابِ حسن ہوگا پردۂ محمل مجھے

موجِ طوفانِ فنا تیرے کرم کا شکریہ　　کر گئی تو بے نیازِ حسرتِ ساحل مجھے

رنگ لائی داغہائے اشکِ خونیں کی بہار　　ہے قفس میں لطفِ گلگشتِ چمن حاصل مجھے

ہوں کرم پروردۂ آغوشِ طوفانِ فنا　　موج ہے کشتی مجھے گرداب ہے ساحل مجھے

فیضِ حسنِ بے تماشا عام ہے لیکن رضی
خود مرا ذوقِ نظر ہے پردۂ حائل مجھے

رضی بدایونی

طلباء کی زندگی کا ایک ورق

ہم دونوں میں گہری دوستی تھی - ایک جان دو قالب
میں اُن سے ملنا چاہتا تھا، وہ مجھ سے -
کا مضمون تو نہ تھا، مگر اتنا جانتے ہیں کہ ہم دونوں میں ایسی اُلفت تھی کہ جب تک ہم وہ ملتے رہے
اسکا کچھ خیال تک نہ کیا کہ ہم میں اُن میں الفت ہے - اکثر چشمک ہو جاتی، مگر خیر سے ہو جاتا - حالانکہ
مزا اُسی چشمک میں اُسی رنجش میں آتا تھا - ہم ایسی باتیں دوسروں سے مخاطب ہو کر کرتے کہ وہ سنیں
اور ہماری طرف دیکھیں - وہ مسکرائیں - وہ مسکراتے اور ہمارا دل خوش ہو جاتا - باغ باغ ہو جاتا
گویا ہم نے کوئی لمبی مہم سر کی - اسی طرح ہم دونوں ۳ سال تک ساتھ ساتھ ایک ہی کمرے میں رہے
ایک ہی جگہ رہے، لیکن کبھی یہ نہ سمجھے کہ آپس میں محبت ہے -

میں نے کسی رشک و حسد کی بنا پر اُنکی شکایت اپنے بورڈنگ کے وارڈن سے نہ کی - بلکہ یہ
سوچ کر کہ ممکن ہے وارڈن کی تاکید سے وہ سیر و تفریح سے باز آئیں اور ہمہ تن کتب بینی میں مصروف
ہو جائیں کہ امتحان میں کامیاب ہو جائے -
وہ یہ سمجھے کہ میں نے اُنکی شکایت کی محض اس غرض سے کہ اُس پر وارڈن صاحب خفا ہوں
ناراض ہوں - میں نے بہت کچھ عذر و معذرت کی لیکن وہ نہ مانا - اور مجھ سے بولنا چھوڑ دیا - مگر میں
ابھی تک وہی پرانی طرح کی چشمک سمجھتا رہا -

روزے آ گئے . وہ تو خدا کے فضل سے کبھی رکھتے ہی نہیں، مگر میں نے بھی کم رکھے - کیونکہ
امتحان کا زمانہ آ گیا تھا - روزوں کے زمانہ ہی میں امتحان اور پھر کون امتحان - انٹرنس کا امتحان
شروع ہونے والا تھا - وہ تو نہیں، مگر میں اگر جان توڑ کر محنت کرنا نہ کہیے تو بھی کافی محنت
کر رہا تھا - مگر وہ اس مرتبہ ایسے مجھ سے ناراض سے رہے کہ میری تمام کوششیں اُنکو اپنی طرف
راغب کرنے کی - رائیگاں جاتی تھیں - آخر کار میں بھی تھک گیا اور خاموش سا ہو رہا - مگر میرے دل
میں سکون تھا اسی بھی اور گھبراہٹ نہ تھی -

امتحان کے دو تین روز باقی ہیں، اور اب کیفیت یہ ہے کہ میں اُن سے بولنا چاہتا ہوں
اور وہ مجھ سے، مگر پہل کس طرح کریں، اور کون کرے - امتحان کے ہال میں اتفاق کہیے یا میری
خوش قسمتی کہ میری اُنکی نشستیں قریب قریب پڑیں - میں ڈرائنگ لیے ہوئے تھا اور وہ مولانا تھے

بینے فارسی لیے ہوئے تھے۔ یقیناً میری بدقسمتی تھی، کیونکہ اُنھوں نے قلم جھٹکا اور روشنائی کے
دھبوں سے میری تیار کی ہوئی تصویر بالکل ملیامیٹ ہو گئی۔ میں چیخ اُٹھنے کے قریب تھا، کیونکہ اب
بقیہ ۵ منٹ میں کیا ہو سکتا تھا۔ میری خشمگیں نگاہیں اُنکے چہرے پر پڑیں۔ اُنکا چہرہ فق ہو گیا۔ مجھ
سے معافی مانگنے کے لیے اُنکے پاس الفاظ نہ تھے۔ وہ بولنا چاہتے تھے مگر بول نہ سکتے تھے۔ اُنکی
نگاہوں سے البتہ ایک قسم کی التجا، ڈر، اور شرمندگی ظاہر ہو رہی تھی۔ میں بھی کچھ نہ بول سکا، کیونکہ
ایک طرف تو دل میں یہ خوشی کی لہر سی دوڑتی تھی کہ اب اُن سے بولنے کا موقع ہے اور وہ
جواب دیں گے اور ضرور دیں گے۔ دوسری طرف اپنی تین گھنٹہ کی محنت اکارت دیکھ کر کچھ تو
پریشان اور سراسیمہ ہوتا تھا کہ اب کیا ہو سکتا ہے، اور کچھ غصہ آتا تھا کہ مار بیٹھوں مگر جہاں اُنکی
طرف نگاہ اُٹھائی بس اُن سے بولنے کو جی چاہتا تھا۔ آخر کار مجھ سے نہ رہا گیا اور بول اُٹھا
کہ "جناب نے یہ کیا کیا؟" اُنھوں نے اس گھبراہٹ اور اس ادا سے شرما کے آبدیدہ ہو کے سر جھکا لیا
اور اُنکے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ میں اپنے سوال پر خود شرمندہ ہو گیا۔ غالباً یہ سوچ کر کہ دوسرے پرچے کے
نمبروں سے پاس ہو جاؤں گا ورنہ میں اب بھی کہتا ہوں کہ اپنے دوست کے لیے میں کیا کچھ کر گزرتا۔
وہاں سے واپس آنے کے بعد نہ میں نے اُس کا کسی سے تذکرہ کیا نہ اُنھوں نے کسی سے۔ میں نے
اس خیال اور اس امید سے کہ دوسرا پرچہ اچھا ہو جائیگا اور اُنھوں نے یا تو زیادتی شرم کی وجہ سے
یا اس خیال سے کہ مبادا اُنکے دوست اُن پر لعنت ملامت کریں کہ مجھ سے معافی مانگنے کے لیے
کہیں۔ ہم دونوں کمرے میں اس طرح آئے کہ گویا ایک دوسرے سے بالکل ہی ناآشنا ہیں۔ ایک
دوسرے سے منہ پھیرے ہوئے۔ اُنکی تو غالباً ہمت نہ پڑتی ہوگی، اور میں اس خیال سے کہ مجھ کو
دیکھ کر وہ شرما نہ جائیں۔

امتحان ختم ہو گیا۔ میرا ڈرائنگ کا دوسرا پرچہ اچھا ہو گیا۔ میں خوش اور وہ بھی خوش تھے
مگر خوشی کو دل میں چھپائے ہوئے ہم دونوں اپنے وطن روانہ ہوئے۔

لیکن عید آگئی۔ غالباً وہ چاند دیکھ کر گھبرا گئے ہونگے شاید یہ سمجھ کر کہ مجھ سے ملنا نہ پڑے اور
عیدگاہ گھبراتے گئے ہونگے کہ شاید میں نظر نہ آؤں۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ عید کی اور
میں اپنے چند کلاس فیلوں کو جو میرے گھر کے قریب ہی رہتے تھے لیکر اُنکے مکان کی طرف روانہ ہوا
یہ ظاہر کرکے کہ گویا میں خاص کر اُن سے ملنے نہیں جا رہا ہوں۔ حالانکہ میرے دوست کہہ رہے تھے
کہ چلو آج تمھیں اُن سے عید ملوا دیں۔ میں ہنس کر ٹال [illegible] حالانکہ پتا تھا کہ [illegible]

ایسا کریں بھی۔

خیر قصہ مختصر اُنکے گھر پہونچے۔ آواز دی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ نکلے۔ میں بظاہر تو مسکراتا رہا، لیکن دل میں ایک ہیجان سا پیدا ہوگیا۔ وہ میری صورت دیکھتے ہی پریشان تو نہیں لیکن گھبرا سے گئے۔ سب سے جب عید مل چکے تو میرے دوستوں کے کہنے کی ضرورت بھی نہیں پڑی اور رسمی طور پر وہ میری طرف بڑھے۔ لیکن اس انداز سے جیسے کوئی خیال نہیں ہے۔ رسماً ہم دونوں ملے۔ اُف کچھ نہ پوچھو ہمارے دلوں کی اُس وقت کیا حالت تھی۔ نکلے جا رہے تھے۔ ہم دونوں خوب بھینچکر نہیں ملے تب بھی میں نے معلوم کر لیا کہ اُنکا دل بھی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مگر شاباش ہے اُسکو کہ بولا مطلق نہیں۔ حالانکہ آنکھوں ہی آنکھوں میں سب کچھ کہہ گیا۔ میرے دوستوں نے سفارش بھی کی کہ اب بولو، اُس نے یہ کہکر ٹال دیا کہ "کیا کوئی لڑائی ہے"۔ اس طرح اُنکا ایک بوجھ اُتر گیا، اور ضرور اُنکے دل کی گھبراہٹ کم ہوگئی ہوگی۔

جون کا آخری ہفتہ آ پہونچا۔ اور ۲۹ جون کو نتیجہ معلوم ہوا۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اخبار ہاتھ میں لیا۔ اور دھڑکتے ہوئے دل سے دیکھنا شروع کیا۔ آخر سخت کشمکش اور ہیجان کے بعد میری نظریں ایک رول نمبر پر اس طرح پڑیں جس طرح ایک منتظر عاشق اپنے معشوق کی آمد پر اسے حیرت سے تکنے لگتا ہے۔ بار بار دیکھا، یہاں تک کہ بالکل یقین آ گیا۔ دل میں سرور سا بھر گیا اور ایک جادوئی کیفیت نمایاں ہوگئی۔

میں اور وہ تیسرے نمبر پر پاس ہوگئے تھے۔ حالانکہ مجھے تیسرے نمبر پر پاس ہونے کا صدمہ نہیں تو رنج ضرور تھا۔

اُسکے دوسرے روز جبکہ میں شام کو سیر میں مصروف تھا، وہ بھی آ نکلے اور بے اختیار اُنکے مُنہ سے 'مبارک' نکل گیا۔ میں نے کہا "مگر ......" میں نے مگر، کچھ اس انداز سے کہا کہ وہ آ کر مجھ سے لپٹ گئے اور آنسو طرفین سے جاری ہوگئے۔ یہ سچی محبت کے آنسو تھے۔

نورالحسن ہاشمی

"میں خدا پر ایمان لایا"

(۱)

انسان چونکہ مادیات کی دنیا میں رہتا ہے اور ہر وقت اُسکو اپنے بقائے جسم کے لیے مادی چیزوں کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے، اس واسطے وہ مادیات سے علیحدہ ہو کر اپنی روح کی طرف متوجہ نہیں ہوتا -

اس وقت جسکا نام ترقی ترقی لکھکر پکارا جاتا ہے اُسکا مطلب سوائے اسکے کچھ نہیں ہے کہ زیادہ سے زیادہ جسم انسانی کو آرام دیا جا سکے - مثال کے طور پر دنیا کی کسی چیز کو لے لیجیے اور انسانی سعی و کوشش کو دیکھیے تو جسمانی ضروریات کے تحت میں ہر بات نظر آئیگی - موٹر، ریل، دریائی و ہوائی جہاز، انتظام ملکی و مالی، جنگ و مصالحت، تجارت و زراعت، حوصلۂ ملک گیری، ایجادات و اختراعات، عام خیال ہے کہ جسم کی راحت رسانی روح کے لیے راحت ہے، حالانکہ معاملہ برعکس ہے - یعنے جس قدر تن آسانی کا خیال زیادہ ہوگا اُتنی ہی روح کثافت میں مبتلا ہو کر اذیت پائیگی - جتنا جسم انسانی راحت کا خوگر ہوتا جائیگا، خالقِ کائنات کی طرف سے غفلت ہوتی جائیگی - آدمی اپنے رفعِ تکالیف کے لیے مادی چیزوں کا سہارا ڈھونڈھے گا اور اُنھیں پر تکیہ کریگا -

مادی چیزیں انسان کو اُسی وقت فائدہ پہونچا سکتی ہیں جب خالقِ مادیات کا اشارہ ہوتا ہے - اور حال یہ ہے کہ جب ان چیزوں سے انسان نفع پاتا ہے تو وہ یقین کر لیتا ہے کہ یہ چیزیں بالذات اُسکے لیے نفع بخش ہیں - حالانکہ تجربہ اسکے خلاف بارہا کیا جا چکا ہے کہ جو چیز ایک بار فائدہ پہونچا چکی ہے دوسری بار وہی چیز بے فائدہ ثابت ہوتی ہے - جن حکیموں کی عمدہ تشخیص و تدبیر ہمارے لیے مسیحائی کا کام کرتی تھی وہی ہمارے لیے ہلاک ثابت ہوتی ہے - اور اس کی وجہ خاص یہی ہے کہ ہم مادی ذرائع و وسائل کو موثر سمجھنے لگتے ہیں - اور یہیں پر ہم غلطی کرتے ہیں -

ایک ہمارے دوست تھے جو حکیم عبدالعزیز صاحب لکھنوی سے خاص ارادت رکھتے تھے اور اپنے زعم میں انکو مسیحائے وقت خیال کرتے تھے - اتفاقاً وہی دوست مرض فالج میں مبتلا ہوئے - جب میں اُن کی عیادت کو گیا تو اُنھوں نے اپنی صحت کی طرف سے مایوسی ظاہر کی - میں نے بطور تسکین کے اُن سے کہا "حکمائے ہند گفتہ اند کہ مرض اگرچہ ہائل بود و دلالت بر ہلاک کلی نکند" آپ کی مایوسی آپ کی کمزوری کی دلیل ہے - اُنھوں نے آہ سرد بھر کر کہا کہ بھائی! حکیم صاحب ہمارے

حج کے واسطے گئے ہوے ہیں اور اُنکے سوا مجھے کسی کی تدبیر سے نفع نہ ہوگا۔ میں نے تردیداً کہا کیا
آپ انسانی تدابیر کو موثرِ حقیقی سمجھتے ہیں؟ کہنے لگے کہ قدرت خداوندی سے کسی کافر کو انکار ہوگا
گر یہ دنیا عالم اسباب ہے۔ جب سببِ صحت (یعنی حکیم صاحب) موجود نہیں ہیں تو شفا کی کیا اُمید
ہوسکتی ہے۔" میں نے پھر سمجھایا کہ خالقِ اسباب تو موجود ہے۔ اگر ایک سبب نہیں رہا تو وہ اور سبب
پیدا کردے گا۔ ان اللہ علیٰ کل شیئ قدیر۔" مسکرا کر کہنے لگے " دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال
اچھا ہے"۔ ارے میاں تم اگر اللہ والے ہوگئے ہو تو میرے حق میں دعا ہی کرو"۔ میں نے کہا کہ کیا
تمھارے خدا نہیں ہے؟" اتنا سن کر اُنکو سکوت ہوا اور تھوڑی دیر میں ایک جذبہ کے ساتھ اُنھوں
نے کہا" ہاں ہاں میں بھی خدا رکھتا ہوں۔ اور گواہ رہو کہ میں اُسکو اپنا حکیم مانتا ہوں"۔ پھر اُنھوں نے
کوئی تدبیر نہیں کی نت سنتے اور بادام کھا کھا کے اچھے ہوگئے۔ اور جب حکیم عبدالعزیز صاحب حج سے
واپس آئے تو وہ اچھے ہوچکے تھے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ حکیم صاحب چند روز کے بعد خود مرض فالج میں مبتلا ہوے اور کسی علاج
سے اُنکو نفع نہ ہوا اور جاں بحق ہوگئے۔ اُس وقت سے ہمارے دوست کو اسباب کے بےحقیقت
ہونے کا یقین ہوگیا۔ اور اب وہ موثر حقیقی خالق کائنات کو سمجھتے ہیں اور قدرت خداوندی
کا درجہ عین الیقین اُنکو حاصل ہوا۔ (باقی دارد)

سراج الدین احمد مہجور

رباعیات مہجور

دنیا کی کسی چیز سے انکار نہیں — یہ ہستیِ خالق ہی کا اقرار نہیں
مہجور نے ہنس کے فلسفیوں سے کہا — وہ بھی ہے کوئی بزم جہاں یار نہیں

بندہ کو جو مختار کہے۔ ہے گمراہ — مجبور سمجھنا ہے شریعت میں گناہ
مہجور تم اس بحث کو سُن کر کہدو — لاحول ولا قوۃ الا باللہ

ذیل میں میں نے اُن تمام کتبخانوں کی ایک فہرست تیار کی ہے جو عہد عباسیہ میں بلادِ اسلامیہ میں موجود تھے، اور جن کا مجھے پتہ مل سکا ہے۔ بعض ماخذوں میں تو صرف ان کتبخانوں کا برائے نام ذکر آیا ہے۔ اور بعض میں اُن کے قیام استفادہ، اور انتظام کا مفصل تذکرہ ہے۔

بغداد

(۱) کتبخانۂ "دار العلم" یا "بیت الحکمۃ" جسے خلیفہ ہارون الرشید[1] (۱۷۰ھ/۷۸۶ء - ۱۹۳ھ/۸۰۹ء) یا اُسکے جانشیں مامون[2] (۱۹۸ھ/۸۱۳ء - ۲۱۸ھ/۸۳۳ء) نے قائم کیا تھا۔ یہ کتبخانہ خلیفہ المعتصم (۲۱۸ھ/۸۳۳ء) کے زمانہ تک موجود تھا[3]۔

(۲) کتبخانہ جو ایک "دار العلم" سے وابستہ تھا جسے ۳۸۱ھ/۹۹۱ء[4] میں یا ۳۸۳ھ/۹۹۳ء[5] میں آل بویہ کے وزیر ابو نصر سابور بن اردشیر (۴۱۶ھ/۱۰۲۵ء) نے کرخ بغداد کے محلہ بین السورین میں قائم کیا تھا۔ خوبصورتی اور وسعت[6] کے لحاظ سے کئی مصنفین نے اسکی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ اس میں ایک لاکھ کتابیں موجود تھیں، جن میں سے بعض مشہور خطاطوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں۔ یہ کتبخانہ اپنے بانی کی وفات کے بعد صرف تھوڑی مدت باقی رہا، کیونکہ جب ۴۴۷ھ/۱۰۵۶ء میں[7] طغرل بک سلجوقی نے بغداد کو فتح کیا تو اُسکی فوج کے سپاہیوں نے اس کتبخانہ کو خورد برد کر ڈالا۔ اور اُس میں آگ لگادی۔ کچھ کتابیں اس دست برد سے محفوظ رہ گئی تھیں جو طغرل کے وزیر عمید الملک الکندری کے کتبخانہ میں داخل ہو گئیں[8]۔

(۳) مدرسہ نظامیہ کا کتبخانہ جسے نظام الملک وزیر سلطان الپ ارسلان سلجوقی نے ۴۵۷ھ/۱۰۶۴ء میں قائم کیا تھا[9]۔

---

[1] الفہرست صفحہ ۱۰۵ [2] ایضاً صفحہ ۵ سطر ۱۵-۳۰ - صفحہ ۲۱-۱۳۰ - اور ۲۴۳

[3] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۴۳۵ (درس ۱۵ھ) [4] صفدی ورق ۲۶ -

[5] کامل ابن اثیر جلد ۹ - صفحہ ۱۷ [6] کامل - جلد ۹ صفحہ ۲۴۶ - صفدی ۲۶ - معجم البلدان لیاقوت جلد ۱ صفحہ ۷۹۹ [7] ابن اثیر - ۹ صفحہ ۲۴۶ - بنداری تاریخ آل سلجوق صفحہ ۱۸ صفدی ۲۶ - یاقوت ۱ - صفحہ ۷۹۹ [8] ابن اثیر ۹ - صفحہ ۲۴۶ - بنداری صفحہ ۱۸ -

[9] صفدی - ورق ۱۱۰ -

مَرْو

یہاں دس کتبخانے تھے جن میں سے دو یہ ہیں:-

(۱۵) کتبخانۂ نظامیہ، بناکردۂ وزیر نظام الملک۔[۱]

(۱۶) کتبخانۂ عزیزیہ، جسے چھٹی (بارہویں) صدی میں عزیز الدین حاجب نے قائم کیا تھا۔[۲]

نیشاپور

(۱۷) ۵۴۸ھ / ۱۱۵۳ء میں غُز ترکوں کے ہاتھ سے یہاں کے کتبخانوں کے جلائے جانے کا ذکر مورخین نے کیا ہے۔[۳]

(۱۸) وہ کتبخانہ جو ۴۲۰ھ / ۱۰۲۹ء میں سلطان محمود غزنوی فتح نیشاپور کے وقت غزنی لیگیا تھا۔[۴]

(۱۹) آل بویہ کے تاجدار عضد الدولہ (۳۶۷ھ - ۳۷۲ھ / ۹۷۷ء - ۹۸۲ء) کا کتبخانہ۔ اسکے بعد جانشین بیٹے بہاء الدولہ نے پھر اس کتبخانہ کی سُدھ نہیں لی۔[۵]

اندلس

قرطبہ۔

(۲۰) کتبخانۂ خلیفہ الحکم المستنصر (۳۵۰ھ / ۹۶۱ء - ۳۶۵ھ / ۹۷۶ء)۔ اسکے بیٹے ہشام (۳۶۵ھ - ۳۹۶ھ / ۹۷۶ء - ۱۰۰۶ء) کے وزیر معروف بہ الواضح نے (جو منصور محمد بن ابی عامر کا پروردہ تھا) کتبخانہ میں فلسفہ و حکمۃ کی جتنی کتابیں تھیں ان سب کو جلا دیا۔[۶] ان کتابوں کا کچھ حصہ حملہ بربرہ (پانچویں / گیارہویں صدی) کے وقت فروخت ہوا اور بقیہ حصہ فاتحین کی غنیمت کی نذر ہوا۔[۷]

مغرب

فاس (FEZ)

(۲۱) مدرسۃ الصفارین کا کتبخانہ جسے مرینی سلطان یعقوب بن عبد الحق (۶۵۹ھ / ...)

---

۱ معجم البلدان جلد ۴ صفحہ ۵۰۹ ۲ ایضاً ۳ ابن اثیر جلد ۱۱ صفحہ ۱۲۰ ۴ ارشاد الاریب لیاقوت جلد ۲ صفحہ ۳۱۵ ۵ احسن التقاسیم للمقدسی صفحہ ۴۴۹ ۶ ارشاد، جلد ۵ صفحہ ۴۷-۴۶

۷ ابن خلدون جلد ۴ صفحہ ۱۴۶ - نفح الطیب للمقری جلد اول صفحہ ۱۸۰ (طبع لیڈن جلد اول صفحہ ۲۴۹)

۸ طبقات الامم لابن صاعد (بیروت) صفحہ ۶۶-۶۵ - بیان المغرب لابن العذاری جلد ۲ صفحہ ۲۱۴-۲۱۵

۹ ابن خلدون جلد ۴ صفحہ ۱۴۶ - نفح الطیب جلد ۱ صفحہ ... (جلد ۱ صفحہ ۲۵۰ طبع لیڈن)

۶۱۲ھ / ۱۲۱۵ء) نے قائم کیا تھا۔ اس میں تمام تر وہ کتابیں جمع تھیں جو سلطان موصوف نے اسپین کے مغلوب بادشاہ سانچو (Sancho) کے پاس سے طلب کی تھیں[۱]۔

سلاطین اسلام ان مکانات کی بڑی حفاظت کرتے تھے جو عام کتبخانوں کے لیے مخصوص ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض مثلاً شیراز، قرطبہ، اور قاہرہ میں ان کتبخانوں کے لیے علیحدہ عمارتیں تعمیر کرائی گئی تھیں، جن میں مختلف کاموں کے لیے متعدد کمرے ہوتے تھے۔ مثلاً گیلریاں جن میں کتابوں کی الماریاں رکھی جاتی تھیں، اور وہ کمرے جہاں شایقین کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ بعض کمرے اُن کاتبوں کے لیے مخصوص تھے جو کتابوں کی نقلیں کیا کرتے تھے۔ اور وہ کمرے جو "مجالس علمیہ" کے کام آتے تھے[۲]۔ کہیں کہیں موسیقی اور غنا وغیرہ کیلیے بھی علیحدہ کمرے ہوا کرتے تھے[۳]۔ یہ تمام کمرے نہایت آراستہ و پیراستہ ہوتے تھے، جن میں قالین، چٹائیاں، وغیرہ بچھی ہوئی رہتی تھیں، اور جن پر شایقین مشرقی طرز سے چار زانو بیٹھ کر کاغذ یا رق (پارچمنٹ) اپنے بائیں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے لکھنے پڑھنے میں مشغول رہتے تھے۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر چلمنیں اور پردے پڑے ہوتے تھے، اور صدر دروازہ میں خاص طور پر ایک بھاری پردہ لگا رہتا تھا، تاکہ سرد ہوا اندر نہ داخل ہو سکے[۴]۔

مسلمان مورخین نے ان میں سے بعض کتبخانوں کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ گویا وہ ان کتبخانوں کی خوبصورتی اور انکی قیمتی اشیاء کے تذکرہ سے بہت محظوظ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر کتبخانہ قاہرہ کی نسبت مقریزی کا بیان ملاحظہ ہو:-

وفی یوم السبت ہذا یعنی العاشر من جمادی الآخرۃ سنۃ خمس وتسعین وثلثمائۃ فتحت الدار الملقبۃ بدار الحکمۃ بالقاہرۃ وجلس فیہا الفقہاء وحملت الکتب الیہا من خزائن القصور المعمورۃ ودخل الناس الیہا ونسخ کل من التمس نسخ	اس ہفتہ کے دن یعنی ۱۰ جمادی الآخر ۳۹۵ھ کو تھا۔ وہیں دار الحکمۃ کی عمارت کا افتتاح ہوا۔ اس میں علماء و فقہاء جمع ہوئے۔ محلات شاہی کے معمور خزانوں میں سے کتابیں لا لا کر اس میں رکھی گئی تھیں۔ لوگ اس میں داخل ہوتے تھے اور جس چیز کی نقل چاہتے

[۱] روض القرطاس طبع تورنبرگ صفحہ ۱۸۔ [۲] مقامات حریری۔ جلد ۱۔ صفحہ ۲۶-۲۷۔
[۳] سقط الزند المعری - جلد ۲ صفحہ ۷، طبع قاہرہ ۱۳۲۴ھ، ج ۳۔ صفحہ ۵۔ طبع یورپ ۱۹۰۰ء
[۴] مقدسی صفحہ ۴۴۹، مقریزی جلد ۲ صفحہ ۴۵۹۔

شئی مما فیہا : التمہ وکذلک من رای قراۃ شئی
مما فیہا و جلس فیہا القراء والمنجمون واصحاب النحو
واللغۃ والاطباء وبعد ان فرشت ہذہ الدار و
زخرفت وعلقت علی جمیع ابوابہا وممراتہا الستور
واقیم قوام وخدام وفراشون وغیرہم رسموا
بخدمتہا وحصل فی ہذہ الدار من خزائن امیر المومنین
الحاکم بامر اللہ من الکتب التی امر بحملہا الیہا
من سائر العلوم والاداب والخطوط المنسوبۃ
الم یر مثلہ مجتمعاً لاحد قط من الملوک واباح
ذلک کلہ لسائر الناس علی طبقاتہم ممن یوثر
قراۃ الکتب والنظر فیہا ۔ؔ

کرسکتے تھے ۔ اسی طرح اس میں سے کوئی کتاب پڑھنا
چاہتے تو مل سکتی تھی ۔ قاری ، منجم ، نحوی ، علمائے
لغت ، اور اطباء وہاں بیٹھا کرتے تھے ۔ اس مکان
میں فرش بچھائے گئے تھے اور سامان آرائش (زنجیر)
سے اس کو سنوارا گیا تھا ۔ اسکے تمام دروازوں
اور گزرگاہوں پر پردے لگے ہوئے تھے ۔ منتظمین فراشوں
اور خدامون کو خاص اس کتبخانہ کی خدمت کے لیے
مقرر کیا گیا تھا ۔ امیر المومنین الحاکم بامر اللہ کے خزانوں
میں سے یہ کتابیں لائی گئی تھیں جن میں تمام علوم
کی ادبیات اور خطوط منسوبہ میں لکھی ہوئی نہایت خوشخط
کتابیں تھیں ۔ آج تک کسی بادشاہ کے پاس اتنی کتابیں
یکجا نہیں دیکھی گئیں ۔ الحاکم نے بلا امتیاز ادنیٰ و اعلیٰ
ہر ایک کو جو تحصیل علم اور مطالعہ کتب کرنا چاہتا اُس
میں داخل ہونے کی اجازت دے رکھی تھی ۔

مقدسی نے بھی شیراز کے بیش بہا کتبخانہ کا نہایت دلچسپ تذکرہ کیا ہے[۲] :۔

" عضد الدولہ نے شیراز میں ایک عالیشان محل تیار کرایا تھا جس کی نظیر مشرق اور مغرب
میں نہیں ہے ۔ کوئی جاہل آدمی ایسا نہیں ہے جو اس میں داخل ہو اور متحیر نہ ہوا ہو ، اور کوئی
عالم ایسا نہیں ہے جو اس میں داخل ہوا ہو اور اُسکا مشام جاں بہشت کی خوشبوؤں اور فرحتوں
سے نہ بھر گیا ہو ۔ اس (عضد الدولہ) نے محل کے اطراف میں پانی کی نہریں جاری کی تھیں ۔
تمام عمارتیں گنبدوں کا تاج پہنے ہوئے تھیں اور اسکے اطراف میں باغیچے اور چمن لگے ہوئے
تھے ۔ زمین کھود کر جھیلیں بنائی گئی تھیں اور ہر قسم کا عیش و آرام جو خیال میں آسکتا ہے وہاں

---

[۱] چونکہ یہ دار العلم کوئی دینی مجلس نہ تھی اسلیے اسکے کتبخانہ میں سائنس فلسفہ اور علوم قدیمہ کی کتابیں بھی رکھی گئی تھیں
غالباً اسلام کے زبردست سائنٹسٹ ابن ہیثم کو ریاضیات ، نجوم وغیرہ پر اہل یونان کی تصنیفات اس کتبخانہ سے دستیاب
ہوئی ہونگی اور قاہرہ میں آجانے کے بعد اس نے یہیں اپنا مطالعہ کتب جاری رکھا ہوگا (ک) [۲] مقریزی
جلد اول ص ۴۵۸ [۳] احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم للمقدسی صفحہ ۴۴۹ ۔

مہیا کیا گیا تھا۔ میں نے نوکروں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اس محل میں ۳۶۰ کمرے اور کئی مکانات تھے۔
چنانچہ عضد الدولہ سال بھر ہر روز ایک نئے کمرے میں بسر کرتا تھا۔ بعض کمرے نیچے تھے
اور بعض اوپر۔ اور کتبخانہ انکے علاوہ ایک علحدہ کمرے میں ہے۔ اس پر ایک وکیل
(ناظر) خازن (لائبریرین) اور ثقات شہر میں سے ایک مشرف (نگراں) مقرر ہے۔ کتابیں
الماریوں میں چُنی ہوئی ہیں۔ یہ کتبخانہ ایک اونچے گنبد والے کمرے میں ہے جس سے متصل
بعض کمرے بطور گودام بنے ہوئے ہیں۔ ان کمروں کے ساتھ ہی بادشاہ نے قد آدم کے
برابر تین گز چوڑی لکڑی کی الماریاں بنوائی تھیں، جن میں نیچے سے اوپر تک خانے بنے
ہوئے ہیں، کتابیں ان میں چُنی ہوئی ہیں۔ ہر فن کے لیے ایک علحدہ الماری ہے۔ کتابوں
کی فہرستیں ہیں جن میں کتابوں کے نام درج ہیں۔ بجز اہل وجاہت کے کوئی اس میں داخل
نہیں ہو سکتا۔ خود میں نے اس کتبخانہ کا معائنہ کیا ہے۔ نیچے اور اوپر کے حصوں میں تمام
چیزیں اپنی اپنی جگہ پر قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے ہر کمرے میں دریاں اور پردے
ملاحظہ کیے۔ اور وہ ہوا دار کمرہ بھی دیکھا جسکے ارد گرد پانی کے نل لگے ہوئے ہیں۔[1]"

کتابوں کے لیے مخصوص کمروں میں دیوار سے لگی ہوئی الماریاں قد آدم سے زیادہ اونچی
نہیں ہوتی تھیں۔ اور اس لیے اوپر کے حصے میں سے کتابیں نکالنے کے لیے خطرناک سیڑھیاں
لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ان تمام الماریوں میں ڈھکن لگے ہوئے تھے، جو بعض
دروازوں کی طرح کھلتے اور بعض اوپر سے نیچے کھینچ کر مقفل کر دیے جاتے تھے۔ ان مقفل الماریوں
میں اگرچہ کتابوں کی (فن وار) تقسیم کے لیے سہولت نہ تھی تاہم ان سے بڑا فائدہ یہ ہوتا تھا
کہ قیمتی اور خوبصورت مجلدات گرد و غبار اور دھوپ سے محفوظ رہتی تھیں۔ البتہ اس سے
ایک نقصان ضرور ہوتا تھا کہ ہوا نہ لگنے کی وجہ سے کتابوں کو دیمک چاٹ جاتی تھی۔

الماریوں میں یہ کتابیں تو بر تو ایک انبار کی صورت میں رکھ دی جاتی تھیں جیسا کہ مقامات
حریری کے ایک قلمی نسخہ کی اُس تصویر سے معلوم ہوتا ہے جسکو بلوخت (Blochet)
نے شائع کیا ہے[2]۔ غالباً یہ موصل کے کسی عام کتبخانہ کی تصویر ہے جس میں اس کی ایک دیوار

---

[1] ارشاد الاریب جلد ۶ صفحہ ۳۵۹ - ۳۶۰ -
[2] Blochet, Les Enluminures Plate X

کا حصہ دکھایا گیا ہے۔

مصنف اور کتاب کا نام کتاب کی پشت پر لکھا جاتا تھا اور کتابوں کی ترتیب فن وار ہوتی تھی۔ مطلوبہ کتاب کو آسانی سے نکالنے کے لیے الماری کے ہر خانہ پر باہر کے حصہ میں کاغذ کا ایک پرچہ چسپاں کیا جاتا تھا۔ ان پرچوں میں ناقص اور مکمل کتابوں کا ذکر بھی ہوتا تھا۔

ان کتبخانوں میں کتابوں کی تعداد مختلف ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ سابور بن اردشیر کے کتبخانہ میں ایک لاکھ سے لیکر ایک لاکھ چالیس ہزار تک جلدیں تھیں۔ جن میں سے قرآن مجید کے ۱۰۰ خوشخط نسخے مشہور خاندان بنو مقلہ کے خطاطوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے[۱]۔ طرابلس کے کتبخانہ میں کتابوں کی تعداد بقول ابن الفرات، تیس لاکھ تھی، جو مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے ان میں سے پچاس ہزار نسخے قرآن مجید کے اور ۸۰ ہزار نسخے تفاسیر کے تھے[۲]۔ قرطبہ کے کتبخانہ میں چار لاکھ کتابیں تھیں جن کو پرانے مکان سے نئے مکان میں منتقل کرنے کے لیے چھ مہینے کا عرصہ درکار ہوا[۳]۔ خلفائے فاطمیہ مصر کے کتبخانہ کی کتابوں کی تعداد یقینی طور پر معلوم نہیں ہے کیونکہ اُن مختلف ماخذ میں جن کو مقریزی صاحب خطط مصر نے استعمال کیا ہے، ان کتابوں کی مجموعی تعداد کا بیان صاف طور پر نہیں ملتا۔ بلکہ اس کتبخانہ کے بعض بعض ٹکڑوں کی تعداد معلوم ہوتی ہے جو ادھر اُدھر تقسیم ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک ماخذ کتبخانہ العزیز کا ذکر کرتے ہوئے، جو بعد کو الحاکم کے کتبخانہ میں مل گیا تھا، لکھتا ہے کہ اس میں چالیس کمرے تھے اور ہر کمرے میں علوم قدیمہ[۴] پر اٹھارہ ہزار کتابیں تھیں۔ یہاں خلیل بن احمد کے لغت کتاب العین کے تیس نسخے تھے اور مورخ طبری کی ضخیم اور بڑی تاریخ کے بیس نسخے موجود تھے۔ اسی طرح جمہرۂ ابن دُرَید کے ایک سو نسخے تھے۔ علاوہ ازیں ۲۴۰۰ نسخے قرآن مجید کے تھے۔ ایک اور ماخذ (مصنف) کا بیان ہے کہ یہ کتبخانہ ایک ہی کمرہ تھا جس میں دو لاکھ مجلدات تھیں۔ مگر یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ ایک کمرے میں اتنی کتابوں کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ ایک اور مصنف کہتا ہے کہ اس کتبخانہ میں ۱۶ لاکھ کتابیں تھیں، جن میں

---

[۱] ابن الاثیر جلد ۱۰ صفحہ ۵، صفدی ورق ۲۷۔ [۲] تاریخ ابن الفرات، جلد ۱۔ صفحہ ۸۳ مخطوطہ ویانا۔ [۳] مقری جلد اول صفحہ ۲۵۶ (صفحہ ۸۵-۱۸۴ طبع لیڈن) [۴] "علوم قدیمہ" سے مراد اہل عرب کے نزدیک ریاضیات، نجوم، فلسفہ وغیرہ ہیں۔

سے ۱۲۰۰ نسخے[1] صرف تاریخ طبری کے تھے۔ اور آخر میں ایک مصنف اس تعداد کو ایک لاکھ بیس ہزار میں محدود کر دیتا ہے[2]۔ یہ تعداد ایک اور مورخ قلقشندی[3] کے بیان سے متفق ہے جس نے مقریزی کے ماخذ کے علاوہ ایک اور ذریعہ سے لکھا ہے۔ اگرچہ ہم صحیح تعداد معلوم کرنے سے قاصر ہیں تاہم کتابوں کی تعداد اس کتبخانہ میں ایک لاکھ بیس ہزار سے تو بہرحال زیادہ ہی ہوگی۔ کیونکہ عہد فاطمی میں بار بار لُٹتے رہنے کے باوجود بھی **صلاح الدین** سے فتح مصر کے وقت اپنے وزیر **الفاضل** کو ایک لاکھ بیس ہزار تک کتابیں دیدینے کے بعد جب بقیہ کتابوں کو نیلام کے ذریعہ، جو ہفتہ میں دو بار ہوا کرتا تھا، فروخت کرنا شروع کیا تو اُسکو ایک سال کا عرصہ لگا[4]۔

ان بڑے اور عظیم الشان کتبخانوں کے تمام ذخائر سے واقفیت حاصل کرنے اور اُنکو استعمال کرنے کے لیے یہ سہولت بہم پہونچائی گئی تھی کہ چھوٹے چھوٹے رسائل یا بڑی بڑی ضخیم کتابوں کی صورت میں انکی فہرستیں تیار کی گئی تھیں۔ مثلاً قرطبہ[5]، رے[6]، بخارا[7] اور شیراز[8] کے کتبخانوں میں۔ ان کتبخانوں میں اضافہ یا تو اس طرح ہوتا تھا کہ کتابیں خریدی جاتی تھیں یا نقل کرا کر حاصل کی جاتی تھیں جسکے لیے خاص کاتب مقرر ہوتے تھے۔

---

[1] یہاں غالباً ۱۲۰۰ جلدیں مراد ہیں۔ یعنی اس ضخیم کتاب کے ۳۰ مکمل نسخے (مطبوعہ تاریخ طبری کی کل ۱۲ جلدیں ہیں جو اصل کتاب کا دسواں حصہ بھی نہیں۔ یہ گویا امام طبری کی تاریخ الکبیر کا خلاصہ ہے۔ مگر یہ کہیں پتہ نہیں چلتا کہ اصل کتاب کتنی جلدوں میں تھی۔ ہمیں معلوم نہیں مؤلف نے اس کتاب کی چالیس جلدیں کیسے معلوم کر لیں کہ ۱۲۰۰ جلدوں کے تیس نسخوں کے حساب سے چالیس جلدیں ہی ہوتی ہیں۔ سوائے تیس ہزار ورق کے کسی نے جلدوں کی تعداد نہیں بتائی۔ اختر) [2] مقریزی جلد اول صفحہ ۴۰۸ [3] صبح الاعشیٰ، جلد ۳ صفحہ ۴۷۵ [4] کتاب الروضتین لابی شامہ جلد اول صفحہ ۲۲۸ [5] ابن خلدون جلد ۴ صفحہ ۱۴۶، مقریزی جلد ۱ صفحہ ۲۵۰ (لیڈن صفحہ ۱۸۰) [6] ارشاد الاریب جلد ۲ صفحہ ۳۱۵ [7] لٹریری ہسٹری از نکلسن صفحہ ۲۶۶ [8] مقدسی صفحہ ۴۴۹۔ اسی بنا پر ڈاکٹر اسپرنگر کا یہ خیال تھا کہ ابن الندیم مصنف کتاب الفہرست نے کسی ایسی ہی کتبخانہ کی فہرست سے اپنی کتاب کے لیے مواد فراہم کیا ہے، خصوصاً یونانی، پہلوی اور ہندی تصانیف کے اقتباسات۔ مگر جب ہم اس کتاب پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں، خصوصاً ابتدائی حصوں پر، تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ فہرست نہیں ہے بلکہ ایک باقاعدہ تصانیف کی تاریخ ہے۔ اس کتاب کے متعلق مختلف آراء کے لیے

نئی کتابوں کو حاصل کرنے کے لیے ان کتبخانوں کے بانی (مالک) بڑی بڑی رقمیں خرچ
کرتے رہتے تھے۔ اور جب کسی مشہور مصنف کی کتاب پہلے پہل کسی کے پاس پہونچ جاتی تو اُس پر فخر
کیا جاتا تھا۔ اسی مقصد کے لیے اندلس کے خلیفہ الحکم [1] اور طرابلس کے فرماں روا بنو عمار [2] نے
کتابوں کے ماہرین خصوصی اور تاجروں کو مقرر کیا تھا تاکہ وہ تمام بیرونی ممالک سے کتابیں بہم
پہونچاتے رہیں۔ کبھی کبھی کتبخانوں کے بعض مالک یا مہتمم نیلام میں کتابیں خریدتے تھے۔ یہ طریقہ مشرقی
ممالک میں عام طور پر مروج تھا۔ اور اسی ذریعہ سے اکثر شائقین کتب کتابیں حاصل کرتے تھے۔
کتابوں کو براہ راست خریدنے کے علاوہ جس کتاب کی ضرورت ہوتی اُسکی نقل کرائی
جاتی تھی۔ اس کام کے لیے کتبخانوں میں خاص کاتب رکھے جاتے تھے، جنکے لیے اس کتبخانہ
میں ایک علیحدہ کمرہ مخصوص ہوتا تھا۔ ان کا طریقہ کار بھی مختلف ہوتا تھا۔ چنانچہ بعض اوقات
ایک کتاب کو صرف ایک کاتب لکھ کر تمام کر دیتا، اور کبھی کئی کاتب مل کر لکھتے، تاکہ اصل
کتاب کے متعدد نسخے تھوڑے وقت میں تیار ہو سکیں۔ طرابلس کے کتبخانہ کے متعلق بیان
کیا جاتا ہے کہ اس میں ایک سو اسّی کاتب تھے، جن میں سے تیس [3] رات اور دن لکھنے
میں مشغول رہتے تھے [4]۔ اسی طرح قاہرہ [5] اور شیراز [6] کے کتبخانوں میں بھی کاتب مقرر تھے مثلاً
خلیفہ العزیز کے کتبخانہ میں مصر میں، الحکم اندلس میں [7] امورخ واقدی [8] (سنہ ۲۰۷ھ م ۸۲۳ء) کے بغداد
میں، اور ابو مطرف کے [9] (اندلس میں)۔ خاص خاص لوگوں کا یہی طریقہ تھا کہ جب بعض
اسباب کی بنا پر کوئی کتاب خریدی نہ جا سکتی تھی تو وہ اسی طریقہ سے اپنے کاتبوں سے
لکھوا لیتے تھے۔
بڑے بڑے عام اور خاص کتبخانوں میں مہتمم اور دیگر ملازمین ہوا کرتے تھے جن میں سے

(حاشیہ سلسلۂ گذشتہ) دیکھو وان کریمر کی تمدن اسلام، براؤن کی تاریخ ادب ایران اور ریڈ و کلسن کی تاریخ ادب العرب
تا لیا اسی قسم کی ایک فہرست کتبخانہ برلن میں نمبر ۲۱ - اور ۲۶ پر ہے۔ حاجی خلیفہ (سنہ ۱۰۶۹ھ م ۱۶۵۸ء) کی کشف الظنون
البتہ ایسی ہی فہرست ہے مگر وہ زمانۂ مابعد کی تصنیف ہے۔ [1] مقری جلد اول صفحہ ۲۴۹، ابن خلدون جلد
صفحہ ۱۴۶۔ [2] ابن الفرات ورق ۴۳ مخطوطہ وِیانا۔ [3] ابن الفرات ورق ۳۶ [4] مقریزی ۱۔
صفحہ ۴۵۸ [5] ارشاد الاریب ۵ صفحہ ۴۴۷ [6] مقریزی ۱۔ صفحہ ۴۰۹ [7]
ابن خلدون ۴۔ صفحہ ۱۴۶ [8] الفہرست صفحہ ۹۸ [9] کتاب الصلہ ابن بشکوال جلد اول
صفحہ ۵ - ۳۰۴۔

اکثر مشہور مصنف اور اہل علم ہوتے تھے۔ مورخ ابن مسکویہ (م ۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء) بغداد میں وزیر ابوالفضل
ابن عمید الرازی کے کتبخانہ کا مہتمم (لائبریرین) تھا۔[۵۱] مورخ ابن الساعی (م ۶۷۴ھ / ۱۲۷۵ء)
بغداد کے کتبخانہ مستنصریہ کا ناظم تھا۔[۵۲] بو علی سینا بخارا میں سامانی فرماں روا نوح بن منصور کے
کتبخانہ کا مہتمم تھا۔[۵۳] مشہور مصنف علی بن محمد الشابشتی (م ۳۸۹ھ / ۹۹۹ء) فاطمی خلیفہ العزیز کا
لائبریرین تھا۔[۵۴]

بڑے بڑے پبلک کتبخانوں میں ایک لائبریرین کا کام کرنا بہت دشوار ہوتا تھا اور اس لیے
اُسکو ایک یا اس سے زیادہ مددگاروں کی ضرورت پڑتی تھی۔[۵۵] لائبریرین کا کام اگرچہ کتابوں
کی نگہداشت، اور اُنکی فہرستیں تیار کرنا ہوتا تھا، تاہم مزید براں عوام کو واقف کرنا، طلبہ کو
کتابیں دینا، اور استعارۂ کتب کی نگرانی کرنا بھی اُس کے فرائض میں داخل تھا۔ چونکہ یہ کام
بہت مشکل تھا اس لیے کتبخانہ کے عام ملازمین اسکو انجام نہیں دے سکتے تھے۔ اس عہدہ
کے لیے تعلیم یافتہ آدمی کی ضرورت تھی۔ البتہ معمولی نوکروں کے لیے حرف شناسی کافی تھی۔
ایک عجیب واقعہ ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ بغداد کے کتبخانہ دار العلم میں کاتبوں کو کتابیں دینے
کی خدمت پر ایک حبشی عورت مامور تھی، جسکا نام توفیق تھا۔[۵۶]

ظاہر ہے کہ ایک ایسے محکمہ کے انتظام پر کیا کچھ خرچ نہ ہوتا ہوگا، خصوصاً اس لیے
کہ تقریباً تمام کتبخانوں میں طلبہ اور شائقین کے لیے کاغذ، قلم اور سیاہی تک مہیا کیے

---

۵۱ تجارب الامم لابن مسکویہ جلد ۶ صفحہ ۲۵۶ ۵۲ "گشتہ شریر" از وستنفیلڈ ۳۵۴ صفحہ ۱۱-۱۲ ۵۳ لٹریری ہسٹری از نکلسن ۲۶۵ ۵۴ ابن خلکان جلد اول صفحہ ۳۸۲
۵۵ ارشاد یاقوت ۶ - صفحہ ۳۵۸، صفدی ۲۶، ابن القفطی ۴۵۰ مقدسی ۴۴۹ - مقریزی ۱ - صفحہ ۴۵۸ ۵۶ رسالۃ الغفران للمعری صفحہ ۲۷ (قاہرہ ۱۳۲۱ھ) صفحہ ۱۳۸ (قاہرہ ۱۳۴۳ھ)
اس کتبخانہ کا مہتمم ابو منصور محمد بن علی وہی ہے جسکو ابو العلاء المعری نے خط لکھا ہے (رسائل مرتبہ مرگلیوث ۱۹
اور جسکو مخاطب کر کے اُس نے اشعار کہے ہیں (سقط الزند۔ ۲۔ صفحہ ۱۲۱)۔ غالباً یہ وہی شخص ہے
جس کا ذکر یاقوت (ارشاد ۶ صفحہ ۳۶۰) نے کیا ہے۔ مارگولیتھ نے خطوط کے صفحہ ۵۸ پر
کے حاشیہ میں غلطی سے اس کو ابو منصور بن (محمد بن طاہر سمجھ لیا ہے کہ وہ بھی دار العلم کا مہتمم تھا
جس نے ۵۱۰ھ / ۱۱۱۶ء میں ابو العلاء کے ساٹھ برس بعد وفات پائی۔

کیے جاتے تھے[1]۔ الحاکم کے زمانہ میں قاہرہ کے کتبخانہ کی ضروریات کے لیے جو رقمیں مقرر تھیں اُنکے ملاحظہ سے معلوم ہوگا کہ اس کتبخانہ کے اخراجات کچھ کم نہ تھے[2]

حصیر (چٹائی) عبادانی وغیرہ کے لیے	۱۰ دینار	کاتبوں کے لیے کاغذ	۹۰ دینار
لائبریرین کے لیے (غالباً تنخواہ)	۴۸ ″	پانی بھروانے کی اُجرت کے لیے	۱۲ ″
فراش کے لیے (تنخواہ)	۱۵ ″	کاغذ قلم اور سیاہی کے لیے	۱۲ ″
پردوں کی مرمت اور درستی کے لیے	۱ ″	کتابوں اور شکستہ اوراق کی مرمت کے لیے	۱۲ ″
نمدے کا فرش ایام سرما کے لیے[3]	۵ ″	دریاں ایام سرما کے لیے	۴ ″

بڑے بڑے پبلک کتبخانوں میں تمام لوگوں کے لیے بلا امتیاز "صلائے عام تھی"۔ چنانچہ تمام ماخذ اس پر بار بار زور دیتے اور لکھتے ہیں کہ ہر شخص جو پڑھا لکھا اور کسی فن کے مطالعہ کا شائق ہو اُسکو عام طور پر داخلہ کی اجازت تھی۔ چنانچہ طرابلس[4]، قاہرہ[5]، شیراز[6]، اور موصل[7] کے کتبخانوں میں اسی طرح کی عام اجازت تھی۔ اصل ماخذ سے صاف طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ قرطبہ میں خلیفہ الحکم کے کتبخانہ میں بھی اس طرح کی اجازت تھی یا نہیں۔ عام اجازت کا صریح الفاظ میں تو کہیں ذکر نہیں ہے البتہ ایک واقف کار کے ان الفاظ سے کہ کتابیں جمع کرنے والوں کے لیے الحکم بہت فیاض تھا[8]" پایا جاتا ہے کہ یہ کتبخانہ عوام کے لیے کبھی کھلا ہوا تھا۔ کیونکہ اگر خلیفہ نے پرائیوٹ طور پر ایک عمدہ کتبخانہ قائم کر لیا تو اس سے عوام کو کونسا فائدہ پہونچ سکتا تھا۔ اور اگر بعض علماء کو وہاں داخلہ کی اجازت بھی ہو، جیسا کہ ربیرا[9] کا خیال ہے، تو اس سے عوام کو

---

[1] مقریزی ۱۔ صفحہ ۴۵۹ [2] ایضاً [3] لبود للفرش فی الشتاء کا ترجمہ "ایام سرما کے لیے بھاری اونی پردے" غلط کیا گیا ہے۔ اختر۔ [4] ابن الفرات۔ ورق ۴۳ قلمی [5] مقریزی ۲ صفحہ ۴۵۸ [6] مقدسی ۴۴۹ [7] ارشاد ۲ صفحہ ۴۲۰ [8] ابن خلدون ۴۔ صفحہ ۱۴۶ بحوالہ ابن حزم۔ مقری ۱ صفحہ ۱۸۴۔ ایضاً صفحہ ۲۵۶ طبع لیڈن۔ مقری کی اس عبارت کا مفہوم صحیح ہے۔ اسکے اصل الفاظ یہ ہیں "وکان حسن السیرۃ کریماً للقادمین علیہ جمع من الکتب ما لا یحد" یعنے الحکم نہایت خوش اخلاق تھے۔ اور لوگوں سے تواضع کے ساتھ ملتے تھے انھوں نے بیشمار کتابیں جمع کی تھیں اح
[9] La enseñanza entre los Musulmanes P. 94

کوئی نفع نہیں پہونچا۔ اس سے تو غریب مدرس محمد ابن حزم ہی کی فیاضی عوام کے لیے بہت بڑھ کر تھی۔ کہ جو قرطبہ کے کئی علماء کو اپنے کتبخانہ میں عام طور پر اجازت دیتے تھے۔ علی بن یحییٰ المنجم اور کئی اور پرائیوٹ مالکان کتبخانہ کے لیے بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔

علماء (اہل فن) اور طلبہ کی سہولت کے لیے ان پبلک کتبخانوں میں سے دور دراز مقامات تک کتابیں بھیجی جاتی تھیں۔ اسکے لیے کبھی کبھی کوئی، تم بھی ضمانۃً رکھوائی جاتی تھی۔ مثلاً مرو کا کتبخانہ الدمیریہ جہاں سے یاقوت نے ۲۰۰ کتابیں مستعار لی تھیں[1] اور وہ کتبخانے جہاں اندلسی مورخ ابن حیان (م ۷۴۵ھ / ۱۳۴۴ء) کتابیں منگوایا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ جس کتاب کی مجھے ضرورت ہوتی تھی میں کسی کتبخانہ سے منگوا لیا کرتا تھا اور اگر کتابوں کو خریدنے کیلیے میں کسی سے کوئی کتاب اُدھار لینا چاہتا تو کوئی شخص دینے والا نہ ملتا[2]۔

لیکن تمام کتبخانوں کے مالک ایسے فیاض نہ تھے۔ بلکہ بعض لوگ تو اپنی کتابوں کو وقف کرتے وقت یہ قید بھی لگا دیا کرتے تھے کہ یہ کتابیں کہیں باہر نہ جانے پائیں، جیسا کہ قاضی ابن حبان نیشاپوری نے کیا تھا[3]۔ اکثر کتابیں جو پڑھنے کے لیے دی جاتی تھیں پھر واپس نہیں آتی تھیں۔ چنانچہ حلب کے ایک شاعر الرباط کے یہ اشعار جو ۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۱ء میں لکھے گئے ہیں ایک جلے ہوئے دل کی صدا ہیں۔

"کسی کو کتاب نہ دو، بلکہ عذر کر لیا کرو۔ اگر دو تو اسکے لیے ضمانت لے لیا کرو کیونکہ یہی مناسب طریقہ ہے۔ اگر تم میرے کہنے پر توجہ نہ کروگے تو یقیناً تم اپنی کتابیں گم کر دو گے۔"[4]

اسی طرح ابن الصارم (م ۹۶۴ھ / ۱۵۵۶ء) نامی کے اشعار ذیل ہیں:-

جو شخص میری کتاب لے کر پھر واپس نہیں کرتا، وہ شریف نہیں ہے بلکہ ایک رذیل اور دغاباز آدمی ہے[5]"

---

[1] دیکھو مضمون ہذا صفحہ ۶ [2] وستنفیلڈ کا مضمون علماء شوافع پر مطبوعہ گوٹنگن اکاڈمی جلد ۳۷ ص ۱۵۲ (ابو حیان کا یہ قول الدرر الکامنہ میں انکے تذکرہ میں پایا جاتا ہے۔ یہ کتاب حیدرآباد کے دائرۃ المعارف کی طرف سے عنقریب شائع ہونیوالی ہے۔ ک) [3] وستنفیلڈ: گشتنے شریر (تاریخ الکتاب) نمبر ۹-۲ [4] گستاو ویل کا مضمون کتابیں واپس نہ دینے پر "عربی اشعار" مطبوعہ رسالہ اسلامیکا ج ۴۔ صفحہ ۵۶۱-۵۵۶ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

آخر کار اپنے مہتموں کی بے پروائی، حکومتوں کے انقلابات، اور فاتحین کے وحشیانہ طرزِ عمل سے کہ وہ مفتوح کی قائم کردہ ہر یادگار کو مٹا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ عجیب و غریب کتب خانے مدتِ دراز تک باقی نہ رہ سکے، اور رفتہ رفتہ نیست و نابود ہو گئے۔ عربی تاریخوں میں بار بار یہ ذکر آتا ہے کہ فلاں کتب خانہ تباہ و برباد ہو گیا اور فلاں کو فاتحین نے تاخت و تاراج کیا۔ ان کتب خانوں کی تباہی زیادہ تر آتش زنی سے عمل میں آئی ہے۔ چنانچہ بغداد میں سابور بن اردشیر کا کتب خانہ اسی طرح جل کر ختم ہو گیا۔ طغرل سلجوقی نے جب بغداد کو فتح کیا تو اُسکے لشکریوں نے محلۂ کرخ میں آگ لگا دی۔ چنانچہ اسی میں یہ کتب خانہ بھی نذرِ آتش ہو گیا[۵۰]

یہی حال بغداد کے اکثر کتب خانوں کا ہوا، جنھیں ہلاکو کی سرکردگی میں تاتاریوں نے جلا کر یا برباد کیا کہ انکا نام و نشان تک باقی نہ رہا[۵۱]۔ اسی طرح غزنہ کا کتب خانہ ۵۵۵ھ/۱۱۵۵ء میں محاصرۂ غزنہ کے وقت سلطان حسین غوری کے فوجی سپاہیوں نے جلا دیا[۵۲]۔ مرو کا کتب خانہ تاتاریوں نے ۶۰۶ھ/۱۲۰۹ء میں تباہ کر دیا[۵۳]۔ نیشاپور کا کتب خانہ غز ترکوں نے ۵۴۸ھ/۱۱۵۳ء میں جلا کر خاکستر کر دیا[۵۴]۔ سلطان محمود غزنوی نے سُنّی المذہب ہونے کی وجہ سے رے کے کتب خانہ میں روافض اور اہل بدعت کی وہ تمام کتابیں جلا دیں جو مذہب اہل تسنن کے خلاف تھیں[۵۵]۔ بقیہ کتابیں بچ گئیں۔

شیراز کا عظیم الشان کتب خانہ بتدریج زوال پذیر ہوا۔ بانی کتب خانہ کے جانشین کے عہد میں وہ کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ ابن البواب (کاتب) نے اس کتب خانہ کی ابتری کی نسبت بہاء الدولہ سے شکایت کرتے ہوئے مشہور کاتب ابن مُقلہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن مجید کے تیس پاروں میں سے ایک پارہ گم ہو جانے اور ان منتشر سیپاروں کی تلاش و ترتیب میں ایک عرصہ درکار ہونے کا تذکرہ کیا ہے[۵۶]۔

(بقیہ حاشیہ ۴۹) (کتابیں مستعار لیکر واپس نہ دینے اور خائن لوگوں کے کتابیں چرا لینے کے موضوع پر ایک طویل مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔ آئندہ کسی وقت ہم اس پر لکھیں گے۔ ک) ۵۰ ابن الاثیر جلد ۹ صفحہ ۲۴۶ جلد ۱۰ صفحہ ۵ - بُنداری صفحہ ۱۸، صفدی صفحہ ۲۶ - ارشاد الاریب از یاقوت، جس نے اسکا سنہ ۴۴۷/۱۰۵۵ بتایا ہے ۵۱ قلقشندی ج ۱ صفحہ ۴۶۶ دیکھو میرا پارک مندرجہ بالا۔ ک) ۵۲ ابن الاثیر ۹ صفحہ ۲۹۷ ۵۳ معجم البلدان ۴ صفحہ ۵۰۹ ۵۴ ابن الاثیر ۱۱ صفحہ ۱۲۰ ۵۵ ارشاد ۲ - صفحہ ۳۱۵ ۵۶ ارشاد ۵ - صفحہ ۴۷ - ۴۴۶ -

طرابلس کے خاندان بنو عمار کا کتبخانہ بھی آتشزدگی سے محفوظ نہ رہ سکا اور لٹیرے تاتاری یا اتراک نہ تھے بلکہ عیسائی تھے[1]۔ ۵۰۳ھ کی صلیبی لڑائی میں فرنگی سپاہیوں نے اس کتبخانہ میں آگ لگادی۔ اس واقعہ کی نسبت مورخ ابن الفرات (۸۰۷ھ) لکھتا ہے:-

وقال الشیخ یحیی بن ابی طی حمید النجار الغسانی الحلبی فی تصنیفہ: کان فی طرابلس (دار العلم) ولم یکن فی جمیع البلاد مثلہا کثرۃً وحسناً وجودۃً. وقال: حدثنی ابی قال حدثنی شیخ من اہل طرابلس قال: کنت مع فخر الملک بن عمار صاحب طرابلس وہو فی شیزر وقد وصلہ اخذ طرابلس فاغمی علیہ وأفاق ودموعہ مستبقۃ وقال: "واللہ ما اسفی علی شیئ کاسفی علی (دار العلم) فان فیہا ثلاثۃ آلاف الف[4] کتاب کلہا فی علم الدین والقرآن والحدیث والادب" وقال ان بہا خمسون الف مصحف وان فیہا عشرین الف تفسیر لکتاب اللہ عزوجل۔ قال ابی وکانت ہذہ (دار العلم) من عجائب الدنیا وکان بنو عمار قد عنوا بہا العنایۃ العظیمۃ کان فیہا مائۃ وثمانون ناسخاً ینسخ بالجرایۃ والجامکیۃ منہم ثلاثون نفساً لا یفارقونہا لیلاً ولا نہاراً وکان لہم فی جمیع البلاد من یشتری

شیخ یحیی بن ابی طے حمید النجار غسانی حلبی کا بیان ہے کہ طرابلس میں ایک دار العلم (کتبخانہ) تھا۔ جس کی نظیر، اس کی کتابوں کی کثرت اور اُن کی خوبصورتی کے لحاظ سے دنیا میں نہیں ہے۔ یحیی کہتے ہیں کہ مجھ سے طرابلس کے ایک بزرگ نے ذکر کیا کہ میں فخر الملک ابن عمار[2] والی طرابلس کے ساتھ شیزر[3] میں تھا جبکہ اُسے فرنگیوں کے ہاتھ سے فتح ہو جانے کی اطلاع ملی تو اُس پر غشی طاری ہوگئی اور جب افاقہ ہوا تو اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اُس نے مجھ سے کہا "بخدا! مجھے کسی چیز کا اتنا افسوس نہیں ہوا جتنا کہ اس دار العلم (کتبخانہ) کی تباہی کا۔ اس میں دینیات قرآن و حدیث اور ادب سے متعلق تیس لاکھ کتابیں تھیں۔ جن میں سے صرف پچاس ہزار نسخے قرآن مجید کے اور بیس ہزار جلدیں تفاسیر کی تھیں"۔ میرے والد مجھ سے بیان کرتے تھے کہ یہ دار العلم دنیا کے عجائبات میں سے تھا، اور بنو عمار نے اس پر پوری

[1] دیکھو ہنری لامنس کا مضمون۔ الصلیبیون ومکتبات طرابلس الشام۔ رسالہ المشرق ۱۹۲۲ء صفحہ ۱۰۷۔
[2] ابو طالب ابن عمار قاضی طرابلس جو ۴۶۲ھ میں وہاں کے حاکم بن گئے تھے۔ اُنکے بعد اُنکا بھتیجا فخر الملک اُن کا جانشین ہوا۔ تاریخ ابن القلانسی (طبع آمدروز لیڈن ۱۹۰۸ء) صفحہ ۹۔ [3] قلعہ شیزر حماۃ کے قریب واقع ہے جہاں صلیبیوں کے حملۂ طرابلس کے وقت فخر الملک چلا گیا تھا۔ ابن القلانسی صفحہ ۱۶۲ ابن الاثیر، ۱۰ صفحہ ۳۴۵ [4] غالباً یہ غلطی ہے آلاف الف ہے۔ ایک الف کاتب کی زیادتی معلوم ہوتی ہے۔

لهم الكتب المنتخبة - وكانت طرابلس فى ايام
بنى عمار قد صارت جميعها دار علم و قصدها الفضلاء
من سائر الاقطار و نفقت على بنى عمار سائر العلوم
و قصدهم الناس بها لا سيما علم الامامية فلما
اجبوه و احبوا اهله[1] - قال : لما دخل الفرنج
الى طرابلس و افتتحها احرقوا (دار العلم) وكان
السبب فى احراقهم لها ان بعض القسوس
لعنهم الله تعالى لما رأى تلك الكتب هاله و
اتفق انه وقع فى خزانة المصاحف الكرام
فمد يده الى مجلد فاذا هو مصحف ثم الى آخر
فرآه كذلك ثم الى آخر فوجده مصحفا حتى اعتبر
عشرين مجلدا فقال كل ما فى هذه الدار هو
قرآن المسلمين فلذلك احرقوها و تخطف
الفرنج لعن الله من مضى منهم و خذل من بقى
منهم اشياء من الكتب وهى التى خرجت
الى بلاد المسلمين[3] -

توجہ مبذول کی تھی - اس میں ۱۸۰ کاتب اجرت پر کام کرتے
تھے جن میں سے ۳۰ کاتب شب و روز کتابت کے لیے
حاضر رہا کرتے تھے - چیدہ کتابوں کی بہم رسانی کے لیے
تمام شہروں میں بنی عمار کی طرف سے ایجنٹ مقرر تھے
جو کتابیں خریدتے تھے - بنی عمار کے عہد میں طرابلس
تمام تر "دار العلم" (علم کا گھر) بن گیا تھا جہاں اطراف و
اکناف سے بڑے بڑے فضلا آتے تھے - انکے عہد میں تمام
علوم کو ترقی حاصل ہوئی، خصوصاً فرقۂ امامیہ کے علم کو کہ
بنی عمار اسکو اور اسکے جاننے والوں کو بہت پسند کرتے تھے
جب فرنگیوں نے طرابلس میں داخل ہو کر اسکو فتح کر لیا
تو اس کتبخانہ میں آگ لگادی - اسکا سبب یہ ہوا
کہ راہبوں میں سے ایک شخص (اُن پر خدا کی لعنت
ہو!) اس کتبخانہ میں داخل ہوا اور ان کتابوں کو
دیکھ کر ششدر رہ گیا - اتفاق سے وہ دار العلم کے اس کمرہ
میں داخل ہوا جہاں مصاحف کرام رکھے ہوئے تھے -
اُس نے ایک نسخہ اُٹھا کر دیکھا تو قرآن مجید تھا - پھر
دوسرا نسخہ اُٹھایا، وہ بھی کتاب مجید ہی تھی - اسی طرح
اُس نے یکے بعد دیگرے بیس نسخے اُٹھا کر دیکھے اور سب کو
قرآن مجید پایا - تو بول اُٹھا کہ اس مکان میں جتنی کتابیں ہیں
سب کے سب مسلمانوں کے قرآن کی جلدیں ہیں[2] - اس لیے

[1] اجبوه و احبوا اہلہ کو مسٹر پنٹو نے غالباً احبوا و احبوا اہلہ پڑھا ہے اور اسی لیے اس کا ترجمہ غلط کیا ہے [2] اس سے معلوم ہوگا کہ راہب مذکور ابھی کتبخانہ کے اُس حصہ میں داخل نہ ہونے پایا تھا جہاں کتابیں فن وار مرتب کر کے رکھی ہوئی تھیں - [3] (ابن الفرات کی تاریخ کا یہ اقتباس مصر کے مجلۂ الزہراء جلد ۲ صفحہ ۱۱۲ - ۱۱۱ - سے منقول ہے - آخری ترجمہ جو متن میں دیا گیا ہے براہ راست اصلی قلمی نسخے سے کیا گیا - کاترمیر نے اپنی تاریخ مصر جلد ۲ صفحہ ۵۰۷ - ۵۰۶ (صفحہ آئندہ

فرنگیوں نے اس (دار العلم) کو جلا دیا اور (خدا اُنکے اگلوں پر
لعنت کرے اور پچھلوں کو ذلیل وخوار کرے!) ان کی بڑی بڑی
تعداد کتابیں اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ وہی کتابیں ہیں جو بلاد اسلامیہ
میں پہونچ گئی ہیں۔

قاہرہ اور قرطبہ کے کتبخانے بھی ایسی ہی جانکنی کی حالت میں رفتہ رفتہ نیست و نابود ہو گئے۔ خلیفہ الحاکم فاطمی کی وفات کے وقت قاہرہ کے کتبخانہ کی حالت ابھی ٹھیک تھی۔ چنانچہ اسکے جانشین کے وزیر ابو القاسم علی بن احمد الجرجرائی نے ۴۳۵ھ (۱۰۴۳ء) میں اسکی نئی فہرست تیار کرائی اور جلدوں کی مرمت و اصلاح کرائی۔ مگر رفتہ رفتہ یہ کتبخانہ بھی زوال پذیر ہو گیا۔

(حاشیہ ۳۲) میں اس عبارت کا ترجمہ دیا ہے گو وہ ذرا آزادانہ ترجمہ ہے۔ زمانہ حال کے صلیبی معرکوں کے مورخ مشن میاڈ (تاریخ جنگہائے صلیبی جلد ۱ صفحہ ۳۰۵ (فرنچ) اور تاریخ جنگ صلیبی چہارم ص ۱۱۶) اور ولکن (تاریخ جنگہائے صلیبی جلد ۲ ص ۲۲۱ (جرمنی) نے اسی ترجمہ کا تتبع کیا ہے۔ اس واقعہ کے متعلق عیسائی مورخوں (جنہوں نے چھوٹی سی چھوٹی جزئیات کو بھی نہیں چھوڑا) کی خاموشی نے بعض مصنفین کو (خصوصاً لامنس کو اپنے مضمون متذکرہ بالا میں) ابن الفرات کے اس بیان کی نسبت مشکوک بنا دیا ہے۔ کم از کم وہ اسکو کچھ مبالغہ سمجھتا ہے۔ اسکے خیال میں اس عرب مورخ نے کتبخانہ اسکندریہ کے احراق کے مقابلہ میں یہ واقعہ اختراع کیا ہے۔ واقعی اس واقعہ سے جہاں عربوں کا اپنے تمدنی ورثہ کی تباہی پر رنج و ملال ظاہر ہوتا ہے، وہاں صلیبیوں کے لیے یہ امر ذرا بھی تعجب خیز نہ تھا۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن ہی سے ناآشنا تھے یا وہ اس سے متنفر تھے۔ انھوں نے کتبخانہ طرابلس کی تاخت و تاراج کو ایسا ہی فعل سمجھا جیسا کہ عموماً ہر جگہ ہمیشہ ہوتا چلا آیا ہے اور اس لیے یہ بات قابل ذکر نہیں ہو سکتی۔ (یورپین) مورخ ہر اُس بات کا انکار کر دیا کرتے ہیں جو اُنکے معتقدات کے خلاف ہو چنانچہ مستشرقین یورپ کی لکھی ہوئی تواریخ اسلام میں اسکی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ عدم العلم عدم الشئی کو مستلزم نہیں ہے۔ اس لحاظ سے عیسائی مورخین کی خاموشی اس واقعہ کی صحت کے مخالف نہیں ہو سکتی۔ لیکن کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ان مورخوں نے دانستہ اس واقعہ سے اغماض کیا ہو جو انکے ہم مذہبوں کے وحشیانہ طرز عمل کو ظاہر کر رہا ہے؟ اس واقعہ کی ایک نظیر آخر اندلس میں بھی تو ظہور میں آئی تھی؟ اور عیسائیوں ہی کا ایک مقدس پیشوا کارڈینل زمینیز (Ximenes) ہی تو تھا جس نے فتح اندلس کے وقت قرآن کریم کے متعدد نسخوں کو آگ میں جھونک دیا تھا۔ پھر اس واقعہ کو ہمارے مستشرقہ کا بالکل معمولی سمجھ کر قابل ذکر نہ بتانا بھی "فن استشراق" کا ایک حیرت انگیز معجزہ ہے! (اختر) ص۵ تاریخ الحکماء للقفطی صفحہ ۲۲۰۔

خصوصاً خلیفہ المستنصر (۴۲۶ھ - ۴۸۷ھ / ۱۰۳۵ء - ۱۰۹۴ء) کے عہد میں اسکے زمانۂ حکومت میں قاہرہ میں ایک
زبردست بغاوت واقع ہوئی - یعنی اس کی فوج کے حبشی سپاہی، مصری سپہ سالار ناصر الدولہ بن
حمدان کی سرکردگی میں ترک سپاہیوں کے خلاف آمادہ پیکار ہوگئے - آخر بڑی دقتوں سے ناصر الدولہ
نے ۴۶۱ھ / ۱۰۶۸ء میں باغیوں کو شکست دی، اور اپنے لیے اور اپنے فوجیوں کے لیے خلیفہ سے بہت بڑا
معاوضہ (تاوان) طلب کیا - اسکے ساتھیوں میں وزیر ابو الفرج محمد بن جعفر المغربی بھی تھا -
جس نے کارگزاری کے صلہ میں اتنی کتابیں حاصل کیں جو ۲۵ - اونٹوں پر لادی گئیں - اگرچہ
اسکا مطالبہ صرف ۵۰۰۰ دینار کا تھا لیکن جو کتابیں کہ اس نے اپنے لیے منتخب کیں ان کی
قیمت ایک لاکھ دینار سے زیادہ ہی تھی [1]

اسی سال ترکی افواج نے جو کثرت تعداد کی وجہ سے اور غضبناک ہوگئے تھے اور زبردست
طاقت کو اپنے ہاتھ میں لے چکے تھے، ناصر الدولہ مذکور اور اسکے ساتھیوں کو قاہرہ سے نکال دیا
اور کئی مکانات پر تاخت و تاراج شروع کی - ان میں قصر سلطانی کا کتبخانہ بھی تھا جو انکی غارتگری
سے محفوظ نہ رہ سکا - مگر قصر کے "داخلی کتبخانہ" (خزائن القصر الداخلہ) میں جو کتابیں تھیں وہ اس
وجہ سے محفوظ رہ گئیں کہ اس کتبخانہ میں داخل ہونے کا ایک پوشیدہ اور مخفی راستہ تھا [2] - بقیہ
کتابیں اسکندریہ کے ایک گورنر کے ہاتھ لگ گئیں، جسکا نام نہیں معلوم ہو سکا - اور جب یہ کتابیں پھر
قاہرہ بھیجدی گئیں تو حبشی غلاموں نے انھیں لوٹ لیا، چپل بنانے کے لیے انکی (چرمی) جلدیں
پھاڑ ڈالیں، اوراق جلا دیے اور اسکی وجہ یہ بتائی کہ یہ کتابیں قصر سلطانی سے آئی تھیں اور دینیاً
انکے عقائد کے خلاف تھیں [3] - بقیہ کتابیں پھینکدی گئیں، انکے اجزا منتشر کرکے اڑا دیے گئے
اور ان کا جو حصہ جلایا نہ گیا تھا وہ خاک میں مل کر ایک بڑا تودہ ہو گیا جو "تلال الکتب" (تودہ
کتب) کے نام سے مشہور ٹیلوں کے قریب آج بھی موجود ہے [4] -

خلفاء فاطمیہ کے کتبخانوں کی تباہی کی داستان یہیں نہیں ختم ہو جاتی بلکہ ۵۶۷ھ / ۱۱۷۱ء میں جب
صلاح الدین نے مصر کو فتح کیا تو اس نے بھی انکی شکست و ریخت میں حصہ لیا - اور جیسا کہ

---

[1] مقریزی جلد ۱ صفحہ ۴۰۸-۹ [2] ایضاً [3] عام طور پر معلوم ہے کہ خلفاء فاطمیہ شیعہ تھے مگر مصر کے کثر باشندے سنی المذہب تھے - یہ حبشی غلام بھی اغلباً سنیوں میں سے تھے - [4] لفظ "تلال الکتب" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پاپیرس (قافیر) کے ڈھیر تھے - جو عربی کتابوں کے اوراق نہیں بلکہ قدیم مصری قافیر (کوم) تھے جن میں آج بھی طلبۂ علم کی دلچسپی کا مواد موجود ہے -

اوپر بیان ہو چکا، اس نے اپنے وزیر قاضی الفاضل عبدالرحیم بن علی کو ایک لاکھ کتابیں دے ڈالیں اور بقیہ نیلام کرا دیں۔ یہ نیلام ہفتہ میں دو بار ہوتا تھا، اور برسوں تک ہوتا رہا۔ کیونکہ سنہ ۵۷۲ھ (۱۱۷۶ء) میں صلاح الدین کا کاتب (سکرٹری) مورخ عماد الدین اصفہانی بھی ان کتابوں کے خریداروں میں تھا۔ اگرچہ صلاح الدین کے حکم سے کتابوں کی قیمت اس سے نہ لیجاتی تھی۔

قرطبہ کے کتبخانہ کا بھی ایسا ہی دردناک حشر ہوا۔ کمزور خلیفہ ہشام ثانی کے عہد میں جبکہ حکومت کی باگ وزیر منصور بن عامر کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے فلسفہ علم کلام وغیرہ کی تمام کتابیں نکلوا کر کچھ جلوا دیں اور کچھ قصر شاہی کے کنوئیں میں پھینکوا دیں۔ جہاں وہ خاک اور پتھروں سے پاٹ دی گئیں۔ چند برسوں کے بعد یعنی پانچویں صدی میں قرطبہ پر بربری افواج حملہ آور ہوئیں وزیر الواضح (منصور کے پروردہ) نے اس بقیہ کتبخانہ کا ایک حصہ فروخت کر ڈالا اور بقیہ حصہ فاتحین نے تباہ و برباد کر ڈالا۔ اسکے بعد بھی کچھ کتابیں بچ رہی تھیں وہ طلیطلہ لائی گئیں اور غالباً بنو ذوالنون کے خوشنما کتبخانہ کی زینت ہوئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ خلیفہ ہشام ثالث کی وفات کے وقت ملک اندلس چھوٹے چھوٹے ملوک الطوائف میں تقسیم ہو چکا تھا۔

ساتویں صدی ہجری جہاں آزادی خلافت کے لیے مہلک ثابت ہوئی وہاں وہ عربی تمدن اور اسلامی کتبخانوں کے لیے بھی کچھ کم تباہ کن نہ تھی۔ رفتہ رفتہ اس وسیع اسلامی سلطنت پر، جو فرماں رواؤں کی مسلسل خانہ جنگیوں کی وجہ سے بہت کمزور اور انحطاط پذیر ہو چکی تھی، دو قومیں یعنی تاتاری اور مغرب کی عیسائی فوجیں حملہ آور ہوئیں جو اگرچہ مذہب اور تمدن میں ان سے بالکل مختلف تھیں، تاہم وہ ان تمام چیزوں کو مٹا دینے پر تلی ہوئی تھیں جو انکے حریفوں کو بہت عزیز تھیں۔

۱ مقریزی ۱۔ صفحہ ۴۰۹، ابن خلدون ۴، صفحہ ۸۔ اس بیان کے خلاف ابو شامہ صاحب روضتین (جلد ا صفحہ ۲۰۰) کا بیان ہے جو لکھتا ہے کہ صلاح الدین نے قاضی الفاضل کو کتابوں کے انتخاب اور فروخت کے کام پر نگراں مقرر کیا تھا۔ وہ قیمتی کتابوں کی جلدیں نکال نکال کر ان کو ایک گڑھے میں جمع کرتے تھے۔ ۲ کہ کتابوں کی ختم ہونے کے بعد انکو معمولی قیمت پر بیچ دیں جو بالکل نکمی اور ناقص تھیں ۲ الروضتین صفحہ ۲۲۸ ۳ بیان المغرب لابن العذاری جلد ۲ صفحہ ۱۵-۳۱۴ ۴ طبقات الامم صفحہ ۲۶ (بلاد اردو ترجمہ صفحہ ۱۱۵) ۵ ابن خلدون ۴ صفحہ ۱۴۶، مقری ۱ صفحہ ۱۸۰ (جلد ۱ صفحہ ۵-۲۴۹ لیڈن) ۶ ربیرا کی کتاب

لیکن جبکہ اندلس کے عیسائی ایک طرف مسلمانوں کو نکالکر "عربی تمدن" کے بجائے اپنے تمدن قائم کرنا چاہتے تھے (گو وہ خود بڑی حد تک عربی تمدن سے متأثر ہو چکے تھے) تو دوسری طرف مغلوں نے، جو بہت کم مہذب تھے، مذہب اسلام قبول کرلیا، اور رفتہ رفتہ ان مغلوں میں بھی مذہب اسلام نے کتابوں کا شوق پیدا[1] کر دیا۔ خاندان مغلیہ نے جو ہندوستان میں قائم ہوا، سب سے پہلے "غذائے دماغی" کی ضرورت محسوس کی: تمام علوم و فنون کو ترقی دی، اور انکی محافظت کی۔ چنانچہ انکے عہد حکومت میں کتبخانے قائم ہوئے، جن میں عربوں کے عظیم الشان تمدنی ورثہ کے "باقیات الصالحات" جمع کیے گئے تھے۔ انکے بعد عثمانی ترکوں نے بھی اپنے پایۂ تخت قسطنطنیہ میں خاصکر سولھویں اور سترھویں صدی میں بڑے بڑے کتبخانے جمع کیے جن میں سے اکثر مساجد کے ساتھ وابستہ تھے۔ اور سب سے عمدہ اور نادر کتبخانہ خود سلاطین ترک کے موروثی املاک سے تیار ہوا تھا۔ بہرحال، زیادہ تر انیسویں اور بیسویں صدی میں اقوام مغلوبہ میں حب وطن، حریت اور اپنی تہذیب و تمدن کے مقدس اور ناقابل سپرد ورثہ کی حفاظت کے جذبات پیدا ہوگئے اور ان ہی جذبات نے اسلامی شرق (بلاد شرقیہ اسلامیہ) کو بھی خواب غفلت سے بیدار کر دیا ہے۔ چنانچہ یورپ کے تتبع میں تہذیب و تمدن کے تمام مظاہر زندہ اور قائم کیے گئے ہیں۔ انکے ساتھ ہی کتبخانوں کا احیاء بھی ہوا ہے۔ بلاد اسلامیہ میں اسوقت جو کتبخانے موجود ہیں وہ اگرچہ انکے شاندار ماضی کے احیاء کی طرف بہت معمولی کوشش ہے تاہم اس سے اسلامی تہذیب کے نشاۃ الثانیہ اور اپنے خزائن تہذیب کو باقاعدہ ترتیب دینے کا میلان صاف نمایاں ہو رہا ہے۔ مصر نے جو یورپ سے قریبی تعلق رکھتا ہے سب سے پہلے یورپین طرز پر کتبخانے قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی اور وہاں کا کتبخانۂ خدیویہ جو اب "کتبخانہ القومیہ" بن گیا ہے، اس کو سب سے پہلے[2] جرمنی مستشرق اشپیالک، وولرز، اور موریٹز نے ترتیب دیا تھا[3] اس کتبخانہ میں کئی قیمتی مخطوطات ہیں جو پہلے مصر کی مختلف جامع مسجدوں میں منتشر تھیں، اور جنھیں موجودہ طرز پر ایک

---

[1] مشہور ہے کہ اس نیچر نے کتابوں کے شوق پیدا کرنے کا محرک "اسلام" کو ٹھیرایا! اختر

[3] اطالوی مستشرق گرافینی کو ۱۹۲۰ء میں کتبخانۂ خدیویہ کی تنظیم و ترتیب سپرد کی گئی تھی۔ لیکن مئی ۱۹۲۵ء میں انکی وفات کے باعث وہ کام پورا نہ ہوگا (اسوقت سے پروفیسر جین ڈینی اس کام کو انجام دے رہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ اب تک کام میں مصروف ہے۔ ک)

طرح مرتب کیا گیا ہے کہ تمام اقوام کے لوگ ان سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

کتبخانہ مذکور کے ناظم اول ایڈیٹا کے زمانے سے اس کتبخانہ میں تعلیم یافتہ کاتبوں کا ایک خاص اسٹاف موجود تھا جو اہل علم اور محققین کی خواہش پر انکے لیے ان مخطوطات کی صحیح نقلیں مہیا کرتے تھے۔ فی الحال اس کتبخانہ میں فوٹوگرافی سے کتابیں نقل کرانے کا طریقہ داخل کیا گیا ہے۔

اس کتبخانہ کے علاوہ مصر اُن ذاتی کتبخانوں کے وجود پر بھی نازاں ہے جن میں بیش بہا مخطوطات موجود ہیں۔ ان میں سے کتبخانہ تیموریہ[1] بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسکے مالک امیر احمد تیمور پاشا مصر کے زبردست فضلائے عصر میں سے ہیں۔

قسطنطنیہ بھی اس تحریک میں پیچھے نہیں رہا۔ کیونکہ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے اس شہر میں سولھویں اور سترہویں صدی میں کئی کتبخانے تھے جن کی کتابیں متعدد مدارس اور جوامع میں بکھر کر منتشر ہو گئی ہیں۔ ان تمام کتابوں کی ایک فہرست چالیس جلدوں میں تیار کی گئی ہے۔ گو ابھی اس فہرست میں بہت کچھ اصلاح و اضافہ کی گنجائش ہے۔ طلبہ علم کے لیے کپرولو، ینی جامع، توپ قپوسرائے، حمیدیہ وغیرہ کتبخانے کتابوں کی قیمتی کانیں ہیں جن میں بعض نہایت اہم اور بیش بہا عربی کتابیں دستیاب ہوتی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ حکومت جمہوریۂ ترکی ان خزانوں کی حفاظت کرنے کو اپنا فرض سمجھے گی اور پہلے کی بہ نسبت یورپ کے طلبہ کو ان سے زیادہ استفادہ کا موقعہ دیگی۔

پچھلے چند برسوں میں شام میں مغربی اثرات بکثرت دائر و سائر رہے ہیں۔ چنانچہ بیروت میں علاوہ اور کتبخانوں کے آبائے الیسوعیین کی مساعی جمیلہ سے، جو سینٹ جوزف یونیورسٹی کو چلا رہے ہیں قلمی کتابوں کا ایک اہم اور نادر ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے۔ اسی طرح دمشق میں، جہاں کے دور اندیش اور باغ نظر گورنر مدحت پاشا نے تقریباً ۱۸۷۸ء میں سب سے پہلے اس تحریک کو

[1] دیکھو اسکندر معلوف کا مضمون "الخزانۃ التیموریہ" مجلۃ المجمع العلمی العربی میں جلد ۳ صفحہ ۲۲۵ (احمد تیمور پاشا نہایت فیاضی سے طلبہ کو اپنے بے نظیر کتبخانہ سے استفادہ کرنے کی اجازت دیتے ہیں، بلکہ وہ تو اسے نقل لینے تک کے روادار ہیں۔ اسی قسم کا ایک کتبخانہ غیرہ میں احمد زکی پاشا کا ہے جو قسطنطنیہ کے کتبخانوں کی بہت سی نادر مخطوطات کی عکسی نقلوں سے مالامال ہے اور اس کا فیاض مالک بھی اپنے اس بیش بہا خزانہ کے استعمال کے لیے "صلائے عام" دیتا ہے۔ ک)

ترقی دی تھی، کئی کتبخانے معرض وجود میں آچکے ہیں -

عراق کے پایۂ تخت اور قدیم دار الخلافہ بغداد کے کتبخانے بھی پچھلے پچاس سال سے بہت افسوسناک حالت تنزل و انحطاط کو پہونچ گئے ہیں جسکی ابتداء سولھویں اور سترہویں صدیوں سے ہو چکی ہے - سیلابوں، وباؤں، اور آخر میں (گو رتبہ میں کم نہیں) یورپینوں کے ہاتھ مخطوطات کے فروخت ہو جانے سے تمام قلمی نوادرات ادھر اُدھر بکھر گئے ہیں - سنہ ۱۹۰۹ء تک مساجد کے ساتھ کتبخانوں کا وجود پایا جاتا تھا جن میں سب سے اہم کتبخانہ شیخ عبد القادر جیلانی (قدس اللہ سرہ) کا تھا - آجکل تمامتر فاضل کرملی الاب[1] انستاس کی سعی و کوشش کی بدولت اور اسکے زیر نگرانی بغداد میں ایک نہایت اہم تحریک علمی شروع ہو گئی ہے - فاضل موصوف عربی کا زبردست عالم اور نوادر خطیات کا مالک ہے - جزیرہ نمائے عرب کے اندرونی حصہ میں بڑے بڑے شہروں مثل مکہ، مدینہ، کے کتبخانے[2] بہت غیر مشہور ہیں، اگرچہ یقیناً ان میں بہت قیمتی اور نایاب قلمی کتابیں موجود ہیں جیسا کہ فاضل علامہ شیخ الشنقیطی وغیرہ کے ان منقولہ نسخوں سے معلوم ہوتا ہے جو انھوں نے کاؤنٹ لینڈبرگ کے لیے وہاں سے نقل کیے تھے -

اور ذخائر کتب یمن میں موجود ہیں، خصوصاً شہر صنعاء میں جہاں لومبارڈی کے تاجر کپروٹی (Caprotti) نے رفتہ رفتہ یمنی خطیات کی ایک تعداد کثیر حاصل کر لی ہے - جو ایک بڑے ذخیرہ کی صورت میں میلان (رومہ) کے کتبخانۂ امبروسانیہ (شاہی) میں محفوظ ہیں - پروفیسر گریفینی نے اسکی ایک فہرست مرتب کی تھی مگر اسکی قبل از وقت موت کی وجہ سے وہ ناتمام رہ گئی - یمن سے آئے ہوئے اور چھوٹے چھوٹے ذخیرے برلن اور متحف برطانی (برٹش میوزیم لندن) کے کتبخانوں میں موجود ہیں - یمن اور اطلی کے خوشگوار تعلقات سے یہ امید بندھتی ہے کہ وہ دن دور نہیں جبکہ عربی دنیا کا یہ دور ترین حصہ بھی علمی حیثیت سے چھان ڈالا جائیگا -

فرانسیسی حکومت کے زیر اثر ٹونس، الجیریا، اور مراکش میں بھی کتبخانے قائم ہو چکے ہیں جہاں آئے دن نت نئی کتابوں کی بھرتی ہوتی رہتی ہے - اسوقت سند ذیل

---

[1] نادر کرملی عربی لغات و ادب کا زبردست ماہر ہے - مجلۃ لغۃ العرب اسی کی ادارت میں بغداد سے نکلتا ہے جو اسکی لغوی اور ادبی تحقیقات کا مرکز اشاعت ہے - اختر

[2] دیکھو علامہ سید سلیمان ندوی کا مضمون "حجاز کے کتبخانے" مطبوعہ معارف بابت اکتوبر، نومبر و دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء - اختر

کتبخانے اپنے قیمتی ذخائر کی وجہ سے بہت مشہور ہیں:-
(١) کتبخانۂ جامع زیتونیہ تونس میں -
(٢) مدرسۂ تلمسان کا کتب خانہ -
(٣) رباط مراکش کا کتب خانہ -
آخر الذکر کی ایک فہرست حال ہی میں شایع ہو چکی ہے -

ہندوستان نے بھی اُن کثیر التعداد قلمی ذخیروں کے ساتھ جو اُسکے بڑے بڑے شہروں مدراس، بمبئی اور صوبجات بنگال اور پنجاب میں موجود ہیں، انگلستان کی معاونت سے نہایت فخر کے ساتھ اس تمدنی تحریک کو جاری رکھا ہے جس کی ابتدا خاندان مغلیہ نے سولھویں اور سترہویں صدی میں کی تھی[1]۔

مگر اس وقت مشرق میں قلمی کتابوں کی حفاظت کے لیے جو کچھ کیا گیا ہے وہ کسی طرح کافی نہیں ہے۔ اب بھی بے شمار جواہر پارے بکھرے ہوئے پڑے ہیں جن میں سے کچھ تو خانگی اشخاص کے ہاتھوں میں ہیں جو خود انکی قیمتوں سے ناواقف ہیں، اور کچھ چھوٹے چھوٹے مدارس اور مسجدوں میں جمع ہیں جہاں وہ اس طرح مدفون ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں نہیں ہوتی۔ نہ صرف انکو اس تاریکی سے نکال کر مصائب زمانہ سے محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے اور نہ بڑے بڑے معابد میں انکو داخل کرا دینے کی، بلکہ انکی باقاعدہ اور علمی اصول پر نہایت صحت کے ساتھ فہرستیں تیار کرنے (اور بوقت حاجت انکی نقلیں بذریعہ فوٹوگرافی لینے کی ضرورت ہے

[1] ایل۔ بویلط کا مضمون "مجالس علمیہ، مطبوعات سرکاری اور ہندوستان کی کتابوں" مطبوعہ ریویو دو موندے مسلمان جلد ۲ صفحہ ۵۹۹، (مصنف نے ہندوستان کے عام کتب خانوں میں عربی مخطوطات کے ذخیروں کی نسبت تفصیل سے نہیں لکھا۔ ہندوستان میں وہ نایاب خزانے ہیں جن کی تلاش مغرب کے کتب خانوں میں کرنا فضول ہے۔ اگرچہ خوش قسمتی سے رفتہ رفتہ باقاعدہ فہرستوں کی اشاعت کے ذریعہ اہل علم ان خزانوں سے واقف ہوتے جا رہے ہیں تاہم ابھی کئی خزانے اس ملک میں نامعلوم طور پر پڑے ہوئے ہیں۔ انڈیا آفس کے کتبخانہ میں وہ تین ہزار عربی مخطوطات پڑے ہوئے ہیں جو کبھی دہلی کے کتبخانہ شاہی کا ایک جزو تھے۔ ان کی فہرست اب تک نہیں بنائی گئی۔ اسی طرح کتبخانہ برلین اور تحفہ بوطانی کے کتب خانوں میں کثیر التعداد مخطوطات کے نہایت اہم اضافے ہوئے ہیں ان میں سے ایک ہزار کتابوں کی فہرست نہیں تیار کی گئی۔ ک)

تاکہ دنیا کے اور حصوں میں بھی لوگ ان کے مطالعہ سے بہرہ اندوز ہو سکیں - اس مقصد کے لیے
مغرب کے مستشرقین اور مشرق کے علما و فضلاء کو چاہیے کہ وہ باہم متفق ہو جائیں اور مل جل کر
کام کریں چنانچہ اول الذکر اگر اپنے طرق علمیہ (سائنٹفک) کو کام میں لائیں تو موخر الذکر اپنے
ملک کی تمدنی روایات سے متعلق اپنی واقفیت اور عربی زبان کے صحیح تبحر علمی کو اس میں کھپائیں
تاکہ عربی تہذیب اور تمدن کا مطالعہ جو پچھلے دنوں بہت کچھ ترقی یافتہ نظر آتا ہے، نہایت
کامیاب اور بڑے زوروں سے جاری رہے -

شامل ہو گئے، جو فوج اسکی سرکوبی کیلئے بھیجی گئی تھی وہ اُسکی ہوشیاری سے اسکے لیے ایک قسم کی مدد ثابت ہوئی، کورٹیز نے ان کے ساتھ نہایت مہربانی اور محبت کا برتاؤ کیا اور تالیف قلوب کی۔

اس واقعہ کے چند روز بعد ایک پیغامبر یہ خبر لایا کہ اہل میکسیکو مسلح ہو کر ہسپانویوں سے برسرپیکار ہو گئے ہیں اور انھوں نے وہ چھوٹے جہاز جنکو کورٹیز نے بنوایا تھا تاکہ جھیل پر اہل سپین قابض رہیں توڑ ڈالے ہیں اور انھوں نے بعض ہسپانویوں کو قتل اور زخمی کر دیا ہے اور ان کے ذخیرے کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا ہے، اندیشہ ہے کہ دشمن ان سب کو قتل کر ڈالے یا بھوکوں مار دے، کورٹیز یہ اطلاع پاکر فوراً میکسیکو کی طرف روانہ ہوا اور ٹلیکسکالا کے مقام پر دو ہزار آزمودہ کار ہندوستانی سپاہی اس کے ساتھ ہو گئے جس طرح پہلے ہر مقام پر وہاں کے معزز آدمی اُس سے آکر ملاقی ہوتے تھے اب کوئی نہ آیا جس سے اسے پتہ لگ گیا کہ سب لوگ ہسپانویوں کے خلاف ہو گئے ہیں، لیکن اپنی غلطی سے انھوں نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا، بجائے اسکے کہ وہ رستے میں کورٹیز کا مقابلہ کرتے اور اس کو ادھر ادھر مصروف رکھتے تاکہ میکسیکو کے ہسپانویوں کو بآسانی شکست دی جاسکتی انھوں نے کورٹیز کو دق اور پریشان کیے بغیر منزل بمنزل کوچ کرنے دیا، آخر کار جب وہ میکسیکو پہنچا تو لڑائی ہو رہی تھی، اس میں شک نہیں کہ توپوں کی مدد سے ہسپانویوں نے بہت سے آدمیوں کو فنا کر دیا تھا لیکن اہل میکسیکو بدلہ لینے پر تلے ہوئے تھے، انکی فوج دیگر مقامات سے روزانہ چلی آتی تھی اور ان میں شامل ہوتی جاتی تھی، ایک معرکہ میں ہسپانویوں کے بارہ آدمی قتل ہوئے اور ساٹھ آدمی زخمی ہو گئے خود کورٹیز بھی زخمی ہو گیا۔

جب کورٹیز نے دیکھا کہ اس طرح کام نہیں چلتا اور اہل میکسیکو سے لڑ بھڑ کر چھٹکارا ملنا دشوار ہے تو اُس نے مونٹی زوما کے ذریعہ سے اس کی رعایا کو جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کی چنانچہ اس کو فصیل پر شاہانہ لباس پہنا کر بٹھایا گیا، لوگوں نے اُسے دیکھا تو جھک کر سلام کیا، جب وہ اپنی رعایا سے یہ کہہ چکا کہ ہسپانویوں سے لڑنا بیکار ہے تو اُسکی رعایا نے ہسپانویوں پر تیر اور پتھر برسانا شروع کر دیے، اس حملہ سے بادشاہ کے بھی چوٹ آئی اور وہ گر پڑا۔ ہسپانوی اسے ایک محفوظ مقام پر لے گئے، وہ زندگی سے دل برداشتہ ہو گیا اور ہر چند کوشش کی کہ وہ کچھ کھائے پیے مگر اس نے خورد و نوش بالکل ترک کر دیا اور گھل گھل کر مر گیا، اب اہل میکسیکو کو لڑائی سے باز رکھنا ناممکن تھا اور کورٹیز حیران تھا کہ کیا کرے آخر کار ایک شب کو اس نے ارادہ کیا کہ وہ شہر سے باہر نکل جائے۔ لیکن اہل میکسیکو

اس کی یہ سب تیاریاں دیکھ رہے تھے جب وہ اپنے ہمراہیوں کو لیکر روانہ ہوا تو اُس پر اہل میکسیکو ٹوٹے اور اگرچہ
بازاروں اور گلیوں میں ان کے خون کے نالے بہہ گئے لیکن ہسپانوی بھی جب شہر سے باہر نکلے تو انکی تعداد صرف نصف
رہ گئی تھی بعض ان میں سے قتل ہو گئے تھے اور بعض جھیل میں گر کر ڈوب گئے تھے توپخانہ گولہ بارود اور دیگر سامان
سب ہاتھ سے جاتا رہا تھا گھوڑوں کی زیادہ تعداد اور ٹلیکسکلانی دو ہزار سے زائد قتل ہو گئے تھے اُنھوں نے جو
خزانہ جمع کیا تھا اس میں سے بھی بہت تھوڑا باقی بچا تھا خزانہ کا ہاتھ سے نکلجانا ان کے لیے خاص مصیبت کا باعث تھا
کیونکہ وہ ہمیشہ مال و دولت ہی کی تلاش میں رہتے تھے اور سچ پوچھو تو ہسپانویوں کی زیادہ تعداد اسی حرص و طمع کی
بدولت فنا ہوئی کیونکہ وہ سونے کی سلاخوں سے لدے ہوئے تھے جسکی وجہ سے نہ وہ بخوبی لڑ سکے اور نہ تیزی کیساتھ فرار ہو سکے

ہسپانویوں کی واپسی

اب اہل اسپین نے ٹلیک سکلا کا رخ کیا اور چھ دن تک دلدلوں اور پہاڑوں کو عبور کرتے رہے اہل میکسیکو
کبھی دور سے اور کبھی قریب سے ان پر حملہ بھی کرتے جاتے تھے چھٹے روز یہ لوگ اوٹمبا پہنچے اور وہاں مختلف اطراف و
جوانب میں آدمیوں کی بہت سی جماعتیں دیکھیں اہل اسپین برابر کوچ کرتے رہے یہاں تک کہ وہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر
پہنچے اسکے بعد ایک وسیع وادی میں بے انتہا آدمی نظر آئے ان کو دیکھ کر بہادر سے بہادر ہسپانوی بھی خوفزدہ ہو گیا
صرف کورٹیز کے ہوش و حواس بجا رہے اُس نے اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ اب صرف دو صورتیں ہیں یا تو ان لوگوں سے
لڑ بھڑ کر فنا ہو جاؤ یا ان کو فتح کر لو اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں چنانچہ اس نے فوراً حملہ کر دیا ہندوستانی نہایت
بے خوفی سے ان کے سامنے ڈٹے رہے اور اپنی بہادری کا ثبوت دیا لیکن تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو ترتیب اور
فوجی قابلیت ہمیشہ اس طاقت پر جو بھونڈے طریقے سے استعمال کی جائے غالب آجاتی ہے پس اہل اسپین ان کو
قتل کرتے ہوئے اور ان کی صفوں کو چیرتے ہوئے وہاں سے نکل گئے دوسرے دن وہ ٹلیک سکلا کی مملکت میں پہنچے
اور باوجود اس کے کہ وہ اس وقت مصیبت زدہ تھے ان کے اتحادیوں نے ان کا خیر مقدم کیا کورٹیز نے ویرا کروز
سے تین توپیں اور کچھ گولی بارود کا سامان حاصل کیا اور چار جہاز ہسپانیولا اور جمیکا روانہ کیے تاکہ کچھ رضا کار اور
سامان حرب وہاں سے لے کر آئیں اُس نے یہ سمجھکر کہ میکسیکو فتح کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے کہ جب تک جھیل پر
قبضہ نہ ہو بارہ چھوٹے جہاز بنوائے تاکہ خشکی کی راہ سے ان کے ٹکڑوں کو لے جاکر جھیل میں موزوں کیا جائے اور

اس طرح جہاز ٹکڑے کر دیے جائیں ۔

میکسیکو پر دوسرا حملہ

جب کورٹیز اپنے جہازوں کی واپسی کا بےچینی کے ساتھ انتظار کر رہا تھا تو ویلاسکیز نے دو جہاز کورٹیز کی امداد
کے لیے اور بھیجے، ان کو ورا کروز پر ٹھہرنے کی ترغیب دی گئی اور ملاحوں اور سپاہیوں کو موقع کی نزاکت سے آگاہ کر کے
اس بات پر مائل کیا گیا کہ وہ کورٹیز کی ہمراہی میں دشمن سے لڑیں اس طرح کورٹیز کو ایک سو اسی آدمی اور بیس گھوڑے
مل گئے اب اس کی فوج پانسو پچاس پیدلوں اور چالیس سواروں پر مشتمل تھی اور نو توپیں تھیں، دس ہزار ٹلیکسکلانی
اور دیگر ہندوستانی بھی اس کے ہمراہ روانہ ہوئے، اب اس نے ایک مرتبہ پھر سلطنت میکسیکو کو فتح کرنے کیلیے قدم اٹھایا
اس نے اپنا کوچ دار السلطنت کی طرف ۲۸ دسمبر ۱۵۲۰ء کو اپنی مصیبت زدہ واپسی کے چھ ماہ بعد شروع کیا ۔
مونٹی زوما کے مرنے کے بعد کوٹ لواک اس کے بھائی کو تخت نشین کیا گیا، وہ اہل سپین کے سخت خلاف تھا وہ
اسی کی سرداری میں ہندوستانی سپاہیوں کو شہر سے باہر نکالنے پر قادر ہوئے تھے اس نے ان کے چلے جانے کے بعد
شہر کو مستحکم بنایا اور ان کی دوبارہ حملہ آوری میں روڑے اٹکائے لیکن ہندوستانیوں کی بدقسمتی کہ وہ چیچک میں
مبتلا ہو کر مر گیا، یہ مرض ان ممالک میں کبھی نہیں ہوا تھا مگر اہل سپین نے اس کو وہاں پہنچا دیا اور منجملہ اور مصائب کے
یہ سخت مصیبت بھی اہل میکسیکو کو جھیلنی پڑی، اس کے مرنے کے بعد اہل میکسیکو نے مونٹی زوما کے بھتیجے اور داماد
گوٹموزن کے سر پر تاج شاہی رکھا جس وقت کورٹیز دشمن کی مملکت میں داخل ہوا اس نے دیکھا کہ اس کی
رفتار کو روکنے کے لیے مختلف تیاریاں ہو رہی ہیں لیکن اس کی فوج کو ٹیزکوکو کو فتح کرنے اور اس پر قابض ہونے
میں زیادہ وقت نہیں ہوئی یہ شہر اپنی اہمیت کے لحاظ سے میکسیکو سے دوسرے نمبر پر تھا اور اس سے بیس میل کے
فاصلہ پر واقع تھا، اس نے اس شہر کو اپنا صدر مقام بنایا وہاں کے سردار کو معزول کیا اور ایک اور شخص کو سردار بنایا
جس نے اہل سپین کو بے حد مدد دی ٹیزکوکو جھیل سے ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا لہذا ضروری معلوم ہوا کہ
شہر اور جھیل کے درمیان ایک نہر بنائی جائے تاکہ اس میں جہازات کے مختلف حصے لا کر ان کو اس طرح موزوں کیا جائے
کہ وہ جہاز بن جائیں، آٹھ ہزار ہندوستانی مزدور نہر کھودنے کے کام پر لگائے گئے اسی دوران میں آس پاس کے
شہروں نے کورٹیز کے پاس پیغامات اطاعت بھیجے اور وہ تاج اسپین کے باج گذاروں میں شامل ہو گئے

وادی میں داخل ہونے کے بعد کورٹیز کی یہ تجویز تھی کہ دارالسلطنت پر حملہ کرنے سے قبل وہ دیگر ماتحت شہروں کو فتح کرے چنانچہ اس نے ازٹاپیلاپان شہر پر حملہ کیا جس میں خود اس کے بیان کے مطابق پچاس ہزار باشندے تھے انہوں نے نہایت دلیری سے دشمن کا مقابلہ کیا لیکن ان کو شکست ہوئی اور وہ شہر کی دیواروں کے اندر پناہ گزیں ہوگئے، کورٹیز نے خود اپنی قلیل فوج اور اپنے ہندوستانی اتحادیوں کو ہمراہ لے کر ان کی جائے پناہ پر حملہ کیا اور سخت بے رحمی اور سنگ دلی کے ساتھ نہ صرف لڑنے والوں کو بلکہ عورت، مرد سب کو کسی امتیاز کے بغیر قتل کر ڈالا، چھ ہزار آدمیوں سے زائد دم کے دم میں فنا ہوگئے اس شہر کی تباہی کے بعد دوسرے شہروں کے باشندوں پر عجیب خوف طاری ہوا اور وہ اطاعت گزار ہونے کے لیے درخواستیں پیش کرنے لگے، رفتہ رفتہ تمام شہر جن پر میکسیکو کی طاقت کا انحصار تھا اس سے علٰحدہ ہوگئے اور وہ صرف تن تنہا اپنی قسمت آزمائی کے لیے چھوڑ دیا گیا۔

نہر تیار ہوگئی تھی اور چھوٹے جہازات بھی حملہ کے لیے تیار تھے، ان سب جہازوں کی تعداد تیرہ تھی، پچاس ہزار ہندوستانی بھی کورٹیز کے ہمراہ تھے میکسیکو کا محاصرہ کیا گیا، خشکی اور تری دونوں جگہوں پر ہسپانویوں کو فتح حاصل ہوئی، کورٹیز نے تین چوتھائی شہر کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا، گوٹموزن جھیل کو عبور کر کے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا کہ گرفتار ہوگیا اور کورٹیز کے سامنے پیش کیا گیا، غنیمت ہے کہ اس نے اس کی جان بخشدی اور اسکو عزت کیساتھ رکھا

دوسرے دن تمام شہر کو خالی کرنیکا حکم دیا گیا اور کہا جاتا ہے کہ تیس ہزار سے لے کر ستر ہزار تک مرد تھے جو تلوار، وبا اور آگ سے بچ گئے تھے، بچوں اور عورتوں کی تعداد ان کے علاوہ تھی، ان لوگوں کو دق اور پریشان کیے بغیر شہر سے باہر جانے کی اجازت دی گئی، جب یہ وہاں سے نکلے تو حسرت و افسوس کے ساتھ اپنے شہر پر آخری نظر ڈالتے جاتے تھے، یہ نظارہ نہایت دردناک تھا، اگرچہ بے رحم اور سنگ دل ہسپانویوں کو اس سے مسرت ہوتی تھی۔

یہ اندازہ کرنا کہ شہر کے محاصرہ میں کتنے آدمی قتل و غارت ہوئے مشکل ہے کم از کم ایک لاکھ بیس ہزار اور زیادہ سے زیادہ دو لاکھ چالیس ہزار کا اندازہ کیا جاتا ہے، ان تمام واقعات میں جو بات سب سے زیادہ عجیب ہے وہ یہ کہ حالات اصلی نہیں معلوم ہوتے، بالکل یہ گمان ہوتا ہے کہ ہم کوئی قصہ پڑھ رہے ہیں اور قصہ بھی ایسا فرضی اور خیالی جیسی داستان امیر حمزہ، سمجھ میں نہیں آتا کہ جب مقتولین کی اس قدر تعداد ہے تو وہ اکیلا ہسپانویوں پر کیوں قابو نہ پا سکے؟ مگر یہ خیال کرنا ہی غلط ہے کہ سلطنت میکسیکو کو صرف ہسپانویوں نے اپنے بل بوتے پر فتح کیا

درحقیقت ہندوستانیوں نے خود اپنی سلطنت کو ان کے لیے فتح کیا، اگر ٹلیسکلا ہسپانویوں کے برخلاف رہتا اور ان سے صلح و آشتی کر کے ان کی ہر طرح امداد نہ کرتا اور ان کے شریک حال دوسرے فرقے نہ ہو جاتے تو ہسپانوی ہرگز فاتح کے لقب سے ملقب نہ ہوتے، سلطنت میکسیکو کا زوال ہندوستانیوں کی بدولت ہوا جنکے رہنما اہل اسپین تھے اس سلطنت کے انحطاط سے اس بات کا عمدہ ثبوت ملتا ہے کہ کوئی حکومت اپنی رعایا کی ہمدردی بغیر زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی اور کوئی ارادہ جس کی بنیاد فارغ البالی اور ترقی انسان پر مبنی نہ ہو موت اور فنا سے نہیں بچ سکتا خواہ تہذیب کی روشنی اس کے لیے مہلک ثابت ہو یا جبر و طاقت خواہ باہر سے حملہ آور ہو یا اندر سے پیدا ہو کر اس کی ہلاکت کا باعث ہو۔

میکسیکو کو از سر نو تعمیر کیا گیا لیکن دیگر شہروں کو صرف تباہ و غارت کیا گیا، ہسپانوی جہاں کہیں گئے ان کے قدموں کے نشانات خون آلودہ ہیں، ملک پینوکا میں ساٹھ سردار اور چار سو امرا ایک وقت آگ میں جلا دیے گئے اور ان کے بچوں اور عورتوں کو مجبور کیا گیا کہ ان کو آگ میں جلتے ہوئے دیکھیں، اس خونخوار تماشہ کے بعد اور بھی زیادہ خونخوار تماشے دکھائے گئے۔ مختصر یہ کہ ہسپانویوں کے ظلم و ستم کی داستان کہاں تک بیان کیجائے یہ حالات پڑھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں افسوس! یہ ہسپانویوں اور اہل یورپ کی داستان کا نمونہ ہے جس پر ان کو ناز ہے، کورٹیز کا انجام بھی اچھا نہ ہوا، اس کو شاہ اسپین نے میکسیکو سے واپس طلب کر کے حکومت سے محروم کر دیا نہ صرف یہ بلکہ اس کے خون ریز کار نمایاں کے صلہ میں کوئی انعام بھی اس کو نہ دیا۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

یہ میں نے مانا کہ آج خنجر امرا گلو بھی نہیں رہے گا ٭ مگر میں قاتل کی اے ستمگر! ہمیشہ تو بھی نہیں رہے گا

باب پانزدہم

فتح پیرو

جس وقت اہل یورپ نے براعظم امریکہ کو دریافت کیا اس وقت میکسیکو اور پیرو کی دونوں قومیں طاقت اور شائستگی کے لحاظ سے امریکہ کی اور قوموں سے افضل و برتر تھیں اگرچہ دونوں تہذیب کے لحاظ سے یکساں تھیں۔ لیکن عادت اور خصلت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔

سلطنت پیرو ہسپانوی حملہ کے وقت بحر الکاہل کے تقریباً دوسرے درجے سے جانب شمال جنوبی عرض البلد کے ستینیسویں
درجہ تک وسیع تھی یعنی ایکویڈر، پیرو، بولی ویا اور چلی کی موجودہ جمہوری سلطنتوں کی مغربی حدود تک پھیلی ہوئی تھی
اس کے عرض کا ٹھیک اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ بے شک وہ جانب غرب ہر جگہ سمندر سے ملی ہوئی تھی لیکن جانب
شرق پہاڑوں سے گذر کر وحشیوں کے ممالک تک وسیع تھی جن کے نام و نشان کا اب پتہ نہیں ہے۔ نہروں اور راجبوں کے
ذریعے سے سواحل کی آبپاشی ہوتی تھی جس کی بدولت وہاں شگفتگی اور زرخیزی نمایاں تھی، بھیڑوں کو بھی پالا جاتا تھا
اور ان کے چراگاہیں موجود تھیں۔ سطح مرتفع کے بلند میدان میں جفاکش آبادی رہتی تھی۔ شہر اور قصبہ آباد تھے
جن کے اندر باغات اور پھلواریاں تھیں۔

ٹی ٹی کاکا جھیل پر ایک کھنڈر موجود ہیں جن کو اہل پیرو قوم انکا کی آمد سے پیشتر کے بتاتے ہیں یہ کھنڈر
آئندہ کی نفیس تعمیرات کے لیے ایک نمونہ ثابت ہوئے، فتح پیرو سے قبل صرف تیرہ بادشاہ گذر چکے تھے جنکی مدت حکمرانی
بعض کے نزدیک چار سو سال ہے اور بعض ڈھائی سو سال تبلاتے ہیں، بہرحال اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے
کہ قوم انکا سے پیشتر بھی یہاں ایک تہذیب یافتہ قوم آباد تھی۔ اول اول اہل پیرو کی ترقی آہستہ اور قریب قریب
ناقابل احساس تھی۔ اپنی دانشمندانہ اور معتدل حکمت عملی سے انھوں نے قرب و جوار کے تمام فرقوں کو اپنی حدود
سلطنت میں ملا لیا کیونکہ وہ اُن کے باقاعدہ اور رعایا نواز طرز حکومت کے فوائد سے باخبر ہو گئے تھے۔ اب وہ زیادہ
مضبوط ہو گئے تو انھوں نے جبر و طاقت سے کام لینا شروع کیا لیکن اپنے بزرگوں کے فیاضانہ دعاوی کے ادعا کو بھی
ہاتھ سے نہ جانے دیا اور امن و امان اور تہذیب کا اعلان تلوار کے ذریعہ سے کیا۔ ملک کی وحشی قومیں قوم انکا سے
مغلوب و مفتوح ہو گئیں مگر پندرھویں صدی کے اواسط سے قبل نامور ٹوپا انکا یونیکی جس کا پوتا اہل اسپین کی آمد کے
وقت وہاں کا بادشاہ تھا۔ ریگستان اٹاکاما کو عبور نہ کر سکا اور چلی کے جنوبی ملک سے گذر کر اپنی سلطنت کی حدود
دریائے مول پر قائم نہ کر سکا، اس کا بیٹا ہوناکپاک بھی اپنے باپ کی طرح حوصلہ مند اور فوجی قابلیت سے بہرہ مند
تھا، اس نے جانب شمال کورڈیلرا کی برابر کوچ کیا اور خط استوا کو عبور کر کے کیٹو کی طاقتور سلطنت کو پیرو میں شامل
کر لیا اکزکو کا قدیم شہر جو دولت اور آبادی کے لحاظ سے بے حد ترقی کر رہا تھا۔ پیرو کا دار السلطنت بنایا گیا، جانب شمال
ایک مضبوط قلعہ تعمیر ہوا جس کے کھنڈر آج تک اپنی وسعت کے لحاظ سے سیاح کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔

پیرو کے شرفا دو درجوں میں منقسم تھے، نہایت اہم اور اول قسم کے امرا قوم انکا میں سے تھے، چونکہ وہاں
بہت زیادہ بیویاں کرنے کا رواج تھا لہذا اکثر ایک بادشاہ کی اولاد دو سو بچوں تک پہنچ جاتی تھی اور اس طرح
قوم انکا کے امرا تعداد میں بہت زیادہ تھے، دوسرے درجہ کے شرفا کرا کا تھے یعنی مفتوحہ قوموں کے سردار یا ان کی
اولاد اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مفتوحین کو انکی جگہ پر فرمانبردار رہنے دیا جاتا تھا اور وہ صرف اپنے بچوں کو تعلیم کیلیے دار السلطنت
بطور ضمانت وفاداری بھیجدیا کرتے تھے اور خود بھی کبھی کبھی حاضری دیتے تھے، قوم انکا، پیرو کی سلطنت کی اصل
طاقت تھی، یہ امرا قرابت مندی اور یکساں فوائد کی بنا پر اپنے بادشاہ سے محبت رکھتے تھے، ان کا لباس ان کی
علامات اور ان کی زبان دوسری محکوم قوموں سے بالکل مختلف تھی اور صدیاں گزر جانے کے بعد بھی وہ ان سے
علیحدہ شناخت کیے جاتے تھے۔ وہ مفتوحہ قوموں کے لیے ایسے ہی تھے جیسے اہل روما سلطنت کے وحشی گروہوں کے
لیے یا اہل نارمن جزائر برطانیہ کے قدیم باشندوں کے لیے تھے اگرچہ وہ زیادہ تر دار السلطنت میں رہتے تھے لیکن تمام
فوجی اور انتظامی عہدے ان کو دیے جاتے تھے اور وہ اکثر دور دراز مقامات پر بھی جا کر رہتے تھے اور وہ بڑی بڑی
چھاؤنیوں اور بڑے بڑے شہروں میں حکمراں ہو کر بھی جاتے تھے، وہ ذہین اور سمجھدار تھے اور کسی بغاوت یا خطرے کو
فوراً دفع کر دیتے تھے!

ایکویڈور کی قدیم تاریخ

یہ کوئی نہیں جانتا کہ تمام فرقے جو اس ملک میں آباد تھے ایک ہی قوم سے تھے یا نہیں اور انکے کتنے بادشاہ
اور کس قسم کے تھے، اس کا بھی حال کسی کو معلوم نہیں صرف کیوٹو کی نسبت جو آخری بادشاہ تھا یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے
سے پہلے کے تمام بادشاہوں سے زیادہ طاقتور تھا، اور اس کی سلطنت پچاس صوبوں سے زائد کے درمیان واقع تھی
جو تقریباً خود مختار تھے یہ حالت صدیوں تک رہی جبکہ ایک فرقہ جو فرقہ کرا کے نام سے موسوم ہے اور جس کا بادشاہ
شیری کران تھا بحر الکاہل کے کناروں سے دریائے ایزمرلڈا کی وادی میں آیا اور کیوٹو کی سلطنت پر سنہ ۹۸۰ء میں
قابض ہو گیا، سنہ ۱۳۰۰ء سے تین سو بیس برس قبل گیارہ بادشاہ یکے بعد دیگرے ہوتے رہے، اُن کے بعد تین شیری بادشاہ
سنہ ۱۴۵۰ء تک حکمراں رہے اور اپنے بزرگوں کی سلطنت کو فتح یا اتحاد سے وسعت دیتے رہے، اس ملک کی شہرت نے
پیرو کی قوم انکا کی حرص و آز کو مشتعل کیا، اور ٹوپاک یوپانکی جو اس وقت قوم انکا کا حکمراں تھا، کیوٹو کی سلطنت پر

حملہ آور ہوا اور شہر موچا تک تمام علاقہ ۱۴۶۱ء میں فتح کر لیا۔ لیکن اس صوبہ کے مقابلہ نے اس کی رفتار فتح کو روک دیا، ہول کوپوڈ وجی سیلا جو چودھواں تسری تھا اس وقت وہاں فرمانروا تھا، اس کا بیٹا کاچا پندرھواں تسری ہوا اور اس نے صوبہ پدہو (چیمورازد) کو دوبارہ حاصل کر لیا جسکو فاتح ٹوپاک یوپان کی جیساکہ ہم نے ذکر کیا ہے غصب کر لیا تھا لیکن کاچا کا صوبہ قوم انکا کا تابع فرمان رہا، اپنے باپ ٹوپاک یوپانکی کی وفات کے بعد ہوناکپاک اعظم تخت نشین ہوا جو فاتح کے لقب سے مشہور ہے اور وہ ۱۴۷۵ء میں کزکو میں ایک فوج جمع کرکے کیوٹو کی سلطنت کو فتح کرنے کے لیے چلا، وہ خود سپہ سالار بنا اور کچھ فتوحات کے بعد ہیٹن ٹاکی پر نمایاں فتح حاصل کی جس میں کاچا جو پندرھواں تسری تھا مارا گیا، ہوناکپاک نے اس کی دختر پاچا سے شادی کر لی اور اس طرح سلطنت کیوٹو کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، ہوناکپاک اس فتح کے بعد پھر کزکو واپس نہ گیا اور کیوٹو میں رہنے لگا، اس نے اڑتیس سال تک حکومت کی۔ یہ زمانہ نہایت شاندار اور پرامن تھا۔ پاچا سے اس کے ایک لڑکا ہوا جس کا نام اٹاہولپا تھا کزکو میں اس کا پہلا لڑکا ملکہ راوا اولو سے پیدا ہو چکا تھا، ہوناکپاک ۱۵۲۵ء میں فوت ہوا اور اپنی سلطنت کو دونوں لڑکوں میں متفرق چھوڑ کر مر گیا، انکا ہوسکار کزکو کی سلطنت میں حکمراں ہوا اور تسری اٹاہولپا کیوٹو کی سلطنت کا مالک بنا لیکن دونوں بھائیوں میں برتری کے لیے لڑائی ہوئی اور اٹاہولپا نے غلبہ حاصل کیا یہ وہ وقت تھا جب اہل اسپین پیرو میں آئے۔

چلی کی قدیم تاریخ

چلی میں ہسپانویوں کی آمد سے قبل مولوکس (سورما) رہتے تھے اگرچہ ان سب کی زبان ایک تھی لیکن وہ مختلف جرگوں میں منقسم تھے، ہولی کس اس ملک میں رہتے تھے جو چلو اور والدیویا کے درمیان واقع ہے، پیونکس ذرا شمال کی طرف تھے اور دریائے مول یا نپل تک پھیلے ہوئے تھے، پیونکس سب سے زیادہ کثیر اور طاقتور تھے اور اوکاس یا اروکیناس بھی ان میں شامل تھے۔ بیا بیو کے جنوب میں جو لوگ آباد تھے اور جن کے چار جرگے تھے وہ بھی اسی نام سے موسوم تھے، پیونکس نام اب تک چلا آتا ہے اور شمال کی جانب انڈس کی وادیوں میں اور مشرقی دامان کوہ میں آباد ہیں، ہر جماعت چار فرقوں میں منقسم تھی اور مختلف خاندانوں کا ہر ایک فرقہ مشترک مفاد سے وابستہ تھا، ہر فرقہ کا ایک سردار ہوتا تھا، جنگ کے وقت یہ مختلف فرقے متحد ہو جاتے تھے اور اس وقت انکا ایک سردار

ٹوکی کے نام سے موسوم ہوتا تھا، اہلِ اسپین کی آمد کے پچاس سال پہلے انکایوپانکی نے چلی پر حملہ کیا تھا اور اس ملک کو اپنا محکوم بنا لیا تھا۔ ان کی حکومت مہربان اور رحم دل تھی انھوں نے زراعت اور مختلف صنعتوں کو درجۂ تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔ ان کے یہاں سڑکیں، نہریں اور پل موجود تھے۔ جب اہلِ اسپین فتوحات کی غرض سے آئے تو چلی کے وسط اور شمال کے ہندوستانی امن و امان اور محنت کے عادی ہو چکے تھے۔

پزارو کی مہم

میکسیکو کی فتح کے بعد ۱۵۲۴ء میں تین گمنام اشخاص نے جو پناما میں تھے جانب جنوب فتوحات کی تجویز کی۔ یہ اشخاص فرانسسکو پزارو، ڈیگو ڈی الماگرو اور ہرنانڈو لوکو تھے اول الذکر دو شخص سپاہیوں کے بیٹے اور مجہول النسب تھے اور آخر الذکر ایک پادری تھا اور ایک مکتب میں بچوں کو تعلیم دینے کے کام پر مقرر تھا۔ اُس نے نہیں معلوم کس طرح سے وافر دولت حاصل کر لی تھی لیکن اُس کے دو رفقائے کار کے پاس کچھ نہ تھا۔ ان تینوں میں باہم معاہدہ ہو گیا اور اگرچہ ان کا مقصد لوٹ مار اور قتل و غارت کے سوا اور کچھ نہ تھا تاہم انھوں نے اپنے معاہدہ کو مذہبی رسوم کے ساتھ پختہ بنا لیا تھا، انھوں نے متفقہ کوشش سے ایک چھوٹا جہاز تیار کیا جس میں ایک سو بارہ آدمی سوار تھے اور گورنر نے ان کو اجازت دیدی کہ وہ جنوبی ممالک کی تحقیقات کریں۔ اس جہاز کو پزارو لے کر چلا اور اس کے بعد الماگرو ستر آدمی اور لے کر اس کی مدد کو روانہ ہوا، یہ آدمی اور یہ ذرائع تھے جن سے دنیا کی نہایت وسیع سلطنتوں میں سے ایک فتح کی جانے والی تھی، وہ بہت سے مقامات پر اترے اور انھوں نے بہت سی تکالیف برداشت کیں۔ آخر کار وہ چلی کے ساحل پر پہنچے، اور ٹیکامیز پر اُتر پڑے، انھوں نے ملک کو زرخیز پایا اور وہاں ایک سفید سوتی کپڑے اور سونے چاندی کے زیور پہنے ہوئے تھے۔ اگرچہ ہسپانوی انھیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئے لیکن انھوں نے چونکہ وہ تھکے ماندے اور کچھ بیمار بھی تھے اس قلیل جماعت سے ان پر حملہ آور ہونا مناسب نہ سمجھا وہ گیلو کے جزیرہ میں قیام پذیر ہوئے اور الماگرو پناما میں واپس گیا تاکہ اور امداد لے کر آئے اور پزارو کو وہیں چھوڑ گیا۔

اب پناما میں دوسرا گورنر آ گیا تھا۔ اسنے یہ خیال کر کے کہ رنگ روٹ بھرتی کرنے سے پناما کی سلطنت کمزور ہو جائیگی الماگرو کو فوج بھرتی کرنے کی ممانعت کر دی اور ایک جہاز پزارو اور اس کے ساتھیوں کو واپس لانے کے لیے بھیجا، پزارو نے گورنر کے حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا اور اپنے ساتھیوں کو بھی ترغیب دی کہ وہ واپس نہ جائیں، لیکن صرف تیرہ آدمی

اس کے ساتھ رہ گئے اور بقیہ ہمراہی واپس چلے گئے۔ یہ لوگ گارگونا پہنچے جہاں وہ پانچ ماہ تک رہے۔ اس کے بعد ایک
جہاز اور آیا تاکہ انھیں پناما لیجائے لیکن اتفاق سے جہاز کے لوگ پزارو کی ماتحتی میں مہم کے لیے تیار ہوگئے اور پناما واپس
جانے کے بجائے وہاں سے جنوب و مشرق کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ جہاز پیرو کے ساحل پر جا لگا۔ چند مقامات کو انھوں نے
اُتر کر دیکھا بعد ازاں یہ لوگ ٹمبز پہنچے۔ یہاں ایک شاندار مندر اور شاہی محل تھا۔ مندروں میں نہ صرف چاندی سونے
کی چیزیں نظر آئیں بلکہ جواہرات بھی کثیر تعداد میں دکھائی دیے۔ پزارو نے اپنی قلیل جماعت سے کوئی حملہ کرنا مناسب نہ سمجھا
اور اس نے صرف مال تجارت فروخت کرنے پر اکتفا کی۔ وہاں سے دو نوجوان بھی اپنے ہمراہ لیے اور کہا کہ ان کو اسپین کی
زبان سکھائی جائے گی حالانکہ اُس کا مقصد صرف اُن کو ترجمان کی حیثیت سے رکھنا تھا۔ وہ چاندی اور سونے کی پلیٹ بھی
لایا تاکہ گورنر پناما کو دکھا کر اُسے ایک مہم روانہ کرنے پر آمادہ کرے لیکن گورنر پناما نے اب بھی پزارو اور اس کے ساتھیوں کی
تجویز سے انحراف کیا۔ اُس نے مجبور ہو کر براہ راست شاہ اسپین سے اجازت طلب کی اور آپس میں یہ طے کر کے کہ پزارو
اُس ملک کا جو مفتوح ہوگا گورنر اور المگرو نائب گورنر اور لوکی لاٹ پادری ہوگا وہ اسپین پہنچا اور وہاں اُسے توقع سے
زائد امداد ملی۔ لیکن اُس نے سب کچھ اپنے لیے حاصل کیا اور المگرو کے لیے کوئی عہدہ نہ حاصل کیا البتہ لوکی کو لاٹ پادری کا
عہدہ دلوا دیا۔ جب پزارو پناما واپس پہنچا تو المگرو اس کے اس رویے سے سخت ناخوش ہوا اور اس کی مہم میں روڑے
اٹکانے شروع کیے اور خود ایک علیحدہ مہم لیجانے کا تہیہ کیا۔ پزارو نے اس کے اس ارادے سے خوفزدہ ہو کر المگرو سے
باہمی تصفیہ کر لیا اور نائب گورنری کا عہدہ اس کے حق میں چھوڑ دیا۔

ان دونوں کی تمام کوششوں کے باوجود صرف تین جہاز دستیاب ہو سکے اور ایک سو آٹھ آدمی فراہم ہوئے
لیکن وہ اس قلیل جماعت کو لے کر حملہ آوری کے قصد سے چل پڑا۔ وہ خلیج سینٹ میتھیو میں پہنچا اور جنوب کی طرف بڑھ کر
صوبہ کوک میں چالیس ہزار ڈالر کی چاندی اور سونا لوٹا۔ اُس کا کثیر حصہ اس نے المگرو کے پاس ایک جہاز میں بھر کر بھیجا
تاکہ وہ رنگ روٹ بھرتی کرے۔ اور دوسرا جہاز نکارا گوا بھیجا۔ غرض وہ اسی طرح لوٹ مار کرتا ہوا ٹمبز پہنچ گیا۔ ملک کے باشندے
ان کی صورت دیکھ کر فرار ہو جاتے تھے اور کوئی مقابلہ نہ کرتے تھے۔ اب اس کو امداد بھی پہنچنی شروع ہو گئی تھی۔ یہ اُس کی
خوش قسمتی تھی کہ پیرو اور کیوٹو میں جو دو بھائی حکمران تھے جن کا ذکر کیا جا چکا ہے آپس میں لڑ رہے تھے اور اس وقت ملک
خانہ جنگی میں مبتلا تھا۔ اگر پزارو اپنے پہلے سفر میں حملہ آوری کا ارادہ کرتا تو شاید کامیاب نہ ہوتا لیکن اس مرتبہ

ملک کی خراب حالت اُس کی کامیابی کا باعث ہوئی۔ پزارو کسی مقابلے کے بغیر لوٹ مار کرتا ہوا سلطنت کے مرکز میں
پہنچ گیا۔ اس وقت اس کو اور اس کے ہمراہیوں کو خانہ جنگی کا علم ہوا۔ چنانچہ ہسکر نے ان لوگوں کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ
اٹاہولپا کے خلاف اس کی امداد کریں کیونکہ اٹاہولپا غاصب اور باغی ہے۔ پزارو نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا اور
اس نے سوچا کہ اس ترکیب سے دونوں بھائیوں کا قلع قمع کر دیا جائے۔ اب اس کے ہمراہ باسٹھ سوار اور ایک سو دو
پیدل تھے جن میں سے بیس کے پاس تیر کمانیں تھیں اور تین کے پاس بندوقیں تھیں۔ پزارو کیزامالکا کی طرف بڑھا۔ یہ
مقام سینٹ مچل سے بارہ دن کے فاصلے پر تھا اور یہاں اٹاہولپا بہت سے لشکر کے ساتھ مقیم تھا وہ کچھ زیادہ نہیں بڑھا
تھا کہ ایک سفیر تحف و ہدایا لے کر انکا کی طرف سے پہنچا اور اُس سے درخواست کی کہ وہ ان کے قریب ہو کر اتالپا کی
سرکوبی کرے۔ اس نے اس وقت نہایت چالاکی سے یہ بات بنائی کہ میں اپنے شاہ سپین کا سفیر ہوں اور اٹاہولپا کی
مدد کے لیے آیا ہوں تاکہ اس کے مخالفین سے بدلہ لوں یہ کہہ کر اس نے آگے بڑھنے کا حکم دیا اور اٹاہولپا نے اس خیال سے
کہ وہ اُس کا رفیق اور ہمدرد ہے اس کے کوچ میں کوئی روڑا نہ اٹکایا۔ اگر ہندوستانی اس وقت متفق ہو کر اس پر حملہ
کرتے تو اس کی قلیل جماعت ضرور تباہ و برباد ہو جاتی غرض وہ ایک قلعہ کے بعد دوسرے قلعہ پر قابض ہوتا چلا گیا
یہاں تک کہ کیزامالکا کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں اس نے ایک نہایت شاندار مکان پر قبضہ کر لیا جو معلوم ہوتا کہ انکا کا
محل تھا اور اپنے آدمیوں کو مناسب موقع سے بٹھا کر اپنے بھائی اور ایک دو اور آدمیوں کو اٹاہولپا کے پاس بھیجا کہ
وہ پزارو سے آکر ملاقات کرے اور اس دوستانہ پیغام کو جو اسے اس کے بادشاہ نے بھیجا ہے سُنے۔

اٹاہولپا کو چلنے کی ترغیب دی گئی اور آخرکار وہ راضی ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ نہایت شان و تجمل کے ساتھ
اس کی سواری پزارو کی طرف روانہ ہو۔ چنانچہ بہت سے ہندوستانی نہایت عمدہ لباس پہنے ہوئے اور سونے چاندی
کے زیورات گلے میں ڈالے ہوئے اگلے روز پزارو کے مقام کی طرف چلے۔ وہاں اس نے اٹاہولپا کو ہاتھوں ہاتھ لیا
اور اس سے علیحدہ گفتگو کرنے کے بہانے سے ایک کمرے میں جا کر بٹھا دیا۔ وہاں ایک پادری کو بھیجا گیا۔ پادری نے
مذہب عیسوی کی تمام باتیں از اول تا آخر اُس کو سنائیں جو ترجمان کی نااہلیت سے اس کی کچھ سمجھ میں نہ آئیں
لیکن جب پادری نے اُس سے کہا کہ تم اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرو تو اس نے اس سے انکار کیا
اور جو انجیل اس کو دیکھنے کے لیے دی گئی تھی وہ اس نے زمین پر پھینک دی۔ اس پر پادری نے اُسے بُرا بھلا کہا

اور پزارو نے فوراً اس کو گرفتار کر لیا اور اس کے بہت سے ہمراہیوں کو قتل کر دیا۔ ہندوستانی رنجیدہ اور غمگین واپس چلے گئے۔ جب اٹاہولپا نے دیکھا کہ وہ قید کر لیا گیا ہے تو اُس نے ہسپانویوں سے کہا کہ جس کمرے میں وہ قید ہے وہ اس کو سونے سے بھر سکتا ہے بشرطیکہ اس کو رہا کر دیا جائے۔ پزارو نے وعدہ کیا کہ اس کو چھوڑ دیا جائے گا اگر وہ اس قدر فدیہ ادا کر دے گا، چنانچہ اس نے اپنے اعیان سلطنت کو حکم دیا کہ جس طرح ممکن ہو اس قدر سونا فراہم کر دو کہ یہ کمرہ بھر جائے، اس کے ماتحتوں نے دو چار روز کے اندر تمام کمرے کو جو بائیس فیٹ طویل اور سولہ فیٹ عریض تھا سونے کے برتنوں سے بھر دیا۔ اب مقید بادشاہ نے اپنا وعدہ پورا کرنے کے بعد اپنی رہائی کی درخواست کی لیکن مکار پزارو نے ایفائے وعدہ کے بجائے اُس کی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہا، چنانچہ اس نے اپنے دو تین ماتحتوں کو جج بنا کر اس کے مقدمے کی سماعت کی اور اسے موت کی سزا کا حکم دیا۔ اس نے یہ دیکھ کر کہ موت سے کسی طرح چھٹکارا نہیں یہ التجا کی کہ آگ سے رفتہ رفتہ جلانے کے بجائے تلوار سے اُس کا سر کاٹ دیا جائے۔ اس کو یہ جواب دیا گیا کہ اگر وہ عیسائی ہو جائے تو اس کے ساتھ یہ نرمی روا رکھی جا سکتی ہے، چنانچہ وہ اس مصیبت سے بچنے کے لیے عیسائی ہو گیا اور اس کو تلوار کے ذریعہ سے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔

جب اس بے قیاس دولت کی خبر نیاما، نکاراگوا اور گوئٹے مالا پہنچی تو وہاں سے سیکڑوں کی تعداد میں زنگ روٹ روانہ ہو گئے حالانکہ وہاں کے گورنروں نے کوشش کی کہ وہ نوآبادیوں کو نہ چھوڑیں، لیکن اب کون سنتا تھا یہاں پہونچ کر یہ قسمت آزما لوگ پزارو کی ملازمت میں داخل ہوتے جاتے تھے، اب پزارو کے پاس اتنی فوج جمع ہو گئی کہ اُس نے کزکو پر قبضہ کر لیا جو اس ملک کا دارالسلطنت تھا۔ اس شہر پر قابض ہونے سے پزارو کو اور بھی بے اندازہ دولت مل گئی۔

اہل پیرو کی بغاوت

جب پزارو اس طرف مشغول تھا تو بنیلکزار جو سینٹ مچل پر افسر فوج تھا کچھ جمعیت لے کر کیوٹو کی تسخیر کیلیے روانہ ہوا، دریاؤں اور پہاڑوں کو عبور کرتا ہوا وہ کیوٹو میں پہنچا اور اس پر قابض ہو گیا، پزارو نے اندرونی حالت کو خاموش اور قابل اطمینان سمجھ کر ساحل سمندر پر ۱۵۳۵ء میں ایک شہر جس کا نام لیما تھا آباد کیا، اسی دوران میں المگرو چلی کی تسخیر پر روانہ ہو گیا اور پزارو نے اکثر جماعتیں دور دراز صوبوں کے سخر کرنے کے لیے روانہ کیں۔ ان

مختلف مہمات سے جو فوج کزکو میں تھی اس کی تعداد بہت کم ہوگئی تھی اہل پیرو نے اب یہ دیکھ کر کہ فوج کم رہ گئی ہے اور اہل اسپین کا منشا ان کے ملک کو چھوڑنے کا نہیں ہے بلکہ اس میں مستقل آباد ہونے کا ہے یہ ارادہ کیا کہ اپنے خونخوار حملہ آوروں کو ملک سے خارج کرنا چاہیے۔

تمام سلطنت میں ایسے خفیہ طریقے پر اور ایسی تیزی کے ساتھ تیاریاں کی گئیں کہ اہل اسپین کو اس کا کچھ پتہ نہ چلا اور مینکو کپاک جس کو اب سب نے بادشاہ تسلیم کر لیا تھا کزکو سے فرار ہوگیا اور اس نے فوراً علم جنگ بلند کر دیا ہر جگہ سے فوجیں طلب کی گئیں اور دو لاکھ آدمیوں سے کزکو کا محاصرہ کیا گیا جس کو صرف ایک سو تیرہ ہسپانویوں نے نو ماہ تک دشمن سے محفوظ رکھا۔ ایک کثیر فوج نے لیما پر بھی حملہ کیا اور دونوں شہروں کے درمیان ہر قسم کی مراسلت بند کر دی اہل پیرو نے نہ صرف جوہر مردانگی دکھائے بلکہ اپنے دشمنوں کی تقلید میں ترتیب و تنظیم بھی حاصل کر لی، ان کے بہادروں کے پاس نیزے اور تلواریں تھیں اور بعضوں کے پاس بندوقیں بھی تھیں جو ان کو ہسپانویوں سے مل گئی تھیں، ان میں سے بعض گھوڑوں پر بھی سوار تھے جن کا رہنما خود انکا تھا، یہ گھوڑے انھوں نے اپنے حملہ آوروں سے چھین لیے تھے اور ہسپانوی سواروں کی طرح حملہ کرتے تھے چنانچہ اہل پیرو نے نصف حصہ دار السلطنت کا اپنے دشمنوں سے دوبارہ لے لیا اور اہل اسپین مایوس ہو چلے تھے اگر اسی حالت مایوسی میں المگرو، کزکو پر نمودار ہوا، انکا نے فوراً اپنی بہادر فوج سے اس پر حملہ کیا لیکن بد قسمتی سے اسے شکست ہوئی اور اس کی فوج منتشر ہوگئی اس کے بعد المگرو نے اہل اسپین کو جو شہر کی حفاظت کر رہے تھے اپنا مطیع بنانا چاہا لیکن پزارو نے لیما سے پانسو آدمی بطور کمک بھیجے تھے وہ آگئے، المگرو اور اس کمک سے معرکہ آرائی ہوئی جس میں المگرو فتحیاب ہوا اور شہر اس کے قبضہ میں آگیا، مکار پزارو نے یہ دیکھ کر کہ المگرو نے شہر پر قبضہ کر لیا ہے تصفیہ کی گفتگو شروع کر دی اور عرصہ تک اسی بات چیت میں وقت گذارتا رہا، جب پزارو نے کافی فوج جمع کر لی تو شہر پر حملہ کیا اور المگرو اور اسکے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ المگرو کو بغاوت کے الزام میں سزائے موت دی گئی۔

ہندوستانی بجائے اس کے کہ اپنے ارادے کو درجۂ تکمیل تک پہنچاتے جنگ کے بعد خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے اور پھر انھوں نے ہسپانویوں کا کوئی مقابلہ نہ کیا، پزارو تمام سلطنت پر قابض ہوگیا اور اس نے المگرو کے قتل کے بعد تمام صوبے اپنے دوستوں میں تقسیم کر دیے ۱۵۴۵ء میں پوٹوسی کے مقام پر چاندی کی کانیں

دریافت ہوگئیں جس سے بے شمار دولت اہل اسپین کے ہاتھ آئی لیکن پزارو کا بھی انجام اچھا نہ ہوا۔ پزارو کو اس کے مخالفین نے لیما میں قتل کر دیا اور اُس کا سر عرصے تک بازار میں لٹکا رہا بعدازاں اُس کو دفن کیا گیا۔

پزارو سخت مکار تھا لیکن اس کی مکاری کچھ عرصے تک ضرور اس کے کام آئی ورنہ اکثر مکار آدمی صرف ایک دغابازی سے اپنی تباہی کا باعث ہو جاتا ہے بلاشبہ اُس نے الگرو کے ساتھ دھوکے بازی سے اہل اسپین کے قلوب اپنے خلاف کر لیے اور آخر کار یہی امر اس کی ذلیل موت کا باعث ہوا۔ اتاہولپا اور بعدازاں انکا مونکا سے مکاری کر کے اُسنے اہل پیرو کو اپنا مخالف بنا لیا اور پزارو کا نام دغابازی کا مرادف ہو گیا۔ الگرو نے اس سے خانہ جنگی کے ذریعہ بدلہ لیا مونکا نے بغاوت کی اور اس کی نوآبادی اُس کے ہاتھ سے جاتی رہی اور خانہ جنگی نے اُس کی جان ہی لے کر چھوڑی اُس کے مرنے کے بعد حکومت اسپین نے مختلف لوگوں کو یکے بعد دیگرے اس وسیع سلطنت کا گورنر بنا کر بھیجا لیکن خانہ جنگی نے کسی گورنر کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ آخر کار گیسکا گورنر نے دشمنی اور مخاصمت کو اپنے اعتدال اور انصاف سے مٹا دیا اور ۱۵۴۹ء میں یہ عظیم سلطنت صحیح معنوں میں اسپین کا صوبہ بن گئی۔

باب شانزدہم

امریکہ میں ہسپانوی سلطنت

باڈریگو ڈی بسٹیگاس نے ۱۵۲۰ء میں کارٹیگینا اور سانتا مارتھا کے صوبے دریافت کیے تھے اور پیڈرو ڈی ہیری ڈیا نے ۱۵۳۳ء میں ان کو محکوم بنایا تھا ۱۵۴۴ء میں کارٹیگینا ایک بڑا شہر ہو گیا تھا اور اس کا بندرگاہ نئی دنیا کی ہسپانوی مملکت میں نہایت محفوظ اور نہایت عمدہ قلعہ تھا اس کا موقع بھی تجارت کے لیے موزوں ہے اور اس لیے تمام ہسپانوی جہاز یورپ سے پہلے پہل یہیں آتے تھے اور اپنا مال تجارت فروخت کر کے یہیں سے گھر کے لیے واپس ہوتے تھے ۱۴۹۹ء میں اوجیڈا پہلے پہل صوبہ وینیزولا میں آیا تھا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے وینیزولا کے معنی چھوٹے وینس کے ہیں یہ نام اس کو اس وجہ سے دیا گیا تھا کہ اس کا ایک گاؤں وینس کی طرح سمندر کے خاموش پانی پر آباد تھا غرناطہ کی نئی سلطنت جیسا کہ اس کو کہتے ہیں اندرونی حصہ ملک ہے اور ۱۵۳۶ء میں بنیلکزار نے اس کو اسپین کا محکوم بنا دیا تھا۔ وہ کیوٹو سے جبکہ وہ پزارو اور کوساڈا کی ماتحتی میں تھا اس پر حملہ آور ہوا تھا۔ ہندوستانیوں نے

استقلال، شجاعت اور مصمم ارادے کے ساتھ اپنی مدافعت کی لیکن ترتیب و تنظیم اور سائنس ان کی وحشیانہ طاقت پر
جیسا کہ ہر جگہ غالب آئی۔ غرناطۂ نو کے ہندوستانی چونکہ ان سے کانیں کھودنے کا کام نہیں لیا گیا تھا اس نوآبادی میں دیگر
نوآبادیوں سے زیادہ تعداد میں پھلتے پھولتے رہے، یہاں سونا زمین کے اندر نہیں پایا جاتا تھا بلکہ سطح زمین کے قریب
بلند مقامات پر مٹی میں ملا ہوا ملتا تھا۔ سانتانی کا ایک گز زر خالص سونے کا ڈھیلا جو اس صوبے میں پایا گیا تھا اسپین
لے گیا تھا۔ جس کی قیمت تین ہزار ڈالر سے زائد تھی۔ غرناطۂ نو کی سلطنت اول اول ۱۵۴۷ء میں قائم ہوئی اور اس کا
دار السلطنت سانتانی ڈی بوگوٹا کو قرار دیا گیا تھا۔ ۱۷۱۸ء میں اس میں دوسرے صوبے ملا کر اس کو ایک بڑا صوبہ
بنا دیا گیا تھا لیکن ۱۷۲۴ء میں اس حکومت کو منسوخ کر دیا گیا اور بعد ازاں ۱۷۴۰ء میں اس کو پھر قائم کر دیا گیا
انقلاب کے زمانے تک یہ ایک خود مختارانہ حکومت رہی۔ بعد ازاں کولمبیا کی جمہوری سلطنت میں ملا دی گئی۔ وینیزویلا
کے جانب شرقی کراکاس اور کومانا کے صوبجات واقع ہیں اور کارٹاجینا اور سانتا مارتھا کو ملا کر قدیم سلطنت ٹیرا ژرما بنتی تھی
اب یہ سب کولمبیا کی جمہوری سلطنت کے اجزا ہیں، یہ دونوں صوبے عرصے تک کھوپرے کی تجارت اور پیداوار کے لیے مشہور تھے
جو صرف گونی مالا کے کھوپروں سے دوسرے نمبر پر ہیں۔

میکسیکو یا اسپین نو اور پیرو دیگر نوآبادیوں کی نسبت زیادہ آباد ہوتے گئے کیونکہ اسپین سے قسمت آزما لوگ یہاں
روپیہ پیدا کرنے کے لیے آتے تھے اور چونکہ ان دونوں صوبوں میں وافر دولت تھی اس لیے ان ہی دونوں صوبوں میں
ہسپانوی آبادی بڑھتی گئی۔ سلطنت ہسپانیہ نے بھی اپنے تمام مقبوضات امریکہ کو انھیں دو بڑے صوبوں میں تقسیم کر دیا تھا
شمال کی جانب جس قدر نوآبادیاں تھیں میکسیکو میں شامل کر دی گئیں اور جنوب کی جانب کی تمام نوآبادیاں پیرو سے
ملحق کر دی گئیں۔ اسپین نو کا دار السلطنت میکسیکو تھا اور پیرو کا دار السلطنت لیما تھا۔

اوراگوئی کا تصفیہ

پیرو کے صوبے سے ملحق وہ تمام مملکتیں جو اینڈس کے شرق میں واقع تھیں دریائے ریو ڈی لا پلاٹا اور اس کی
شاخوں اور دریائے کولورڈو اور دیگر دریاؤں سے جو بحر اطلانطک میں گرتے ہیں سیراب ہوتی تھیں، دریائے لا پلاٹا کے
شرق میں جو ہسپانوی مملکت واقع ہے اور جس میں پیراگوئی کا صوبہ اور دیگر اضلاع شامل ہیں صدیوں سے غیر متعین
چلی آتی تھی اور پرتگال سے اسی بنا پر جھگڑا ہوا جب سولھویں صدی کے ابتدائی برسوں میں جوآن ڈی نزڈی سولس نے

ریو ڈی لاپلاٹا کو دریافت کیا اور اگوئے میں وحشی فرقے آباد تھے جو اس کے دریاؤں کے کناروں پر رہتے تھے ان کی تاریخ اس سے پہلے کی معلوم نہیں ہے اور اُن کے رسم و رواج سے بھی ہم ناواقف ہیں بجز ان چند باتوں کے جن کو امریکہ کے ان مقامات کے پہلے مورخوں نے بیان کر دیا ہے۔ اہل اسپین نے اپنی آبادیوں کے لیے دریائے پیراگوئے اور دریائے پرانا کے کنارے اور دریائے پلاٹا کا مغربی کنارہ پسند کیا اور دریائے اوراگوئے کا شرقی حصہ قریب قریب چھوڑ دیا گیا تھا جو ڈیڑھ صدی تک مویشیوں اور گھوڑوں کی چراگاہ کا کام دیتا رہا جہاں ان کی تعداد انسان کی دیکھ بھال بغیر بے حد بڑھ گئی تھی۔ برازیل والے مویشیوں کی کثیر تعداد اس بہانے سے پکڑے جاتے تھے کہ یہ حصۂ ملک تاج پرتگال سے متعلق ہے اور چونکہ ہسپانوی بھی اس کے قبضے کا ادعا کرتے تھے لہذا انھوں نے ۱۶۲۲ء میں ایک شہر از نام سانٹو ڈومنگو سوریانو آباد کیا اور اہل پرتگال نے ۱۶۸۰ء میں کولونیا ڈیل سیکرامینٹو کے نام سے دوسرے شہر کی بنیاد ڈالی کیونکہ دونوں قومیں اپنے اپنے مفاد کو ترقی دینا چاہتی تھیں۔

کولونیا کی بنیاد سے دونوں قوموں میں ایک سلسلۂ جنگ کا آغاز ہو گیا دونوں بادشاہوں نے بہت سے عہد نامے کیے جن میں سے ہر ایک اوراگوئے کے قبضے اور یورپی مسائل طے کرنے کے بارے میں تھا لیکن سوا صدی تک کولونیا اور دیگر اراضیات کبھی اسپین کے اور کبھی پرتگال کے قبضے میں چلی جاتی تھیں البتہ اسپین اندرونی حصۂ ملک پر برابر قابض رہا۔ اس نے بحر اوقیانوس کے ساحل پر اور دریائے پلاٹا پر مختلف شہر آباد کیے جن میں مونٹی وی ڈیو ایک خاص شہر تھا جب قبضہ کا جھگڑا طے ہو گیا تو ہسپانویوں کے پاس وہ تمام اراضی آگئی جو جھیل مریم اور دریائے لاپلاٹا کے درمیان واقع تھی جنوبی عرض البلد کے تینتیس اور انتالیس درجوں کے درمیان آب و ہوا معتدل ہے ملک کی سطح زیادہ تر ہموار ہے اگرچہ اس میں پہاڑیاں اور وادیاں بھی ہیں جن کو مستثنیٰ کر کے تمام ملک زراعت کے لیے موزوں ہے گیہوں، جو، سن، جوار، مکا، اور دیگر قسم کی نباتات اور پھل بآسانی پیدا ہوتے ہیں عمدہ چراگاہیں بھی بکثرت ہیں باشندوں کی خاص غذا روٹی اور گوشت ہے، بعض دریاؤں کے کناروں پر سونا بھی پایا جاتا ہے، الاس میناس کے ضلع میں سیسہ، چاندی، تانبا اور سونا پایا جاتا ہے، یہاں کی تجارتی اشیا، جانوروں کی کھالیں، موم اور نمکین گوشت ہے، مکھن اور پنیر بھی یہاں بکثرت پیدا ہوتا ہے۔

پیراگوئے اور ارجنٹینا کا تصفیہ

دریائے لاپلاٹا کی مغربی مملکت دو صوبوں بیونس آئرس اور ٹوکومان میں منقسم تھی ۱۶۲۰ء میں ریو ڈی لاپلاٹا کا صوبہ

موجودہ ارجنٹینا بھی پیراگوئی کے صوبہ سے بالکل مختلف طور پر قائم ہوا تھا اور بعد ازاں اس کو بیونز آئرس کے نام سے موسوم کر دیا گیا تھا۔ ۱۵۲۵ء میں پیڈرو ڈی مینڈوزا نے اس نام کا ایک شہر آباد کیا تھا لیکن ۱۵۳۲ء میں اس کو ویران چھوڑ دیا تھا اور اس کے باشندے اسمپشن کو چلے گئے تھے جہاں ایک قلعہ دو سال قبل مرتزا یولا نے بنا دیا تھا۔ یہاں ایک لاٹ پادری بھی رہتا تھا۔ ۱۵۸۶ء میں عیسائی فرقہ جیسوائٹ پیراگوئی میں آیا اور ۱۶۰۹ء میں فادر ٹورس نے عیسائی شدہ ہندوستانیوں کے لیے علیحدہ شہر قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی جو صرف شاہ اسپین کی حکومت تسلیم کرتے تھے اور گورنروں کی حکومت سے آزاد تھے لیکن ۱۶۳۰ء میں پرتگیز نوآبادوں نے ان پر حملہ کیا اور دو سال میں ساٹھ ہزار آدمی یا مارے گئے یا گرفتار ہو کر چلے گئے۔ ۱۶۳۹ء میں پادریوں نے بادشاہ سے اجازت حاصل کی کہ ان ہندوستانیوں کو بھی اہل یورپ کی طرح مسلح کرنے کا حکم دیا جائے۔ اس کے بعد ۱۵۸۰ء میں بیونز آئرس کا شہر پیراگوئی کے گورنر نے دوبارہ تعمیر کیا اور اس وقت سے یہ نہایت اہم شہر ہو گیا۔ لا پلاٹا کے شمالی کنارہ پر ۱۶۷۹ء میں پرتگیزوں نے ایک نئی آبادی کی کوشش کی۔ لیکن گیبر گورنر نے پرتگیزوں کو ملک سے خارج کر دیا اور ان کے قلعہ کو مسمار کر دیا۔ یہ آبادی بھی دونوں قوموں میں عرصہ تک جھگڑے کی بنیاد رہی لیکن ۱۷۷۷ء میں یہ اراضی اسپین کے حوالہ کر دی گئی۔

نوآبادیوں میں اسپین کا طرزِ حکومت

۱۵۱۱ء میں فرڈی ننڈ نے اپنے امریکی مقبوضات کے معاملات طے کرنے کے لیے ایک عدالت جس کا نام ممالک ہند کی کونسل تھا قائم کی تھی۔ اور ۱۵۲۴ء میں اس کو چارلس پنجم نے از سر نو ترتیب اور ترقی دی۔ اسکو ہسپانوی امریکہ کی حکومت کے ہر صیغہ پر اختیار سماعت حاصل تھا۔ یہ نوآبادیوں کے متعلق قوانین اور قواعد بناتی تھی اور امریکہ کی وہ تمام ملازمتیں پُر کرتی تھی جو تاج کے لیے محفوظ تھیں۔ تمام افسران وائسرائے سے کم اونیٰ درجہ تک اپنے طرزِ عمل کے لیے ممالک ہند کی کونسل کے جواب دہ تھے۔ یہ ہمیشہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس کونسل میں بادشاہ موجود ہے۔ چنانچہ اس کے اجلاس وہیں ہوتے تھے جہاں وہ رہتا تھا۔ جب تک کونسل کے دو تہائی ممبران کسی ایسے قانون سے جس کا تعلق امریکی معاملات سے ہو متفق نہیں ہوتے تھے تو وہ قانون پاس نہیں کیا جاتا تھا۔ امریکہ کی اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں کی اپیل بھی ممالک ہند کی کونسل ہی میں دائر ہوتی تھی۔

اپنے امریکی مقبوضات کے لیے اسپین کا یہ طرز حکومت اس اصول پر مبنی تھا کہ یہ نوآبادیاں تاج اسپین کی ملک
ہیں۔ ان کو ہسپانوی قوم کی ملکیت نہیں مانا جاتا تھا۔ اگرچہ اس مسئلہ کے متعلق اس کے سوا اور کوئی سند نہ تھی کہ
پوپ الیگزنڈر ششم کے فرمان نے فرڈی ناںڈ اور ازابلا کو وہ تمام ممالک بخش دیے تھے جن کو وہ ایک خاص عرض البلد کے
غرب میں دریافت کریں۔ لہٰذا ہسپانوی مقبوضات امریکہ بادشاہ کی ذاتی جائداد سمجھے جاتے تھے۔ اصلی قسمت آزما
لوگوں کمانڈروں اور گورنروں کو جنھوں نے ملک کو دریافت کیا اور سلطنت اسپین کا محکوم بنایا بادشاہی
اختیارات عطا کرتا تھا۔ اور وہ اس کی مرضی سے اپنے اپنے عہدوں سے علیحدہ کیے جاسکتے تھے۔ تمام جاگیریں
بادشاہ ہی دیتا تھا اور اگر کسی وجہ سے وہ ختم ہو جاتی تھیں تو پھر تاج اسپین ہی کو واپس ہوتی تھیں۔ جملہ سیاسی
اور دیوانی کے اختیارات بادشاہ میں مرکوز تھے اور بادشاہ کی مرضی کے مطابق ان کو وہ اشخاص جن کو وہ اجازت
دے اور ایسے طریقوں سے جن کو وہ پسند کرے استعمال کیے جاسکتے تھے۔ یہ اشخاص نہ صرف نوآبادیوں سے بلکہ
ہسپانوی قوم سے بھی کوئی تعلق نہ رکھتے تھے۔ دونوں سے آزاد تھے۔ نوآبادیوں کو جو اختیارات دیے گئے تھے وہ صرف
انتظام شہر مثل صفائی وغیرہ سے متعلق تھے یا اندرونی پولیس اور شہروں اور قصبوں کی تجارت سے تعلق رکھتے تھے
لیکن ایسی آزادی ہمیشہ شخصی سلطنتوں میں دے دی جاتی ہے۔ ہسپانوی امریکی حکومتیں نہ صرف قدیم روس
اور گذشتہ ترکی کی طرح مستبد تھیں بلکہ نہایت خطرناک تھیں کیونکہ بادشاہ کی مطلق العنان طاقت اس سے نہیں
بلکہ اس کی بجائے اس کے نائبین سے استعمال کی جاتی تھی۔

پہلے یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ ہسپانوی مقبوضات نئی دنیا میں بلحاظ حکومت دو بڑے حصوں یا صوبوں
یعنی اسپین نو اور پیرو میں تقسیم تھے۔ بعد ازاں جب ملک میں آبادی بڑھ گئی تو سانتا فی ڈی بوگوٹا کا صوبہ اور
بنا دیا گیا جس میں غرناطہ نو۔ ٹیرا فرما۔ اور کیوٹو کے صوبے شامل تھے اور کچھ دنوں بعد ریو ڈی لا پلاٹا کا صوبہ بھی
بڑھا دیا گیا۔ ان حکومتوں پر ایک وائسرائے مقرر کیا گیا تھا۔ جو اپنے بادشاہ کا نائب مناب تھا اور اپنی حدود کے اندر
تمام شاہی اختیارات رکھتا تھا۔ اس کی حکومت اسی قدر برتر تھی جس قدر کہ اس کے بادشاہ کی اور وہ حکومت کے
ہر محکمہ پر خواہ دیوانی ہو یا فوجداری یا فوجی سب پر قابو رکھتا تھا۔ وہ اپنی حکومت کے ذمہ دار عہدوں پر لوگوں کو
خود مقرر کرتا تھا اور ان خالی آسامیوں کو جو موت کی وجہ سے واقع ہوتی تھیں پُر کرتا تھا۔ اُس کی عدالت [illegible]

بادشاہ کے اختیارات جیسے برطانیہ میں تھے کم ازکم اُسی درجہ تک نوآبادیوں کی رعایا پر تھے۔

ہسپانوی امریکی نوآبادیوں کو سیاسی حقوق کچھ بھی حاصل نہ تھے ان کے حقوق صرف [illegible] تک محدود تھے تاج کو نوآبادیوں کی حکومت پر کلی اختیار حاصل تھا لیکن نوآبادوں کو جس قدر آبائی ملک میں اختیار تھا اس سے زیادہ یہاں نہ تھا۔ اور یہ توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی کہ جو حقوق ان کو خود اسپین میں حاصل نہ تھے وہ نوآبادیوں میں مل جائیں۔ سیاسی حقوق کے بارے میں ہسپانوی نوآبادوں کو وہی حقوق ملے ہوئے تھے جو قدیم اسپین کے باشندوں کو۔ لیکن بادشاہ کے اختیارات اُس کا نائب عمل میں لاتا تھا اور وہ دور دراز فاصلہ پر تھا۔ اس وجہ سے اکثر اس کے افعال ظالمانہ اور نامنصفانہ ہوتے تھے۔ حقوق کی مساوات کے بارہ میں جہاں تک نوآبادوں اور اصلی باشندوں کا تعلق ہے اسپین کے نوآباد برطانوی نوآبادوں سے بہتر تھے۔ اگر نوآبادیاں بالکل آبائی حکومت کے ماتحت ہوتیں تو ان کے لیے یہ کوئی امتیاز کی بات نہ تھی کہ آخری حکم بادشاہ کے اختیار میں رہے یا قوم اور بادشاہ دونوں کے ہاتھ میں۔ دونوں حالتوں میں وہ غلام ہی رہتے۔

لیکن دونوں قوموں کے مختلف طرز حکومت نے انکی نوآبادیوں کی حکومت میں بھی فرق پیدا کر دیا تھا۔ چونکہ اسپین کے بادشاہ کی طاقت غیر محدود تھی اس لیے اُس کا حکم نوآبادیوں میں بھی ایسا ہی رہا لیکن شاہ انگلستان کا اختیار اپنے ملک میں محدود تھا اور حکومت مشترک تھی کیونکہ لوگوں کو اپنے نمائندوں کے ذریعہ شرکت حاصل تھی اس لئے نئی دنیا میں بھی وہی طریق حکومت قائم کیا گیا۔ تمام نوآبادیوں میں حق نیابت کا اصول جاری کیا گیا اور مقامی مجلسیں واضعان قوانین رہیں اور انتظامی طاقت بادشاہ کے ہاتھ میں رہی۔

تجارت میں رکاوٹیں اور ان کا تدارک

اسپین کا منشاء اپنی نوآبادیاں قائم کرنے سے محض اپنے آپ کو فائدہ پہنچانا تھا۔ چنانچہ اول اول نوآبادیوں میں بھی جس بات پر زور دیا گیا وہ صرف یہ تھی کہ کانیں کھودی جائیں اور جس قدر چاندی سونا دستیاب ہو اسپین بھیج دیا جائے۔ اس میں بادشاہ کا حق خاص طور پر ایک خمس رکھا گیا تھا۔ زراعت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی بلکہ اسے ممنوع قرار دیا تھا۔ کیونکہ اندیشہ یہ تھا کہ کہیں آبائی ملک کی پیداوار کو نقصان نہ پہنچے۔ آبادیوں کی ضروریات اسپین سے پوری کی جاتی تھیں یہاں تک کہ یہ بھی اجازت نہ تھی کہ ایک نوآبادی دوسری نوآبادی سے کوئی مال

براہ راست منگائے بلکہ جو اشیاء ایک نوآبادی میں قابل فروخت ہوتی تھیں وہ پہلے اسپین جاتی تھیں بعد ازاں جہاں ان کی ضرورت ہوتی تھی بھیجی جاتی تھیں کسی نوآبادی کو جہاز رکھنے کا بھی حق نہ تھا۔ چنانچہ ہر قسم کا مال اسپین کے جہازوں میں آتا جاتا تھا۔ جب یہ کیفیت تھی تو بیرونی ممالک سے کیسے تجارت ہو سکتی تھی۔ نوآبادوں کو سخت ممانعت تھی کہ وہ کسی بیرونی ملک سے خرید و فروخت نہ کریں۔ اور بیرونی ممالک کے باشندوں کے خلاف بھی اس بارے میں سخت قوانین نافذ تھے۔ شراب اور تیل جو باسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں پہنچائے جا سکتے اسپین ہی میں تیار ہو کر نوآبادیوں کو جاتے تھے ۱۵۰۱ء ہی میں نوآبادیوں میں مذہبی ادارہ قائم کر دیا گیا تھا اور نوآبادوں سے انکی آمدنی کا ایک دسواں حصہ اس مد میں وصول کیا جاتا تھا۔ ان تمام سختیوں اور تکالیف کا یہی لازمی نتیجہ تھا کہ اسپین کے لوگوں کو باہر جانے کا شوق نہ رہا اور دو صدیاں گذرنے پر بھی تمام نوآبادیوں میں صرف پندرہ ہزار ہسپانوی موجود تھے۔

جب انگلستان اور اسپین میں جنگ چھڑی تو نوآبادیوں کو جہازات جانے بند ہو گئے اور نوآبادیاں جو اپنی غذا کے لئے اسپین کی محتاج تھیں سخت تکالیف میں مبتلا ہو گئیں۔ ایسی صورت میں اسپین نے اتحادی فرانس کو اپنی نوآبادیوں سے تجارت کرنے کی اجازت دے دی۔ صلح کے بعد اسپین کو یہی حقوق انگلستان کو بھی دینے پڑے اکثر اوقات انگلستان، فرانس اور ہالینڈ کے جہازات ممنوعہ مال تجارت کو اسپین کی نوآبادیوں میں پہنچاتے تھے اور حکومت اسپین ان کا کسی طرح انتظام نہیں کر سکتی تھی۔ آخر کار ۱۷۷۸ء میں چارلس سوم نے سختیاں اور رکاوٹیں ہٹا دیں اور تجارت کو آزاد کر دیا۔ لیکن نوآبادیوں کا انتظام خراب ہی رہا۔ ملازمین رشوت کے خوگر تھے اور تنخواہ سے دوگنا بلکہ چوگنا روپیہ پیدا کر لیتے تھے۔ جب ڈون جوزف گالویز کا زمانہ آیا تو اس نے طرز حکومت میں بہت سی تبدیلیاں اور اصلاحات کیں۔

بغاوت کے ابتدائی نشانات

• برطانوی نوآبادیوں کے سیاسی انقلاب کا اقتدار اور تجارتی آزادی ۱۷۷۶ء کے اثرات سے متاثر ہو کر ہسپانوی امریکہ نے سیاسی حالت کی ترقی اور اصلاح کی خواہش ظاہر کی۔ اس وقت تک بلکہ جب تک آبائی ملک میں انقلاب نہ ہوا اور نپولین بونا پارٹ نے شاہی حکومت کو تہ و بالا نہ کیا۔ ہسپانوی رعیا اور سردار اپنے بادشاہ کی وفادار رعایا رہے۔ اٹھارویں صدی کے اواسط میں پیراکاس میں ایک سازش حکومت کے خلاف کی گئی

جس کا سردار ایک شخص لیون نامی تھا۔ اس کا مقصد سیاسی کی نسبت زیادہ تر تجارتی تھا۔ سازش کرنے والے یہ چاہتے تھے کہ ایک تجارتی کمپنی کو جو اُس صوبہ اور دیگر صوبوں کے مال تجارت کی اجارہ دار ہو گئی شکست کر دیا جائے لیکن یہ سازش سرسبز نہ ہوئی اور لیون کو سزائے موت دی گئی۔ اس کا مکان مسمار کر دیا گیا اور اس موقع پر اُس کے جرم کی ایک یادگار بنائی گئی۔ تاکہ دیگر دغابازوں کے لیے عبرت کا کام دے۔ سنہ ۱۷۸۰ء میں ایک خوفناک انقلاب بیرو میں رونما ہوا جو ہندوستانیوں نے شروع کیا اور دیگر باشندوں نے اس کی موافقت کی خرابیوں کے انسداد اور اصلاح سے قبل جو گاورنر نے جاری کی تھیں چھوٹے چھوٹے ہسپانوی تاجر اس قدر ناقابل برداشت قیمت لیتے تھے اور ہندوستانیوں کو مجبور کرتے تھے کہ اُن کی طلبیدہ قیمت پر مال تجارت خریدیں۔ پس اُنھوں نے مجبور ہو کر علم بغاوت بلند کر دیا۔

ان بیچین لوگوں کا سردار ٹوپاک امارو بن گیا۔ جو انکا کی شاہی نسل سے تھا اور چند با اقتدار اشخاص اس کے شریک حال ہو گئے۔ اندرون ملک تین سو فرسخ تک یہ انقلاب پھیل گیا۔ ہسپانوی حکومت نے باغیوں کو سزا دینے کی تدابیر اختیار کیں۔ یہ بدامنی تین سال تک جاری رہی اور بہت سے خونی نظارے نظر آئے۔ اکثر ان لوگوں کو کامیابی ہو جاتی تھی مگر انھوں نے حد سے متجاوز ہو کر قدیم سلطنت قائم کرنے کا اعلان کیا۔ لہٰذا ہسپانوی افواج نے ہر طرف سے حملہ کیا اور آخرکار باغی اشخاص کو محکوم اور اطاعت گزار بنا یا گیا۔ ٹوپاک امارو اور دیگر خاص رہناؤں کو سزائے موت دی گئی ایسے بیرحمانہ طریقہ اور سنگدلی سے جو انسانی احساسات کے لیے نہایت نفرت انگیز ہے۔

یہ بغاوت فرو ہونے بھی نہ پائی تھی کہ ہسپانوی حکومت کو غرناطہ نو میں دیگر بدامنیوں سے سابقہ پڑا ۱۷۸۱ء میں نئے قاعدوں اور مزید ٹیکسوں سے سوکورو کے صوبہ کی کل آبادی نے اختلاف کیا۔ ایک مسلح گروہ جس کی تعداد سترہ ہزار تھی سانٹافی کی طرف چلا اور کسی مقابلہ کے بغیر دارالسلطنت سے صرف چھتیس میل پر تھا اس وقت وہاں کا لاٹ پادری ان سے آن کر ملا اور ان کو اس فعل سے مذہب کا خوف دلا کر باز رکھا۔ پھر وائسرائے نے ان سے تخفیف ٹیکس کا وعدہ کر لیا لیکن حکومت اپنے وعدہ پر قائم نہ رہی۔ ان باغیانہ خیالات سے حکومت میں زیادہ برافروختہ ہوئی اور بجائے اس کے کہ اصلاحات عمل میں لاتی سخت قوانین ایجاد کیے تاکہ باغیانہ خیالات دلوں سے دور ہو جائیں۔ ایسا کوئی انتظام نہ کیا گیا کہ اُن کی شکایات رفع کی جاتیں بلکہ انکے

ساتھ سختی کا برتاؤ روا رکھا گیا۔ ۱۷۸۹ء کے بعد یورپ میں جو واقعات رونما ہوئے ان کا اثر ان نوآبادوں پر بھی پڑا۔ ۱۷۹۷ء میں کیراکاس کے صوبہ میں نوآبادوں نے انقلاب برپا کرنے کی تجویز کی لیکن یہ سازش ظاہر ہو گئی اور بڑے بڑے سازش کرنے والے قریب کے جزائر میں بھاگ کر پناہ گزیں ہو گئے۔

مسٹر پٹ کا یہ سات سال سے خیال تھا کہ جنوبی امریکہ کی آزادی میں امداد دینی چاہیے تاکہ اس کے ممالک سے تجارتی تعلقات قائم ہو سکیں چنانچہ اسی خیال سے ایک جہاز جنوبی امریکہ کو سر ہوم پوفم کی ماتحتی میں روانہ کیا گیا جس نے بیونس آئرس پر پہنچ کر حملہ کیا۔ لیکن تعجب خیز امر یہ ہے کہ تمام ہندوستانی ہسپانوی جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے اور انگریزوں کی کچھ امداد نہ کی جیسا کہ ان کا خیال تھا۔ لڑائی کا نتیجہ کبھی انگریزوں کے موافق اور کبھی خلاف ہوا۔ لڑائیاں سخت ہوئیں۔ ایک معرکہ میں دس ہزار برطانوی فوج میں سے ایک ثلث خون کے گھاٹ اتر گئی۔ آخر کار اہل ہسپانیہ اور اہل برطانیہ میں صلح ہو گئی اور انگریزوں نے دو ماہ کے اندر دارالسلطنت خالی کر دیا۔ قیاس یہ تھا کہ ہندوستانی ہسپانویوں کے سخت خلاف ہیں ضرور انگریزوں کا ساتھ دیں گے۔ لیکن درحقیقت انگریزوں کا منشا بھی ہندوستانیوں یا نوآبادوں کو آزاد کرانے کا نہیں تھا۔ بلکہ فتوحات کی آرزو سے بیچین ہو کر پارلیمنٹ کے حکم کے بغیر اُدھر چل کھڑے ہوئے تھے وہاں ناکامی سے سابقہ ہوا تو مجبورًا واپس چلے آئے۔ درحقیقت یہ نپولین بوناپارٹ تھا جس نے امریکی نوآبادیوں کو ہسپانیہ سے آزاد کرایا۔

باب ہفتدہم

ہسپانوی امریکہ میں انقلابات

ہسپانوی امریکہ میں انقلابات کے اسباب سلطنت کی کسی حکمت عملی کے بدلنے یا آبائی ملک کی نسبت امریکیوں کے جذبات کی کسی اہم تبدیلی سے پیدا نہیں ہوئے جب وہ کسی قسم کے سیاسی مفاد سے مستفید نہ تھے تو وہ ان سے محروم بھی نہیں کیے جا سکتے تھے۔ نوآبادیوں کے حقوق اور تاج کے خصوصیات کے متعلق جیسا کہ برطانیہ عظمیٰ اور اس کے امریکی مقبوضات کے درمیان واقع ہوا کوئی جھگڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ زمانہ جنگی کے تسلط

ہسپانوی نوآبادیوں میں چاہے کسی ٹیکس کے لگانے یا تقلیل کسی قسم کا ٹیکس لگانے کے حق سے مشتعل نہیں ہوئے کیونکہ تین سو برس سے آج تک وہ خاموشی کے ساتھ اطاعت کرتے رہے۔ اگرچہ شمالی امریکہ اور فرانس کے انقلابوں سے ان ممالک پر کچھ روشنی پڑی تاہم ان کی حال کی تبدیلیوں کا سراغ اسپین کی حالت اور اس کی شاہی حکومت کی کلی ابتری سے لگانا چاہیے۔

اسپین ایک صدی سے زائد عرصہ سے تنزل کی طرف چلا جا رہا تھا جب کہ ۱۸۰۸ء میں اس کے انحطاط کو شہنشاہ نپولین کی حریص تجاویز نے درجہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ باوجود اس کے کہ جزیرہ نمائے اسپین کو ایک مفتوحہ ملک کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی اور اس کے ذخائر کو اپنی لڑائیوں کی امداد کے لیے صرف کیا جاتا تھا نپولین نے ملک پر قبضہ کرکے اس کے تاج کو اپنے بھائی جوزف بوناپارٹ کو دلوا دیا۔

ہسپانوی امریکی نوآبادیوں کی عام بغاوت

اسپین پر حملے اور بادشاہ کی قید نے ہسپانوی نوآبادیوں کو وہ موقع دے دیا جس کی وہ بغاوت کے لیے تلاش میں تھے۔ اس غیر متوقع خبر سے گہری اور قدرتی بے چینی امریکہ میں پیدا ہوگئی۔ سیولا کی سیاسی جماعت اور قادیسہ کی حکومت نے نوآبادیوں پر شاہانہ اختیارات برتنے چاہے لیکن نوآبادیوں نے اس کی مخالفت کی۔ وہ نہ صرف جوزف بوناپارٹ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرنے کے خلاف تھے بلکہ ہسپانوی سیاسی جماعتوں کی بھی اطاعت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ بادشاہ کی قید کے زمانہ میں امریکی صوبجات کو بھی وہی حقوق مملکت حاصل ہیں جو اہل اسپین کو ہیں چنانچہ ہسپانوی امریکہ میں دو جماعتیں ہوگئی ہیں۔ ایک خاص ہسپانوی جو سیول کی سیاسی جماعت اور قادیسہ کی حکومت کے تابع فرمان رہنا چاہتے تھے۔ دوسرے امریکی ہسپانوی جو ان جماعتوں کی اطاعت گوارا نہیں کرتے تھے اور خود نوآبادیوں میں اپنی سیاسی جماعتیں بنانا چاہتے تھے۔ اپنی مطلق آزادی کے خیالات کو چھپانے کے لیے انقلاب کے رہنما بار بار کہتے تھے "ہم بادشاہ کی اطاعت جب وہ آزاد ہو جائے گا ضرور کریں گے۔ اور جب تک ایسا ہو ہم خود اپنی آزاد حکومت قائم رکھیں گے"۔ ان جھگڑوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۱۰ء میں ہسپانوی امریکیوں میں میکسیکو سے پلاٹا اور چلی تک عام بغاوت پھیل گئی اور انھوں نے قومی سیاسی جماعتیں حکومت کرنے کے لیے قائم کر دیں اور نوآبادی کے اداروں کی اصلاح میں مشغول ہو گئے۔ اصلی

مولوی عزیز مرزا مرحوم
- سیرۃ المحمود
- ذکرم اردو سی

خواجہ عباد اللہ اختر
- صدیق اکبرؓ
- بغداد
- دمشق
- دیوان جغتائی شرح

میر ولی اللہ بی اے
- بندگی
- خلق عظیم
- کاس الکرام
- لسان الغیب جلد اول
- جلد دوم

مولوی محمد ظفر ایم اے
- روح القرآن
- مدعوں کے کرشمے

سید مسعود علی بی اے
- فصاحت اردو
- جاپان کا تعلیمی نظم و نسق
- انتخاب زریں

مولوی محمد یحییٰ تنہا
- سیر المصنفین ۲ جلد
- خیالات ارونگ
- تاریخ مغربی یورپ

مولانا حسرت موہانی
- شرح دیوان غالب
- کلیات حسرت

سید سجاد حیدر بی اے
- خیالستان
- حکایات و احتساسات
- زہرا
- جلال الدین خوارزم شاہ

مسٹر ظفر عمر بی اے
- چوروں کا کلب
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری
- لال کٹھور
- مستقبل اسلام

مرزا محمد عسکری بی اے
- تاریخ ادب اردو
- ادبی خطوط غالب

محی الدین زور ایم اے
- اردو کے اسالیب بیان
- روح تنقید
- تنقیدی مقالات
- سلطان محمد کی بزم ادب

مولوی ضیاء احمد ایم اے
- تذکرۂ [illegible]
- قصائد مومن

منشی [illegible] علی بی اے
- تاریخ تمدن ۲ جلد
- شباب لکھنؤ

مولوی عبد الماجد بی اے
- فلسفۂ جذبات
- مکالمات برکلے
- پیام امن
- تصوف اسلام
- فلسفیانہ مضامین
- زود پشیمان

منشی امتیاز علی بی اے
- سراج منیر
- ہیملٹ

مرزا محمد سعید ایم اے
- یاسمین
- خواب ہستی

پروفیسر منہاج الدین
- زینت آسمان
- ہیئت جدیدہ ۲ حصہ
- نظریۂ اضافیت

پروفیسر الیاس برنی ایم اے
- جذبات فطرت ۲ حصے
- معارف ملت
- مناظر قدرت
- علم المعیشت

مولوی سید سلیمان ندوی
- ارض القرآن
- خطبات مدراس
- سیرت عائشہ
- حیات امام مالک
- خلافت عثمانیہ اور اسلام
- اہل سنت والجماعت

مولوی عبد السلام ندوی
- اسوۂ صحابہ ۲ جلد
- سیرت عمر بن عبد العزیز
- انقلاب الامم
- تاریخ الحرمین الشریفین
- نقوائے اسلام
- فطرت نسوانی
- شعر الہند ۲ جلد

مولوی عبد الباری ندوی
- مبادی علم انسانی
- برکلے کا فلسفہ

مولوی سعید انصاری
- سیر الصحابہ جلد اول
- سیر انصار ۲ جلد
- سیر الصحابیات

مولوی عبد الرزاق ندوی
- اسوۂ حسنہ
- کتاب الوسیلہ
- رسالہ استبداد

خواجہ حسن نظامی
- قرآن آسان قاعدہ
- میلاد نامہ
- فاطمی دعوت اسلام
- ذکر غوث پاک
- کرشن جیون
- شاہی جہاد
- سی پارہ دل
- کر موت
- چٹکیاں اور گدگدیاں
- اتالیق خطوط نویسی
- روزنامچہ
- بیوی کی تعلیم
- بیوی کی تربیت
- اولاد کی شادی
- جگ بیتی کہانیاں
- آپ بیتی
- بچوں کی کہانیاں
- سیر دہلی
- سفرنامہ ممالک اسلامیہ
- غدر دہلی کے افسانے
- اردو دعائیں
- تسکین احساس
- روزنامچۂ ہند
- اسلام کا انجام
- تسخیر مہر و قہر
- تاریخ مسیح
- سلاطین آل عباس
- سلاطین بہمنی
- امام الزماں کی آمد

مولوی عبد ال[illegible]
- امت کی [illegible]
- الزہرا
- صبح زندگی
- شام زندگی
- شب زندگی
- نوحۂ زندگی
- در شہوار
- منازل السائرہ
- سراب مغرب
- بنت الوقت
- قطرات اشک
- جوہر قدامت
- عروس کربلا
- یاسمین شام
- تیغ کمال
- ماہ عجم
- محبوبۂ خداوند
- موددہ
- نانی عشو
- جوہر عصمت
- سیلاب اشک
- گلدستۂ عید
- قلب حزیں
- روداد قفس
- وداع ظلمہ

قاضی ولی محمد [illegible]
- سفرنامۂ اندلس
- سفرنامۂ مصر [illegible]

رجسٹرڈ نمبر — لے ۴۷۸

ہو المستعان

الناظر

ایڈیٹر — ظفر الملک علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ للعہ   قیمت فی پرچہ ۸ر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محصول معاف

پندرہ روپیہ کی روانگی پر آدھا اور پچیس روپیہ کی روانگی پر پورا

اردو کی بہترین کتابیں

ہدیۃً

پچاس روپیہ کی روانگی پر … اور سو روپیہ کی روانگی پر …

مرزا غالب مرحوم
- اردوئے معلیٰ
- عود ہندی
- دیوان غالب مترجم
- کمل دیوان غالب

سرسید مرحوم
- خطبات احمدیہ
- کمل مجموعہ لکچر
- اسباب بغاوت ہند
- مضامین تہذیب الاخلاق
- خطوط سرسید

نواب محسن الملک مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق
- کمل مجموعہ لکچر
- تقلید و عمل بالحدیث
- کتاب المحبت والشوق
- مکاتیب
- مسلمانوں کی تہذیب

خلیفہ محمد حسین مرحوم
- اعجاز التنزیل
- سفرنامہ پنجاب

مولانا آزاد مرحوم
- آب حیات
- دربار اکبری
- سخندان فارس
- نگارستان فارس
- نیرنگ خیال
- سیر ایران
- ڈرامہ اکبر
- مجموعہ مکتوبات آزاد
- مجموعہ نظم آزاد
- نصیحت کا کرنپھول
- جانورستان
- بیاض آزاد
- تذکرہ علماء
- لغت آزاد
- دیوان ذوق مرتبہ آزاد

پروفیسر شہباز مرحوم
- زندگانی بے نظیر
- خیالات شہباز

مولوی سید ممتاز علی
- تذکرۃ الانبیا
- شیخ حسن

مولانا نذیر احمد مرحوم
- حمائل شریف مترجم
- الحقوق والفرائض
- بنات النعش
- مرأۃ العروس
- توبۃ النصوح
- موعظہ حسنہ
- رویائے صادقہ
- ایامیٰ
- فسانۂ مبتلا
- ابن الوقت
- مصائب غدر
- مجموعہ نظم بے نظیر
- کمل مجموعہ لکچر ۲ جلد
- منتخب الحکایات
- چند پند
- مبادی الحکمۃ

مولانا راشد الخیری مرحوم
- حیات انیس
- ایشیائی شاعری
- نورجہاں بیگم
- حیدر علی سلطان
- لغات الخواتین

مولانا حالی مرحوم
- یادگار غالب
- حیات سعدی
- مقدمہ شعر و شاعری
- حیات جاوید
- دیوان حالی
- مسدس حالی
- مجموعہ نظم حالی
- بیوہ کی مناجات
- شکوۂ ہند

مولوی بشیر الدین مرحوم
- واقعات دار الحکومت دہلی
- تاریخ بیجاپور
- حرز طفلاں
- نشاط عمر
- عصائے پیری
- لخت جگر
- حسن معاشرت
- صلاح معیشت
- اقبال دولھن
- شمع ہدایت
- انشائے بشیر
- دیوان بشیر

مولانا شبلی مرحوم
- سیرۃ النبی جلد اول
- دوم
- سوم
- الفاروق
- سیرۃ النعمان
- الغزالی
- المامون
- سوانح مولانا روم
- سفرنامہ مصر و روم و شام
- علم الکلام
- الکلام
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- شعر العجم جلد اول
- دوم
- سوم
- چہارم
- پنجم
- موازنۂ انیس و دبیر
- مضامین عالمگیر
- آغاز اسلام
- مجموعہ کلام شبلی اردو
- مکاتیب شبلی ۲ جلد

مولانا ذکاء اللہ
- تاریخ ہندوستان
- کرزن نامہ
- آئین قیصری
- محاربات عظیم
- معاون الحساب
- مساحت …

سید محمود مرحوم
- کتاب الطلاق
- کتاب الشفعہ
- لکچر
- شرح قانون شہادت

مولوی سید احمد انصاری
- المدینۃ الاسلام
- تحریر المرأۃ

مولوی ابو الحسن فرید
- ترجمہ تاریخ مصر
- ترجمہ رشحات
- ترجمہ عوارف المعارف
- ترجمہ مکتوبات …
- علم السیاست

ملنے کا پتہ - الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ

فہرست مضامین بابت ماہ جون سنہ ۱۹۳۰ء

نمبر ۶ — جلد ۳۰

نئی کتابیں

جو ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں آئیں

نور اللغات (جلد چہارم) جس میں حرف کاف سے لے کر یے تک کے الفاظ ہیں، اب شائع ہوگئی ہے۔ حجم ایک ہزار صفحہ سے زائد ہے۔ قیمت للعہ/

نوٹ:- اب یہ لغات مکمل ہوگئی ہے اور بے مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان کا اس سے جامع و مکمل لغت دوسرا نہیں ہے۔ جن اصحاب نے ابتدائی جلدیں نہ منگائی ہوں، وہ اب للعہ میں مکمل لغت طلب فرمالیں قیمت جلد اول عہ/ جلد دوم سے/ جلد سوم عہ/ جلد چہارم للعہ/

دیوان یقین - میر تقی میر کے معاصر انعام اللہ خاں یقین کا دیوان اب پہلی بار انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع ہوا ہے۔ مشہور ادیب مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی نے جو اس کے مرتب ہیں، شروع میں سو صفحے کے قریب حجم کا لائق دید مقدمہ لکھا ہے۔ قیمت عا/

ارتقا - مسئلۂ ارتقاء پر اردو میں اب تک کوئی مستقل کتاب نہ تھی۔ انجمن ترقی اردو نے مشتاق احمد وجدی صاحب کا یہ رسالہ شائع کرکے اس کمی کو پورا کردیا ہے [illegible]

سہ نظم ہاشمی - مولوی سید ہاشمی فرید آبادی کی مختلف تصنیف و تالیف جامعہ عثمانیہ کی تین نظمیں۔ ساری کتاب دو رنگ میں چھپی ہے۔ قیمت ۴/

گنج رواں - مولوی مصطفےٰ حسن علوی لکچرر شعبہ عربی و فارسی لکھنؤ یونیورسٹی نے اس مختصر میں تقریباً ان تمام عربی لفظوں، جملوں اور ضرب الامثال کی فرہنگ لکھی ہے، جو اردو زبان کا جزو بنکر تقریروں اور تحریروں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ جیبی پیمانہ مجلد قیمت ۱ر

معراج سخن - خاندان انیس کی آخری یادگار جناب سید خورشید حسن عروج عرف دولہا صاحب کے تین مراثی کا مجموعہ۔ ہندوستانی اکیڈمی کی جانب سے جو سالانہ انعامات دیے جاتے ہیں، بہترین نظم کا انعام گذشتہ سال اسی کتاب کو دیا گیا ہے۔ قیمت ۲ر

یادگار نسیم - مشہور شاعر حضرت اصغر گونڈوی نے مثنوی گلزار نسیم کو نئی صورت میں شائع کیا ہے۔ شروع میں ایک بسیط دیباچہ نسیم کی شاعری پر ہے۔ کثرت سے حواشی لکھے ہیں اور آخر میں دیوان نسیم کا انتخاب ہے۔ طباعت و جلد دیدہ زیب۔ قیمت عا/

سفر حجاز - مولوی عبدالماجد بی اے کا سفرنامہ جسے حج و زیارت کا مفصل و مکمل ہدایت نامہ کہنا چاہیے طرز تحریر کی دلکشی ہر ہر سطر سے عیاں ہے۔ حجم ۴۲۰ صفحے قیمت عا/

آل عثمان - مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری کی مشہور تالیف تاریخ الامت کا حصہ ہفتم۔ قیمت عمر

ہنسانے فسانے - سید ابو تمیم فرید آبادی کے بہترین چیدہ افسانوں کا مجموعہ مع مقدمہ از ملا رموزی حجم ۱۵ جزو قیمت عہ

انتخاب سودا - مرزا رفیع سودا کے قابل قدر کلام کا انتخاب - از مولوی سید ابو محمد ثاقب کانپوری - جسکے شروع میں مشہور شاعر مرزا جعفر علیخاں اثر لکھنوی بی اے ڈپٹی کلکٹر کا لائق بد مقدمہ ہے - قیمت عہ

سنہری ناگن - خاں صاحب چودھری نبی احمد سندیلوی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے انگریزی کے جاسوسی ناول "آگرہ ڈبل مڑور" کو اردو میں پیش کیا ہے - کتاب میں عکسی تصاویر بھی ہیں - حجم ۲۳۰ صفحے - قیمت ۱۲

حیات جلیل - علامہ عبد الجلیل بلگرامی کا قابل قدر تذکرہ از مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی جس میں ہندوستان کے اس فاضل اجل ہی کے سوانح نہیں ہیں بلکہ انکے عہد کے بہت سے دیگر اکابر کے حالات نیز اس زمانہ کی معاشرت و تاریخ کے متعلق نہایت قیمتی معلومات درج ہیں - یہ کتاب سالہا سال کی عرقریزی و دماغ پاشی کا نتیجہ ہے - اور اس لحاظ سے اپنے عہد کی بہترین کتاب کہی جا سکتی ہے - قیمت ے ر

دلگداز افسانے - حضرت کوثر چاندپوری کے دلآویز و دلکش افسانوں کا مجموعہ - قیمت عہ

طرز زندگی (۲ حصے) سید محمد نسیم انہونوی اڈیٹر الکمال کا دلچسپ افسانہ - جس میں زن و شو کے باہمی تعلقات میں خرابیاں پیدا ہونے کے اسباب اور طریقہ اصلاح کو نمایاں کیا گیا ہے - قیمت ۱۲

موج تبسم - حضرت شوکت تھانوی کے ظریفانہ مضامین کا دلچسپ مجموعہ مع مقدمہ از مسٹر نسیم انہونوی اور مصنف و مقدمہ نگار کی تصاویر کے - قیمت ۱۲

محاورات نسواں - مولوی محمد منیر صاحب منیر لکھنوی نے اس رسالہ میں عورتوں کے مخصوص محاوروں کو خصوصاً وہ جو بیگمات کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں جمع کیا ہے - اور انکے معانی اور محل استعمال کا بیان کیا ہے قیمت ۸ ر

غلط العوام - اس مختصر سے لغت میں عربی و فارسی کے وہ تمام الفاظ درج ہیں جن کو عوام غلط طور پر استعمال کرتے ہیں - الفاظ کی صحت کرکے اُن کے معانی بھی دیدیئے گئے ہیں - قیمت ۸ ر

بازاری زبان - اس میں وہ الفاظ اور جملے درج کیے گئے ہیں جو مختلف قسم کے پیشہ وروں یا خاص خاص بازاروں میں رائج ہیں - اور ایسے الفاظ و محاورات بھی ہیں جو اوباشوں اور عام بازاری لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں - اور انکے معانی و مطالب بیان کیے گئے ہیں - قیمت ۸ ر

افادات مہدی - نامور انشاپرداز مرحوم مہدی حسن 'افادی الاقتصادی' کے ۳۰ مضامین کا یہ مجموعہ چند سال پیشتر چھپا اور ہاتھوں ہاتھ نکل گیا تھا - اب دوبارہ طباعت ہوئی ہے - شروع میں مولوی عبد الماجد صاحب بی اے کا دیباچہ اور بیگم مہدی کی یادگاری تحریر ہے حجم ۲۴ جزو - قیمت ے ر

ارباب نثر (حصہ اول و دوم) مولانا حسرت ہاتی نے (۱) مختلف سلاسل شعرائے اردو کے شجرے ترتیب دئے ہیں اور (۲) سلسلہ شعرائے اردو کی فہرست دیکر بہت سے تذکروں نگاروں اور اردو شاعری پر مضامین لکھنے والوں کو بہت مدد ملیگی

کشف الظلام۔ شیخ الاسلام علامہ تقی الدین
سبکی کی مشہور تصنیف شفاء الاسقام فی زیارة
خیر الانام کا اردو ترجمہ از مولانا سید شاہ محمد عزیز الدین
صاحب پھلواروی۔ اس میں زیارت قبور، استمداد،
توسل تشفع، حیات انبیا وشہداء، مقام محمود، اقسام
شفاعت، ادعیہ ماثورہ وغیرہ پر بحث کی گئی ہے اور
امام ابن تیمیہ کے خیالات کی تردید کی گئی ہے قیمت عہ

سمات الاخیار۔ جونپور کے مشہور سلسلہ مشائخ
کے مورث اعلیٰ حضرت قطب الاقطاب شیخ محمد رشید مصطفےٰ
قدس سرہ العزیز اور اس سلسلہ کے دیگر اکابر سے لیکر
حضرت شاہ عبد العلیم آسی رحمۃ اللہ علیہ تک کے حالات
کا قابل قدر تذکرہ حضرت بندگی مصطفےٰ جمال الحق اور
حضرت قمر الحق شیخ غلام رشید (جنکا تعلق صوبہ بنگال سے
زیادہ ہے) کے مفصل حالات ہیں اور ایک گونہ بزرگان
پورنیہ کی تاریخ بھی ہے۔ حجم ۲۰۸ صفحے۔ کتابت وطباعت
دیدہ زیب۔ قیمت عہ

المصطفےٰ۔ حدیث شریف کی مشہور کتاب "المنتقیٰ" کا
اردو ترجمہ۔ از مولانا عبد الحمید اٹاوی۔ جس میں نماز
اور اسکے جملہ متعلقات، زکوٰۃ، روزہ، حج بیع وشرا
نکاح وطلاق کے اہم اور ضروری مسائل کے علاوہ عقائد
شرعیہ، ہجرت، جہاد، تبلیغ اسلام، آداب جنگ،
مال غنیمت، جزیہ اور غیر مسلموں کے ساتھ سلوک وغیرہ
جملہ امور کے متعلق صحیح حدیثیں مناسب تبویب وترتیب
کے ساتھ جمع ہیں۔ جس سے مسلمانوں کو ہر معاملہ میں
حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی دریافت
ہو سکتا ہے اور وہ حضور کا اتباع کر کے حسنات دارین
حاصل کر سکتے ہیں۔ حجم ۴۵۹ صفحے قیمت صرف عار

دُرر الجواہر۔ مولوی سید محمد یعقوب صاحب قادری
ڈپٹی مجسٹریٹ گیا نے یہ مختصر کتاب حضرت پیران پیر شیخ
عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مناقب وحالات
میں لکھی ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت ۱۱ر

رنج وراحت۔ چودھری سردار خاں صاحب
سروری نے اس کتاب میں نہایت دلچسپ انداز میں
حیات انسانی کا مقصد، موت وحیات، شادی وغم،
تقدیر وتدبیر، انفرادی واجتماعی زندگی، اشرف المخلوقات
کی ذمہ داریاں، جبر واختیار، تعلقات باہمی، دولت
کی تحصیل اور اسکا مصرف، تعلیم وتربیت، صحت و
عافیت، رسوم وقیود، اور قلب انسانی کے مختلف
جذبات اور گوناگوں خواہشات سے بحث کی ہے عہر

میر کے نشتر۔ اس چھوٹے سے رسالہ میں میر تقی میر
کے پاکیزہ کلام کے دو مختلف انتخابات جمع ہیں۔ ایک
انتخاب مولوی مسعود الرحمن خاں ندوی کا ہے اور دوسرا
مشہور شاعر ونثار خاں صاحب مرزا جعفر علی خان اثر
بی اے ڈپٹی کلکٹر کا۔ قیمت ۴ر

فرہنگ امثال۔ مولوی سید مسعود حسن رضوی
ادیب ایم اے مسلم لکھنؤ یونیورسٹی نے اس مختصر سے
لغت میں فارسی اور عربی کے ان اقوال واشعار کی
شرح اور محل استعمال بیان کیا ہے جو اردو میں ضرب المثل
کے طور پر رائج ہیں۔
قیمت ۱۱ر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۶ جلد ۳۷ جون ۱۹۳۰ء

دولت عثمانیہ محشر اقوام تھی

(از الکزنڈر پاول)

(مترجمہ محمد نجم الغنی قریشی - دار الترجمہ حیدرآباد دکن)

امریکہ کے نظم حکومت کو سمجھنے کے لیے اُس کی تاریخ سے واقف ہونا ضروری ہے - اسی طرح اگر کوئی شخص مشرق قریبہ کے مسئلے سے واقف ہونا چاہتا ہے تو اُسے یہاں کی تاریخ پڑھنی چاہیے - اس مسئلہ نے موجودہ صورت بہت ہی آہستہ آہستہ اختیار کی - ہم مغرب والے اپنے اپنے معاملات میں ایسے اُلجھے رہے کہ ادھر متوجہ نہ ہوسکے - لیکن جب ایک معمولی واقفیت رکھنے والے امریکن نے اس مسئلہ کو سمجھنا چاہا تو وہ اُسکے متعلق صحیح رائے قائم نہ کرسکا - اس وجہ سے کہ اس نے مشرق قریبہ کے متعلق جو واقعات اخباروں میں پڑھے وہ اس قدر پیچیدہ اور اُس سے اس درجہ غیر متعلق تھے کہ اُس نے انکے سمجھنے کی مطلق کوشش نہیں کی - علاوہ بریں جو جھوٹی سچی اطلاعیں اور غلط فہمی میں مبتلا کرنے والی خبریں جنگ عظیم کے بعد اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتی رہیں اُن سے بھی اُسکی اُلجھنیں بڑھتی گئیں - پس ان واقعات کو مدنظر رکھ کر میں کوشش کرتا ہوں کہ سچے حالات کے ساتھ ساتھ تاریخی واقعات بھی لکھوں - گویہ تاریخی واقعات ایسے ہونگے جن سے تم پہلے ہی بخوبی واقف ہوگے -

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ترکوں کے متعلق جو واقعات عام طور پر مشہور ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ وہ واقعات یہ ہیں کہ ترک وحشی، ظالم، ستمگر اور قاتل ہیں۔ وہ وسطی ایشیا کے ویرانوں سے بڑھ کر آئے اور پھر انھوں نے قانون روما اور یونانی فنون لطیفہ کو برباد کیا اور سلطنت روما کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تیرہویں صدی کے اواخر میں جب ترکوں کی سلطنت کی بنیاد پڑی تو اس وقت انکے اطراف و اکناف کے علاقے پہلے ہی سے تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ ان علاقوں کو ترکوں نے برباد نہیں کیا۔

رسول کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ۶۲۲ عیسوی میں مکہ سے ہجرت فرمائی اور اسی زمانے سے اسلامی عہد شروع ہوتا ہے۔ اس سے قبل سلطنت روم کا وہ مشرقی حصہ جو آجکل ٹرکی کہلاتا ہے بالکل عیسائیوں سے آباد تھا۔ سنہ ہجری کے آغاز سے پہلے مشرق کی وحشی اقوام اس علاقہ پر پے در پے حملہ آور ہوتی رہیں اور آخر میں یہاں کے تمام لوگوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اس علاقہ میں جا بجا یونانی منادر بنے ہوئے تھے اور یہاں کے لوگ یونانی تہذیب و تمدن اختیار کر چکے تھے۔ یونانی زبان ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اور اس سے ہر شخص واقف تھا۔ لیکن جب (راہنمائے ہدیٰ، سرور اصفیا، نبی الانبیا) ساربان ام القرےٰ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے دائرۂ اسلام کو وسعت دی تو ہر قبیلہ جس نے بزنطیہ کے صوبوں میں اپنا تسلط جمایا تھا مشرف بہ اسلام ہو گیا۔

سلطنت روم کی اس آخری یادگار، علم و تمدن کے اس آخری مرکز پر سب سے پہلے بغداد اور دمشق کے عرب خلفاء حملہ آور ہوئے۔ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد بارہ سال کے عرصہ میں (یعنی ۶۳۲ سے ۶۴۴ عیسوی تک) عرب لوگ مشرف بہ اسلام ہو کر مصر، شام اور عراق عرب پر قابض و متصرف ہو گئے لیکن ایشیائے کوچک علیحدہ ازاں توحید کے سیلاب سے محفوظ رہا گو اس علاقہ پر کبھی کبھی عرب حملہ آور ضرور ہوتے رہے۔ غرض اس سرزمین میں چار سو سال سے بھی زیادہ عرصے تک قانون روما، یونانی تمدن اور عیسائی مذہب بہ نسبت یورپ کے بہت زیادہ مامون و مصئون رہا۔

جب نارمن قوم نے انگلستان پر حملہ کیا تو کہا جاتا ہے کہ اسکے دو سال بعد یعنی ۱۰۶۸ عیسوی میں بمقام منازگرد (جرد) بزنطینی جنگ کا آغاز ہوا اور سلجوقی بادشاہ سلطان الپ ارسلان نے سلطنت بزنطیہ کو شکست فاش دی اور پھر آگے بڑھ کر اس نے اپنا جھنڈا بحر روم کے ساحل پر نصب کر دیا تھا۔ آئندہ دو سو برس تک حکومت بزنطیہ پر جو حملہ ہوا وہ کامیاب ہوا اور اس عرصہ میں اسکے تمام ایشیائی علاقے تباہ و برباد ہو گئے تھے۔ بارہویں صدی کے ربع آخر میں یہ علاقہ کچھ عرصہ تک

کردوں کے ماتحت رہا۔ انکے سردار سلطان صلاح الدین نے مجاہدین صلیب کو فلسطین سے نکال باہر کیا تھا۔ پھر آئندہ ۵ صدی کے ربع اول میں چنگیز خاں اور اسکے پوتے ہلاکو کا سیلاب عظیم آیا۔ ان کی پیشقدمی کی وجہ سے کرد پیچھے ہٹ کر ان پہاڑوں میں جا کر آباد ہو گئے تھے جو خلیج فارس سے شروع ہو کر بحر اسود تک چلے جاتے ہیں۔ ہلاکو خاں نے ملکوں اور تجارتی مرکزوں کو غارت کیا اور قریب قریب آدھی دنیا کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ تیرہویں صدی کے اواخر میں ترکی قبائل کے سردار عثمان نے جنکا مشہور و معروف خاندان ترکی پر چھ سو برس سے بھی زیادہ عرصے تک حکمران رہا ابھی اس سلطنت کو وسعت دینی شروع کی جسکی بنیاد ۔۔ طغرل نے انقرہ میں ڈالی تھی اور یہی سلطنت دولت عثمانیہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ قصہ مختصر اس سلطنت کے قیام کے وقت اسکے اطراف و اکناف کے ممالک پہلے ہی تباہ و برباد ہو چکے تھے۔

پس معلوم ہوا کہ ایشیائی ترکی پر چار بڑی بڑی قومیں یونانی، عرب، تاتاری اور ترک یکے بعد دیگر حکمران رہی ہیں اور ترک اسوقت حکمران ہیں۔ جن اقوام پر ترک اسوقت حاکم ہیں انکی نسل کا سلسلہ بہت ہی قدیم اقوام سے ملتا ہے۔ اگر ان مختلف اقوام کو انکی نسل اور طرز معاشرت کا اعتبار کرتے ہوئے علیحدہ کر لیا جائے تو پھر ترکی ایسا ملک رہ جائیگا جیسا ممالک متحدہ امریکہ ہے۔ لیکن قلمرو عثمانیہ میں یہ قومیں آپس میں مخلوط ہیں اور فتوحات کے وسیع سلسلہ نے انھیں منتشر کر دیا ہے۔ پس ان اقوام کو باقاعدہ اور منتظم مجموعہ کی حیثیت سے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ انکی کوئی منتظم اور بڑی آبادی کسی جگہ موجود نہیں ہے۔ اقوام کے اس مجموعہ میں ترکوں کی آبادی غالب ہے۔ اور یہ ایک جداگانہ قوم ہے۔ یہ حکمران قوم بڑی خوددار، متین، سنجیدہ اور معزز ہے۔ یہ ترکوں ہی کا دم قدم تھا کہ انھوں نے دولت عثمانیہ کو قائم کیا اور اُسے برقرار رکھا۔ اس کی بقا کے لیے وہ تین بر انھوں کی سرحدوں پر اپنا خون بہاتے رہے۔ ان کا سلطان رومی شہنشاہ تھا اور ہر ترک رومی باشندہ تھا۔

یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ موجودہ ترک باوصف اس امر کے کہ وہ اپنے تئیں عثمانی کہتے ہیں انکا ہر فرد سرفروشان عثمان کی نسل سے ہے۔ بلاشبہ ان میں سے بعض خود کو اس نسل سے بالکل اسی طرح ثابت کر سکتے ہیں جس طرح بعض امریکن اپنی نسل کا سلسلہ قدیم زائرین سے بتا سکتے ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھ لیجیے کہ ترک ان اقوام کی نسل سے ہیں جو ترکی میں آباد ہیں اور حلقہ بگوش اسلام ہو چکی تھیں۔ زمانہ قدیم میں فاتحین مردوں کو غلام بنا لیا کرتے تھے اور مفتوح اقوام کی عورتوں سے شادی بیاہ کر لیتے تھے۔ اس واقعہ کو مدنظر رکھ کر یہ بات مشکل معلوم ہوتی ہے کہ ترکوں میں اصلی قومیت باقی رہی ہو۔ ترکوں

کی جسمانی حالت اس لیے اچھی ہے کہ وہ صدیوں سے یورپی اقوام میں شادی بیاہ کرتے چلے آئے
ہیں۔ ترکی سپہ سالار مختلف اقوام کے لوگوں کو اُجرت پر اپنی فوج میں رکھا کرتے تھے سلاطین
دولت عثمانیہ کے پاس صدیوں تک جو جاں نثاروں کی فوج رہی اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ایشیا
میں اسکا کیسا اثر رہا۔ ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد عیسائی نسل کے لڑکوں کا مطالبہ کیا تھا،
اور انھیں ترکی سپاہی بنایا گیا تھا۔ یہ سپاہی اپنے افسروں کے نہایت مطیع اور فرماں بردار تھے اور
ان میں لوٹ مار کا بڑا شوق تھا۔ ترکی رعایا میں اس طرح ترقی ہوئی گو یہ لوگ ترکی زبان بولتے تھے
اور مسلمان بھی تھے لیکن ان میں ترکی خون مطلق نہ تھا۔ اگر آجکل کے کسی ترک کی نسل کا پتہ چلایا جائے
تو معلوم ہوگا کہ اس میں منگل، ایرانی، عرب، کرد، ارمنی، یونانی، لاطینی اور یہودی کا خون شامل ہے
اور اس میں ان لوگوں کی بہت سی خصوصیات بھی موجود ہیں۔

دولت عثمانیہ کے قائم ہونے سے پہلے چھ سو برس تک اغلب ہے کہ تین یا چار کروڑ عیسائیوں
کے بجائے تھوڑے سے مسلمان آباد کیے گئے ہوں اور اُس وقت مسلمانوں کے مقابلہ میں عیسائیوں کی آبادی
ان کا دسواں حصہ تھی۔ اور یہی آجکل کی آبادی کا تناسب ہے۔ یہ بات اب تک معلوم نہ ہو سکی کہ
کتنے لوگ قوت اور خوف کی وجہ سے مسلمان ہوئے اور کتنے برضا و رغبت۔ مسلمان اپنی فتوحات کے
وقت بیحد تحمل، بُردباری، اور رواداری سے کام لیتے تھے۔ عیسائی اگر اس بات کا اپنے طرز عمل سے
مقابلہ کریں تو اُنھیں شرم آنی چاہیے۔ جس وقت عیسائی یورپ ملحدین کو دار پر چڑھا رہا تھا تو اُس وقت
قلمرو عثمانیہ میں ملحدین کو عام اجازت تھی کہ وہ اطمینان سے اپنے مذاہب کی پیروی کریں۔ تمام مفتوحہ
لوگوں سے کہا جاتا تھا کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔ اگر اُنھوں نے مسلمان ہونے سے انکار کیا تو اُن پر
جزیہ کی کچھ رقم مقرر کر کے اُنھیں اپنے مذہب پر قائم رہنے کی اجازت دیدی جاتی تھی۔ جزیہ کی ادائی
پر یہ لوگ فوجی خدمت سے مستثنیٰ کر دیے جاتے تھے۔ ترکی فوج میں فقط مسلمان سپاہی ہوتے تھے۔
جو لوگ ان دونوں باتوں سے انکار کرتے تھے اُنھیں قتل کر دیا جاتا تھا۔ مفتوحہ علاقوں میں صرف
دو جماعتیں رہ جاتی تھیں مسلمان اور عیسائی۔ فاتح اور مفتوح۔ حاکم اور رعایا۔ یہاں یہ بات اچھی طرح
ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ گو یہ دونوں قومیں (مسلمان اور عیسائی) مذہب کی وجہ سے ہمیشہ ایک دوسرے
سے جدا رہیں لیکن دونوں میں کبھی چشمک تک نہیں ہوئی۔ مسجد اور گرجا اکثر ایک دوسرے کے
قریب قریب بنائے جاتے تھے۔ عیسائی اور مسلمانوں میں جو دشمنی پیدا ہوئی وہ زیادہ تر گذشتہ نصف صدی
کی پیداوار ہے۔ اس سے پہلے ان دونوں کو کسی کی قومیت اور مذہب سے مطلق کوئی سروکار نہ تھا۔

لیکن اس دشمنی کا اصلی سبب بالتفصیل ہم آگے چل کر بتائینگے جسکا اجمال یہ ہے کہ بعض بڑی بڑی
سلطنتوں نے اس عیسائی اقلیت کو جو قلمرو عثمانیہ میں آباد ہے ترغیب دیکر سیاسیات کے میدان میں لاکر
کھڑا کر دیا - اور اس میں خود انکی خود غرضیاں بھی پنہاں تھیں -

گو اس میں شبہ نہیں کہ سیاسی اور معاشی دباؤ اور تلوار کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو مسلمان
کیا گیا لیکن اس بات کی بھی کافی شہادتیں موجود ہیں کہ بہت سے گروہ برضا و رغبت خود حلقہ بگوش
اسلام ہوے - بہت سے لوگ ایسے رہگئے جو کسی ترغیب و تحریص سے بھی مسلمان نہیں ہوے - ایشیائے
کوچک کے اُن پہاڑوں میں جو مشرق میں واقع ہیں یہاں ایک چھوٹی سی مگر طاقتور ارمنی سلطنت تھی -
یہاں کے باشندے بہت قدیم زمانہ سے عیسائی تھے - یونانی سواحل پر آباد تھے - شام کے پہاڑی علاقہ
اور بندرگاہوں میں بہت سی عیسائی جماعتیں آباد تھیں - ایک زمانہ میں ان عیسائیوں کے ساتھ
وہی واقعہ پیش آیا جو رومن کیتھولک کے علاقوں میں مسلمان، پروٹسٹنٹ اور یہودیوں کو پیش
آیا تھا - مذہب کی وجہ سے انھیں کوئی بڑی خدمت نہ ملتی تھی اس لیے وہ تجارت وغیرہ کی
طرف متوجہ ہوگئے اور یورپی تجارت بہت جلد انکے ہاتھ آگئی - پھر رفتہ رفتہ پوری تجارت پر قبضہ
کر بیٹھے - اس طرح عیسائی دولتمند ہوگئے اور مسلمان غریب - فطرتِ انسانی کا اعتبار کرتے ہوے
دونوں میں حسد، دشمنی اور عداوت بھی بڑھتی گئی -

ایشیائی ترکی کی یہ عیسائی جماعتیں اسلامی ممالک کی سرسبز و شاداب زمینوں پر سفید پھپوندوں
کی طرح پھیل گئیں - اور یہی جماعتیں آگے چل کر تمدنی، معاشرتی، اور مذہبی شکلوں میں ترقی کر کے ایک
ناقابل حل مشکل بن گئی جو ترکی مسئلہ کے نام سے مشہور ہے - یہی وہ مسئلہ ہے جسکے سلجھانے میں تین
براعظموں کے بہترین دماغ اسوقت تک مصروف رہے مگر کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہونچ سکے - ڈاکٹر
ٹالکوٹ ولیمز نے لکھا ہے کہ اس ملک میں انکی موجودگی کا ثبوت یہ ہے کہ سلاطین دولت عثمانیہ
اور انکی مسلم رعایا نے انکے ساتھ تعصب سے مطلق کام نہیں لیا ورنہ اُنکا وجود بھی وہاں باقی نہ
رہتا - آگے چل کر اس نے بتایا ہے کہ یورپی اقوام قومی ترقی کے اصول کو اچھی طرح سمجھے ہوے ہیں اور
اس پر اُنھوں نے عمل بھی کیا ہے - حال ہی کے زمانہ تک تمام یورپی ممالک نے دوسرے مذہب
سے پھرنے پر بڑی بڑی قیود عائد کر رکھی تھیں اور بعض تو اب تک اس پر عمل پیرا ہیں - مثلاً [illegible]
کا قانون یہودیوں کے خلاف ایک زندہ مثال ہے -

اگر قلمرو عثمانیہ میں اتنی قلیل عیسائی آبادی ہوتی جتنی ایران یا اسلام یا افغانستان میں ہے

تو ایسے تباہ کن واقعات کبھی نہ پیش آتے اور نہ ایسے ہی حادثات رونما ہوتے جنھوں نے عیسائیت
کی بنیادوں تک کو ہلا دیا۔ اگر عیسائی لوگ مسلمانوں سے علٰحدہ خاص خاص رقبوں میں آباد ہوتے تو
ان علاقوں کو خاص خاص قوانین کے تحت آئرلینڈ کے مثل خود مختار کیا جا سکتا تھا۔ اور اسی قسم کا
عمل شام کے علاقے میں لبنان کے متعلق کیا گیا تھا جو کامیاب ثابت ہوا۔ یعنی لبنان کو ایک عیسائی
حاکم کے تحت خود مختارانہ حکومت دیدی گئی تھی، گو وہ دولت عثمانیہ کا جزو بنا رہا۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ترکی میں عیسائیوں کی گنجان آبادی کہیں بھی نہیں ہے جسکو ایک جداگانہ
سلطنت بنا دیا جائے۔ اور نہ کوئی عیسائیوں کی ایسی آبادی ہے جس پر آبادی کا اطلاق ہو سکے سمرنا
کے مدعی یونانی تھے اور اس پر انھوں نے قبضہ بھی کر لیا تھا۔ اس علاقہ میں یونانیوں نے اپنی آبادی
مسلمانوں سے تعداد میں کچھ ہی زیادہ بتائی تھی۔ اور انکی آبادی میں یہ توفیر تمام عیسائی عناصر مثلاً
ارتھوڈوکس، ارمنی، پروٹسٹنٹ اور لاطینی فرقوں کو ملا دینے سے ہوئی تھی۔ ایڈین میں جو ولایت سمرنا
کا ایک حصہ ہے مسلمانوں کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ اگر یہاں کے تمام عیسائی فرقوں کو بھی ملا کر
شمار کیا جائے تب بھی مسلمانوں کی تعداد ان سے بڑھی ہوئی رہتی ہے۔ اس علاقہ میں جو قدیم آرمینیا
سے اس وقت مطابقت کرتا ہے ارمنی لوگ سوائے چند شہروں کے مسلمانوں سے تعداد میں زیادہ
نہیں ہیں۔ اس بات کو خود ارمنی بھی تسلیم کرتے ہیں مگر کہتے ہیں کہ اگر اس علاقہ کی حکومت انکو دیدی
جائے اور یورپی اقوام اپنی اپنی فوج سے انکی حفاظت کریں تو یہاں کے مسلمان ارمنوں کی رعایا
بننے کے مقابلہ میں یہاں سے ہجرت کو ترجیح دیں گے اور اس علاقہ کا تخلیہ کر کے کہیں چلے جائینگے۔

قلمرو عثمانیہ میں جو عیسائی آباد ہیں انکی آزادی کے لیے یورپ اور امریکہ میں جو شور و غل مچا
اسکا اعتبار کرتے ہوئے وسیع النظر مدبرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جب تک تمام مسلمانوں کو قتل
نہ کر دیا جائیگا یا جیسا کہ مسٹر اسرائیل زنگوں نے فلسطین کے متعلق یہ تجویز پیش کی تھی کہ جب تک
مسلمانوں کو تاوتاً بے خانماں نہ کر دیا جائیگا اس وقت تک ترکی کے عیسائیوں کے لیے حصول خود مختاری
کا خیال محض ایک خواب ہے۔ پریسیڈنٹ ولسن کو یقین تھا کہ آرمینیا کو خود مختار کر کے انکی خود مختاری
کو برقرار رکھا جا سکتا ہے لیکن واقعات نے ثابت کر دیا کہ انکی رائے غلط تھی۔ ترکی کے جن جن علاقوں
میں عیسائی آبادی غالب ہے اگر بالفرض انھیں خود مختار بھی کر دیا جائے تو چھوٹے پیمانے پر
مشکلات کا سامنا ضرور پیش آئیگا۔ اس لیے کہ مسلمان کسی بیرونی اور خارجی حکومت کی سیادت کو
تو تسلیم کر لیں گے مگر اپنے ہمسایہ عیسائیوں کی رعایا بن کر رہنا وہ کبھی گوارا نہ کرینگے۔ عیسائی ہونے کی

حیثیت سے ہم اس بات کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسلمان عیسائیوں کے ماتحت رہنا ایسا ہی ناپسند کرتے ہیں جس طرح عیسائی مسلمانوں کی رعایا بنکر رہنے کو۔

جمہوریہ ترکیہ کے قائم ہونے سے پہلے لفظ "ترک" سے فقط مسلمان مطلب لیا جاتا تھا۔ عیسائیوں سے اسکا مفہوم مطلق نہ تھا۔ اگرچہ وہ ترکی رعایا تھے اور فقط ترکی زبان بولتے تھے۔ اسی طرح ارمنی، یونانی، اور شامی وغیرہ سے قومیت مراد تھی۔ ترکی کے باہر لفظ "یونانی" سے ترکی رعایا مطلب لیا جاتا تھا لیکن ترکی میں اسکا مفہوم یونانی کلیسائے ارتھوڈوکس کے فرقے سے تھا۔ گو وہ اور انکے اسلاف چھ سو برس سے ترکی رعایا چلے آتے تھے اگرچہ اس نے یونان میں قدم تک نہ رکھا تھا، گو وہ یونانی زبان سے واقف تک نہ تھا اور گو (اکثر ایسا بھی ہوتا ہے) یونانی خون اسکی رگوں میں نہ ہو۔ اسی طرح لفظ "ارمنی" سے بھی یہ مفہوم نہیں لیا جاتا تھا کہ وہ آرمینیا کا باشندہ ہے (آرمینیا کی غالب آبادی ترکوں کی ہے) بلکہ اسکا مطلب یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ کلیسائے گریگوری سے متعلق ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جن مختلف قوموں سے ترکی آبادی مل کر بنی ہے اسکا اظہار قومیت سے نہیں جیسا کہ اور ملکوں میں ہوتا ہے بلکہ مذہب سے ہوتا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح جزائر برطانیہ میں کلیسائے انگلستان کے پیرو انگریز کہلاتے تھے۔ رومن کیتھولک آئرش کہلاتے .... اور تمام پریسبٹیرین .... Presbyterians کہلاتے تھے۔

لیکن جمہوریہ ترکیہ نے ان تمام اختلافات کو جن سے فساد کا اندیشہ تھا یہ اعلان کر کے رفع کر دیا ہے کہ جدید ترکی کے تمام باشندے بلا امتیاز مذہب و قومیت "ترک" کہلائیں گے۔ جب عصمت پاشا نے لوزان کانفرنس میں کہا کہ "ہم ترکی میں فقط ترک چاہتے ہیں ہمیں یونانی اور ارمنی کی ضرورت نہیں" تو مخالفین ترکی نے اس نعرے کا یہ مطلب لیا کہ ترک اپنے ملک سے یونانیوں اور ارمنوں کو خارج کر دینا چاہتے ہیں۔ عصمت پاشا کا مطلب یہ تھا کہ جمہوریہ ترکیہ کے انتظامی اور سیاسی معاملات میں بجز ترکوں کے کوئی غیر قوم کا شخص حصہ نہیں لے سکتا۔ دوسرے الفاظ میں اسکو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ عصمت پاشا کے اس جملہ کا وہ ہی مفہوم تھا جو مطلب تھیوڈور روزویلٹ کے اس اعلان کا تھا کہ امریکہ میں جرمن امریکن اور ارمن امریکن یا کسی اور فرقہ کی ضرورت نہیں ہمیں فقط امریکن کی ضرورت ہے۔ بیرونی دنیا کو دھوکے میں مبتلا کرنے کے لیے یونانیوں اور ارمنوں نے اس واقعہ کو توڑ مروڑ کے بالکل غلط بیان کیا۔ جمہوریہ ترکیہ کا یہ منشاء ہرگز نہیں ہے کہ وہ ترکی سے ان لوگوں کا اخراج کر دے جو انکی وفادار رعایا بنکر وہاں رہنا چاہتے ہیں۔

ترکی میں جتنے عیسائی فرقے آباد ہیں انکی ٹھیک ٹھیک مردم شماری دستیاب نہیں ہوسکتی۔
لیکن یہ بات یقینی ہے کہ ترکی کی ایک کروڑ پینتالیس لاکھ آبادی میں سے (جمہوریۂ ترکیہ کا قیام ۱۹۲۳ء سنہ
عیسوی میں ہوا ہے) اندازاً ایک کروڑ بیس لاکھ مسلمان ہیں۔ دس لاکھ سے کچھ زیادہ یونانی ہیں
اور اتنی ہی تعداد ارمنوں کی ہے۔ باقی تعداد میں لاطینی، یہودی اور دوسرے مذاہب شامل ہیں۔
صدیوں تک یہ غیر مسلم فرقے سلاطین دولت عثمانیہ کے سایہ عاطفت میں آرام و آسائش سے رہے
فوجی خدمت سے مستثنیٰ تھے اور یہ لوگ ایسے امن وامان، اطمینان اور فارغ البالی سے زندگی بسر
کرتے رہے کہ سلطان کی مسلمان رعایا کو یہ باتیں نصیب بھی نہ تھیں۔ حکومت کے بڑے بڑے عہدے
ان غیر مسلموں کو ملتے رہے۔ وزیر اعظم کی خدمت پر ایک سے زیادہ مرتبہ ارمنی رہے۔

ترکی کے یونانی باشندے فن جہاز رانی میں بڑے ماہر ہیں۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ یونانیوں
کی آبادی کا سلسلہ تمام ترکی سواحل پر بحر اسود میں ایشیائے کوچک کے بندرگاہوں سے لیکر باسفورس
میں بحر ابیض، دردانیال اور اناطولیہ کے ساحلی علاقوں سے شام اور فلسطین تک چلا گیا ہے۔
یہاں سے سامیوں کی آبادی شروع ہوجاتی ہے۔ ان ساحلی علاقوں میں جہاز رانی سے متعلق تمام کاروبار
یونانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ اسکے علاوہ یہ لوگ ساہوکار، تاجر، وکیل اور ڈاکٹر بھی ہیں۔ ان تمام
پیشوں میں انکے مقابل ارمنی ہیں۔ یونانی فن باغبانی میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ اس بات کا
ثبوت ان باغات کے دیکھنے سے ملتا ہے جو انھوں نے بحر یونان کے ساحل پر لگا رکھے ہیں۔ یہاں یہ بات
قابل ذکر ہے کہ گزشتہ صدی کے ربع آخر میں جنوب مشرقی یورپ کی سیاسی سازشوں نے مسلمانوں اور
عیسائیوں میں منافرت کی آگ بھڑکا دی۔ اس سے پہلے ترکی کے یونانی باشندے عموماً مسلمانوں کے ساتھ
بہت ہی مل جل کے رہتے تھے۔

ارمنوں کی غالب تعداد اسوقت بھی انکے تاریخی وطن میں آباد ہے۔ ان کا وطن ایک برف
پوش پہاڑی ملک ہے۔ اس میں بہت تاریک اور گھنا جنگل ہے۔ سرسبز وشاداب چراگاہیں بھی اس میں
پائی جاتی ہیں، جھیلیں اور ندی نالے بکثرت ہیں۔ اور یہ علاقہ روسی کوہ قاف سے [illegible] شروع
ہوکر ایشیائے کوچک کے آر پار خلیج اسکندرون تک چلا جاتا ہے۔ اس علاقہ کے سوا ارمنی ترکی کے ہر
حصے میں تھوڑے تھوڑے پائے جاتے ہیں۔ قسطنطنیہ اور اسکے نواح میں انکی تعداد تقریباً دو لاکھ ہے۔
کچھ تعداد انکی زمین داری اور تجارت کرتی ہے۔ ان پیشوں کی وجہ سے یہ اچھے خاصے دولتمند اور خوشحال
ہوگئے ہیں۔ یہ لوگ متدین نہیں ہیں۔ اس سے بڑھ کر وہ چالاکی اور عیاری میں زیادہ مشہور ہیں۔ معلوم

ترکی میں جتنے عیسائی فرقے آباد ہیں انکی ٹھیک ٹھیک مردم شماری دستیاب نہیں ہوسکتی۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ ترکی کی ایک کروڑ پینتالیس لاکھ آبادی میں سے (جمہوریۂ ترکیہ کا قیام ۱۹۲۳ء سنہ عیسوی میں ہوا ہے) اندازاً ایک کروڑ بیس لاکھ مسلمان ہیں۔ دس لاکھ سے کچھ زیادہ یونانی ہیں اور اتنی ہی تعداد ارمنیوں کی ہے۔ باقی تعداد میں لاطینی، یہودی اور دوسرے مذاہب شامل ہیں۔ صدیوں تک یہ غیر مسلم فرقے سلاطین دولت عثمانیہ کے سایہ عاطفت میں آرام و آسایش سے رہے فوجی خدمت سے مستثنی تھے اور یہ لوگ ایسے امن و امان، اطمینان اور فارغ البالی سے زندگی بسر کرتے رہے کہ سلطان کی مسلمان رعایا کو یہ باتیں نصیب بھی نہ تھیں۔ حکومت کے بڑے بڑے عہدے ان غیر مسلموں کو ملتے رہے۔ وزیر اعظم کی خدمت پر ایک سے زیادہ مرتبہ ارمنی رہے۔

ترکی کے یونانی باشندے فن جہازرانی میں بڑے ماہر ہیں۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ یونانیوں کی آبادی کا سلسلہ تمام ترکی سواحل پر بحر اسود میں ایشیائے کوچک کے بندرگاہوں سے لیکر باسفورس میں بحر ایجیئن، دردانیال اور اناطولیہ کے ساحلی علاقوں سے شام اور فلسطین تک چلا گیا ہے۔ یہاں سے سامیوں کی آبادی شروع ہوجاتی ہے۔ ان ساحلی علاقوں میں جہازرانی سے متعلق تمام کاروبار یونانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ اسکے علاوہ یہ لوگ ساہوکار، تاجر، وکیل اور ڈاکٹر بھی ہیں۔ ان تمام پیشوں میں انکے مدمقابل ارمنی ہیں۔ یونانی فن باغبانی میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ اس بات کا ثبوت ان باغات کے دیکھنے سے ملتا ہے جو انھوں نے بحر یونان کے ساحل پر لگا رکھے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ گزشتہ صدی کے ربع آخر میں جنوب مشرقی یورپ کی سیاسی سازشوں نے مسلمانوں اور عیسائیوں میں منافرت کی آگ بھڑکا دی۔ اس سے پہلے ترکی کے یونانی باشندے عموماً مسلمانوں کے ساتھ بہت ہی ملجل کے رہتے تھے۔

ارمنیوں کی غالب تعداد اسوقت بھی انکے تاریخی وطن میں آباد ہے۔ ان کا وطن ایک برف پوش پہاڑی ملک ہے۔ اس میں بہت تاریک اور گھنا جنگل ہے۔ سرسبز و شاداب چراگاہیں بھی اس میں پائی جاتی ہیں، جھیلیں اور ندی نالے بکثرت ہیں۔ اور یہ علاقہ روسی کوہ قاف سے بشکل مثلث شروع ہوکر ایشیائے کوچک کے آر پار خلیج اسکندرون تک چلا جاتا ہے۔ اس علاقہ کے سوا ارمنی ترکی کے ہر حصے میں تھوڑے تھوڑے پائے جاتے ہیں۔ قسطنطنیہ اور اسکے نواح میں انکی تعداد تقریباً دو لاکھ ہے۔ کچھ تعداد انکی زمینداری اور تجارت کرتی ہے۔ ان پیشوں کی وجہ سے یہ اچھے خاصے دولتمند اور خوشحال ہوگئے ہیں۔ یہ لوگ متدین نہیں ہیں۔ اس سے بڑھ کر وہ چالاکی اور عیاری میں زیادہ مشہور ہیں معلوم

نہیں یہ بات صحیح ہے یا غلط۔ لیکن انکی غالب آبادی باغبانی اور کسانی کا پیشہ کرتی ہے۔ ارمنی جفا
خوشامدی اور حلیم واقع ہوئے ہیں لیکن جب حالات بدل جاتے ہیں تو پھر وہ سخت بدلہ لینے والے اور
کینہ پرور ثابت ہوئے ہیں۔ ان میں بہت سی اچھی باتیں بھی پائی جاتی ہیں جن میں ذہانت اور تعلیمی شوق
بھی شامل ہے لیکن اچھی باتوں کے مقابلہ میں انکی برائیاں بڑھی ہوئی ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کی ہمدردی
ان سے اٹھ گئی۔ ان کے عزیز سے عزیز دوست بھی کہتے ہیں کہ وہ سچ بولنے کے عادی نہیں ہیں۔
دنیا نے سمجھ رکھا ہے کہ ترک ارمنوں سے اس لیے متنفر ہیں کہ وہ عیسائی ہیں۔ یہ بات بالکل غلط
ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ترک اُن سے اس وجہ سے نفرت کرتے ہیں کہ وہ حکومت کے خلاف مسلسل سازشوں
میں مصروف رہے۔ ارمنی اپنی قومیت کی تحریک اور جذبۂ خود مختاری سے متاثر ہو کر نہ صرف سلطنت
ٹرکی کے خلاف ہر موقع پر سازشیں کرتے رہے بلکہ وہ روس سے بھی سازباز میں مصروف رہے ہیں
یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہونی چاہیے کہ ترکوں نے انکو اپنی سلطنت کے لیے ایک مصیبت سمجھ کر انکی
بیخکنی کے واسطے کوئی عملی صورت اختیار کی ہو۔ ترکوں نے انکی سازشوں کو فرو کرنے کے لیے جو
تدابیر اختیار کیں اُن پر مغرب والوں نے اعتراض کیا اور ارمنوں کو "شہید" کا رتبہ دیا حالانکہ ان کے
مذہب میں اس طرح جان دینے سے شہادت کا کوئی رتبہ ملتا ہی نہیں ہے۔

ٹرکی کا مذہب اسلام ہے اور ہمیشہ رہیگا اسی طرح انگلستان کا مذہب پروٹسٹنٹ ہے اور
ہمیشہ رہیگا۔ جس طرح بادشاہِ انگلستان حامی مذہب ہے اسی طرح سلاطین ٹرکی بھی خلیفۃ اسلام رہے
ہیں۔ یہ برطانیہ کی خوش قسمتی ہے کہ علاوہ کلیسائے انگلستان کے اُسکے علاقہ میں اور بہت سے
عیسائی فرقے پائے جاتے ہیں۔ ان میں کوئی ایسا غیر عیسائی فرقہ نہیں ہے جو زیادہ مشہور ہو بجز یہودیوں
کے۔ اور یہودی قریب قریب تمام ملکوں میں موجود ہیں۔ لیکن ٹرکی میں جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں
غیر مسلم فرقے ضرور ہیں جن کو باوجود اس واقعہ کے کہ انکو کلام مجید کے احکام کے مطابق اپنے طریقے
رواج اور مذہب پر چلنے کی عام اجازت ہے وہ غیر مطمئن، مبتلائے حسد، اور علانیہ بغاوتیں کرتے
رہتے ہیں۔ پس ٹرکی کو مجبور ہو کر اس معاملہ میں مذہبی اصول اور احکام کے تحت کام کرنا پڑا۔ دوسری
سلطنتوں میں اس قسم کے واقعات پیش نہیں آئے۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے حکومت ٹرکی نے
سختی سے کام لیا۔

ٹرکی کی غیر مسلم آبادی مذہبی جماعتوں میں منقسم ہے جنھیں "ملت" ملتیں (ج ملل) کہتے
ہیں۔ ہر فرقہ کا ایک مسلمہ سردار ہوتا ہے جسے عموماً بطریق کہتے ہیں۔ یہ بطریق اب تک کے عطیہ

عطیہ اختیارات کی بنا پر اپنے فرقہ کے لوگوں پر دینی اور دنیوی معاملات میں حکومت کرسکتے تھے۔ سلاطین دولت عثمانیہ نے جو مراعات اُنھیں دے رکھی تھیں وہ اپنی نوعیت میں غیرمعمولی تھیں۔ ترکی کی غیرمسلم رعایا بہت سے ترکی قوانین سے مستثنیٰ تھی۔ اور ہر فرقہ اپنے سردار کے ذریعہ بالکل اسی طرح حکومت سے تمام معاملات طے کیا کرتا تھا جس طرح بیرونی حکومتیں اپنے سفیر یا وکیل کے ذریعہ کسی سلطنت سے طے کیا کرتی ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۴۶۲ء عیسوی میں جب تمام یورپ میں دوسرے مذاہب کی چھوٹی چھوٹی جماعتوں کو کسی قسم کی کوئی رعایت حاصل نہ تھی، سلطان ترکی محمد دوم فاتح قسطنطنیہ نے جبکہ ترکی کی قوت معراج کمال پر تھی نہ صرف یونانی بطریق کو تخت نشین کیا بلکہ یونانیوں کو بہت سی غیرمعمولی مراعات دیدی تھیں جن سے وہ اب تک مستفید ہوتے چلے آرہے تھے۔

قدیم ترکی حکومت نے جن ملتوں کو تسلیم کیا تھا وہ یہ ہیں:—

(۱) یونانی جماعت جو روم کے نام سے مشہور تھی۔ اسکے تمام افراد ارتھوڈوکس کلیسا کے پیرو تھے۔ اس جماعت کے سردار کو بطریق اعظم کا لقب دیا گیا تھا اور اسکا مستقر قسطنطنیہ میں مقام فنار تھا۔

(۲) لاطینی یا کیتھولک۔ یہ فرقہ مذہبی اصولوں میں رومی طریقہ کا پیرو تھا۔ اس جماعت میں جینوا اور وینس والوں کی اولاد اور دوسرے مقامی کیتھولک باشندے شامل تھے۔ یہ لوگ لاطینی زبان میں عبادت کیا کرتے تھے۔

(۳) ارمنی گریگورین۔ یہ لوگ اُس بطریق کے پابند تھے۔ جسکا جائے قیام قسطنطنیہ تھا۔ لیکن مذہبی حیثیت سے اُس بطریق کے اثر میں تھے جو روسی آرمینیا میں مقام اکی می زن میں سکونت رکھتا تھا۔

(۴) ارمن کیتھولک۔ یہ اُس بطریق کے ماتحت تھے جسکا مستقر قسطنطنیہ تھا۔

(۵) شامی کیتھولک۔ اسکے بطریق کا جائے قیام ماردین تھا۔

(۶) کلدانی۔ یہ اُس بطریق کے زیر اثر تھے جو موصل میں رہا کرتا تھا۔

(۷) شامی یعقوبی۔ اس فرقہ کے بطریق کا جائے قیام ماردین تھا۔

(۸) پروٹسٹنٹ۔ اس جماعت میں خصوصاً وہ لوگ شامل تھے جو ارمنوں میں تبدیل مذہب کرچکے تھے۔

(۹) ملکانی۔ اسکے بطریق کا مستقر دمشق تھا۔

(۱۰) یہودی - انکے دو فرقے تھے - ان دونوں فرقوں کو اب حقوق علحدہ علحدہ دیدیے گئے ہیں۔

(۱۱) بلغاری کیتھولک - اسکا بطریق بلغاریہ میں رہا کرتا تھا -

(۱۲) مارونی - اس فرقہ کے جو لوگ لبنان میں رہتے تھے وہ شامی بطریق کے اثر میں تھے جس کا مستقر کینوبین کی خانقاہ تھا -

(۱۳) نسطوری اور اشوری عیسائی - یہ اُس بطریق کے زیر اثر تھے جسکا جائے قیام کردستان کے پہاڑوں میں مقام کوکانیز تھا -

اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ دولت عثمانیہ کی تمام رعایا جسکا تعلق کسی مسلمہ مذہب سے ہوتا تھا با قاعدہ طریقہ سے درج رجسٹر ہوا کرتی تھی - مثلاً مسلمان، ارتھوڈوکس، لاطینی، ارمنی، یہودی، مارونی وغیرہ وغیرہ - ہر غیر مسلم فرقہ کو اپنے مذہبی پیشوا (بطریق) کے ذریعہ اپنے حقوق کا تصفیہ کرنا پڑتا تھا - یہ بطریق حکومت کے سررشتہ عدالت العالیہ کے افسر اعلیٰ سے بالکل اسی طرح مراسلت کرتا تھا، جس طرح بیرونی سلطنت کے سفراء یا وکیل کیا کرتے ہیں - اگر کسی جماعت کا پیشوا اپنے فرقہ کی پیروی سے انکار کردے تو پھر اُس جماعت کے لیے کوئی چارۂ کار نہ تھا -

ان فرقوں کے سرداروں کو جو اختیارات حاصل تھے ان کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے جو گذشتہ صدی کے درمیانی حصہ میں پیش آیا تھا - وہ یہ کہ ارمنی بطریق نے ان تمام عیسائیوں کو جو انجیل کے پیرو تھے اپنے کلیسا سے نکال باہر کیا اور انکو ان موروثی حقوق سے بھی محروم کردیا تھا - جو بحیثیت ارمنی انھیں حاصل تھے - اسکے علاوہ اُس نے یہ بھی اعلان کردیا تھا کہ یہ لوگ ارمن نہیں ہیں - اور نہ صرف انکی حفاظت اور انکے معاملات میں ہر قسم کی پیروی سے انکار کردیا تھا بلکہ ان کے خلاف سخت پروپیگنڈا بھی پھیلایا - غرض اس طرح اس بطریق نے تمام پروٹسٹنٹوں کو اپنے کلیسا سے خارج کردیا تھا - اور اب ان لوگوں کو قانونی حیثیت سے ٹرکی میں کوئی حق حاصل نہ تھا - انکے حقوق کے لیے پیروی کرنے والا کوئی نہ تھا - اس لیے انکی کوئی عزت بھی نہ تھی - اس پر برطانیہ نے انکے معاملہ میں مداخلت کی - کچھ عرصہ کے بعد دولت عثمانیہ نے اُنھیں ایک جدید فرقہ تسلیم کرکے انکو حقوق دیدیے تھے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد جس طرح یونانی اور ارمنی چند سال تک ٹرکی کے خلاف سیاسی معاملات میں حصہ لیتے رہے - اسی طرح ان مواقع کے علاوہ دوسرے معاملات میں ان عیسائی فرقوں میں رشک وحسد کی وجہ سے سخت دشمنی پیدا ہوگئی تھی -

یونانی بطریق کے حامیوں اور بلغاری مذہبی سردار کے کارکنوں میں جو ہنگامے برپا ہوئے ان میں مقدونیہ
میں خون کی ندیاں بہہ گئی تھیں - اسی سلسلہ میں مختلف عیسائی فرقوں میں رشک و حسد کی وجہ سے
بیت المقدس میں مزار مسیح کے اندر جو کشت و خون ہوتا رہا اسکی وجہ سے عیسائیت کی نیکنامی کو
سخت صدمہ پہونچا -

لیکن اگر یہ بطریق اپنی اپنی جماعتوں کے حقوق کی حفاظت پر قناعت کرتے تو اس قسم کا
نظام بھی کچھ اچھا نہ تھا اور حکومت میں ابتری پیدا کرنے کا باعث ہوتا - لیکن انھوں نے ایسا نہیں
کیا - جو حقوق ان بطریقوں کو حاصل تھے اُن پر قناعت کرنے کے بجائے انھوں نے ہر مناسب موقع پر
ترکی کے خلاف سیاسیات میں حصہ لیا - ارمنی فرقہ کا بطریق سالہا سال تک سازباز کرتا رہا تاکہ
روس اور ترکی میں جنگ چھڑ جائے - اسی سازش کا نتیجہ تھا کہ ارمنوں نے اُسوقت مقام وان میں
ترکوں کے خلاف بغاوت کردی تھی جبکہ وہ (جنگ عظیم میں روس سے برسرپیکار تھے) تاکہ ترک ادھر
متوجہ ہو جائیں اور روس انکو شکست دیدے - پھر جب انقلاب کی وجہ سے روس میں ابتری واقع
ہوئی تو یہ ارمنی سلیشیا میں فرانس کی مدد پر آ گئے تھے - لیکن جب ۱۹۲۲ء کے موسم بہار میں ترکوں
نے فتحیاب ہوکر ارمنی بطریق کو حکم دیا کہ یا تو وہ سیاسی سازشوں سے باز آئے یا قسطنطنیہ سے
چلا جائے - اس پر اُس نے اخراج کو پسند کیا تھا -

یونانی حکومت کی خود مختاری کا ۱۴۵۳ء میں خاتمہ ہوا لیکن اسکے بعد پھر بھی کوئی چار سو
ستر برس تک اسکی مذہبی، تجارتی اور سیاسی قوت مقام فنار میں قائم رہی - یہ مقام یونانی
بطریق کا جائے قیام رہا - جب ۱۹۱۶ء میں ترکی کا خاتمہ ہوا تو یونانی اس علاقہ پر قابض ہوگئے
جسکے متعلق ۱۹۰۶ء میں روس اور برطانیہ میں معاہدہ ہوا تھا - یونانی بطریق نے ۹ مارچ ۱۹۱۹ء
کو باب عالی سے تعلقات منقطع کرکے اپنے فرقہ کے تمام لوگوں کو جو ترکی میں آباد تھے، ہدایت دیدی
تھی کہ اب وہ ترکی رعایا نہیں رہے - اور اسی بنا پر انھیں انتخاب میں بھی اب حصہ نہیں لینا چاہیے
یہ واقعہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا اُسوقت پیش آیا تھا جب اطالیہ نے آسٹریا پر حملہ کیا تھا - اُس
موقع پر پاپائے اعظم سلطنت اطالیہ کا قائم مقام بنکر آسٹریا کا طرفدار ہوگیا تھا اور حاکم وقت سے
باغی ہوکر اُس نے تمام رومن کیتھولک کو اطلاع دیدی تھی کہ وہ اب بادشاہ کی رعایا نہیں رہے
اور ان پر اسکی اطاعت فرض نہیں ہے - جب ترکی نے یونانی بطریق کے اختیارات سلب کرلیے
تو آرتھوڈوکس فرقہ کے ہزاروں لوگ سخت پریشان ہوے - اس لیے کہ انتخاب کوئی قائم مقام

نہ رہا تھا۔ جب تک یونانی اناطولیہ میں برسراقتدار رہے اسوقت تک انہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی لیکن جب ۱۹۲۲ء میں یونانیوں کو اناطولیہ میں شکست ہوئی تو انکو بھی سخت مصائب کا سامنا ہوا۔ پھر جب جمہوریۂ ترکیہ کا قیام ہوا تو اُسوقت سے یونانیوں کی پریشانیاں رفع ہوگئی ہیں وہ اس طرح کہ صدر جمہوریہ نے یونانی فرقہ کی ایک نئی جماعت قائم کرکے ان کا ایک سردار مقرر کردیا اور اسکو حقوق بھی دیدیے۔ انکا یہ بطریق مقام قیصریہ واقع ایشیاے کوچک میں رہتا ہے۔

جمہوریہ ٹرکی نے قسطنطنیہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ شرقی علاقہ کے یونانی بطریق کا اس علت میں اخراج کردیا کہ اس نے ٹرکی کے خلاف سازشوں میں حصہ لیا تھا۔ بعد کو یہ حکم منسوخ کردیا گیا تھا۔ لیکن جب یونانی بطریق کو معلوم ہوا کہ اسکے تمام اختیارات سلب کرلیے گئے ہیں تو اس خدمت سے خود بخود سبکدوش ہوکر ۱۹۲۳ء کے موسم خزاں میں ماونٹ اتھوس کی خانقاہ میں جاکر گوشہ نشین ہوگیا۔

دنیا کی بڑی بڑی عیسائی جماعتوں خصوصًا ممالک متحدۂ امریکہ کے عیسائیوں نے جمہوریہ ٹرکی کے اس طرز عمل کو جو اُس نے یونانی اور ارمنی بطریقوں کے ساتھ اختیار کیا بہت ہی قابل اعتراض قرار دیا تھا۔ لیکن میں عیسائیوں کے تعصب پر نہایت افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ انھوں نے واقعات پر مطلق غور نہیں کیا۔ فرض کرو کہ ہم نے یونانی بطریق کو واشنگٹن میں ایسے اختیارات دے رکھے تھے جو سفرا کے اختیارات سے بھی بڑھے ہوے ہیں، اور فرض کرو کہ اس بطریق نے خود کو ان تمام یونانیوں کا جو امریکہ میں آباد ہیں حاکم مطلق سمجھا، اس کے علاوہ اس نے امریکہ کے خلاف سازشیں بھی کیں اور اُسکا مستقر سازشوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ بتائیے کہ اُسکے متعلق ہم کیا طرز عمل اختیار کرینگے؟ کیا ہم اُسکی اس بات کو پسند کریں گے؟ اور اگر نہیں تو بتائیے کہ جمہوریہ ٹرکی سے کس طرح امید رکھ سکتے ہیں کہ وہ اس بات کو پسند کریگی؟

موجودہ زمانہ میں کسی بات نے ایسی دلچسپی اور ہمدردی پیدا نہیں کی جیسی ٹرکی کے ان عیسائیوں کے مستقبل نے پیدا کر رکھی ہے جو وہاں آباد ہیں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جسکو قابل سے قابل یورپین مدبر بھی حل نہ کرسکے۔ جنگ عظیم کے دوران میں اور اسکے بعد بھی ترکوں اور ارمنوں نے ایک دوسرے کے ساتھ ایسے ایسے ظالمانہ برتاؤ کیے جن سے یہ معاملہ اور بھی پیچیدہ ہوگیا۔ لیکن اب یہ بات ممکن معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان اور ارمنی آپس میں مصالحت کرلیں گے۔ یونانیوں کو اناطولیہ میں جو ناکامی ہوئی اُس سے یونانیوں اور ترکوں میں بہت ہی زیادہ کشیدگی پیدا ہوگئی اور اُسوقت سے ترک یونانیوں سے متنفر ہیں

اور یونانی ترکوں سے خائف ہیں اور اُن پر اعتماد نہیں کرتے۔

لیکن ہمیں پہلے ارمنوں کے معاملہ پہ غور کرنا چاہیے۔ اس قوم کی تعداد ٹرکی میں قتل اور اخراج سے گھٹتے گھٹتے اسوقت دس لاکھ سے کچھ ہی اوپر رہ گئی ہے۔ انکی حالت اب ایسی ناگفتہ بہ ہے کہ شاید کسی قوم کی ہو۔ چونکہ ترکوں نے انھیں خود مختاری دینے سے مطلق انکار کر دیا جہاں وہ کسی بیرونی سلطنت کی حفاظت میں رہ سکتے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اب بجز روس کے اُنھیں کوئی دوسری سلطنت پناہ دینے کے لیے رضامند نہیں معلوم ہوتی۔ تو اسکے معنی یہ ہوے کہ وہ قدیم یہودیوں کے مثل خانہ بدوش ہو کر بے خانماں ہو جائیں یا پھر وہ جمہوریہ ٹرکی کی ان شرائط پر رعایا بن کر رہیں جو حکومت انکے لیے پیش کرے۔ یہ معاملہ واقعی بہت پیچیدہ ہے۔ لیکن میں اپنے ذاتی علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر ارمنی خود مختاری کے خیال کو ترک کر دیں اور ٹرکی کی وفادار رعایا بنکر رہنا چاہیں تو ان کا مستقبل شاندار ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جمہوریہ ٹرکی کے اراکین ارمنوں کی قیمت سے ناواقف نہیں ہیں۔ بشرطیکہ وہ پھر سیاسی سازش نہ کریں۔ اگر ارمنی اب سیاسی معاملات میں حصہ نہ لیں تو پھر ٹرکی میں اُنکے لیے امن و امان کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اور وہ ارمنی لیڈر جو باہر سیاسی سازشوں میں مصروف ہیں وہ بھی اس سے باز آجائیں تو پھر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ یہ بدنصیب لوگ اپنے قدیم تاریخی وطن میں امن اور اطمینان سے کیوں زندگی نہ بسر کریں۔

ترکی یونانی آبادی کے تبادلہ کے مسئلہ نے عیسائی دنیا میں ماتم برپا کر دیا تھا۔ لیکن میں باوثوق طریقہ سے کہتا ہوں کہ اس میں ترکوں کا کوئی قصور نہ تھا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ تبادلہ آبادی کی یہ تجویز کوئی نئی تحریک نہ تھی اور نہ ترک اسکے محرک ہوے۔ دوسری جنگ بلقان کے ختم ہوتے ہی سنہ ۱۹۱۴ء میں یونانی وزیر اعظم ایم وینزی لوس نے یہی تجویز ترکی کو پیش کی تھی جسے ٹرکی نے بحیثیت اصول منظور کر لیا تھا لیکن جنگ عظیم کے چھڑ جانے سے اس بات پر عملدرآمد نہ ہو سکا تھا۔ پھر سنہ ۱۹۲۲ء میں ٹرکی یونانی جنگ کے بعد اس تجویز کو ڈاکٹر فری جوف ناشین نے پیش کیا تھا۔ ڈاکٹر موصوف کو مجلس بین الاقوام نے بغرض تحقیق واقعات اناطولیہ بھیجا تھا۔ پھر اس تجویز کو مجلس بین الاقوام نے منظور کر کے بغرض توثیق لوزان کانفرنس میں پیش کیا گیا تھا۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لاکھوں کسانوں کے لیے یہ تجویز مصائب و تکلیف کا باعث ہے لیکن جو لوگ یونانیوں کے ان مظالم سے واقف ہیں جو اُنھوں نے اناطولیہ میں کیے تھے وہ اس نفرت کا اندازہ کر سکتے ہیں جو ترکوں کو یونانیوں سے پیدا ہو گئی ہے۔ وہ اس بات

بھی واقف ہیں کہ کم از کم دونوں کی موجودہ نسل تو آپس میں مصالحت سے نہیں رہ سکتی۔ اور یونانی آبادی کی یہ تجویز اُن لوگوں کے لیے تو بہت ہی خطرناک ہے جو نسلہا نسل سے یہاں آباد ہیں۔ اور اس میں مجرم اور بیگناہ سب ہی شامل ہیں۔

ذرا انصافت سے کام لیکر ٹھنڈے دل سے غور کیجیے کہ فرض کرو ہم ترکوں کی جگہ ہوتے، اور فرض کرو کہ جنگ عظیم میں جرمنی امریکہ پر اس نیت سے حملہ کرتا کہ اسے فتح کرکے اپنی سلطنت کا جزو بنالے اور فرض کرو کہ وہ جرمن جو یہاں صدیوں سے آباد ہیں جرمنی کے ساتھ شریک ہوکر ہمارے مکانوں کو جلا دیتے، باغوں کو اُجاڑ ڈالتے، ہماری عورتوں پر دست درازیاں کرتے، بچوں اور بوڑھوں کا قتل عام کرتے اور شہر نیویارک کو مسمار کردیتے تو بتایئے کہ اختتام جنگ کے بعد جب ہم کامیاب ہوجاتے تو کیا ان جرمنوں کا ہم نیویارک میں آباد رہنا پسند کرتے؟ بالکل یہی واقعہ اناطولیہ میں پیش آیا تھا۔

حکومت انگورہ یونانیوں کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیتی۔ اگر یونانیوں کو واپسی کی اجازت بھی دیدی گئی تو ترک اُن سے بدلہ ضرور لیں گے۔ اسکے علاوہ ترک یہ بھی کہتے ہیں کہ جب تک یونانیوں کا سازشی اور باغی عنصر ٹرکی میں موجود ہے اُس وقت تک جمہوریہ ٹرکی میں امن وامان قائم نہیں رہ سکتا۔ لیکن ٹرکی کے معاشی مسئلہ کا اعتبار کرتے ہوئے یہ بات غور طلب ہے کہ آیا یونانیوں کا ٹرکی سے اخراج مناسب ہوگا یا نہیں۔ مگر ٹرکی لیڈر اس بات کا یہ جواب دیتے ہیں کہ وہ دو برائیوں میں سے ایک بُرائی کو اچھا سمجھتے ہیں وہ یہ کہ وہ اندرونی خرابی پر معاشی نقصان کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور میں اسکے متعلق اُنھیں کوئی الزام نہیں دیتا۔

غزل

بغیر اُس کے جینا ہے بیکار جینا　　مگر زندگی ہے کہ ناچار جینا
جو دیوانگی ہو گزر جائے یوں توں　　مگر عشق میں رہ کے ہشیار جینا
ارے بھولنے والے کچھ تو خبر لے　　ترے ہجر میں ہے مجھے بار جینا
نہیں عشق میں چین کی کوئی صورت　　اک آزار مرنا اک آزار جینا
اثیم - ایسے جینے سے مرنا ہی بہتر　　کہ جینا مگر با دل زار جینا

اثیم خیرآبادی

اثر

سید محمد میر نام[1]، اور اثر تخلص تھا۔ آپ خواجہ محمد ناصر کے چھوٹے بیٹے تھے، جو خود بھی شاعر تھے اور عندلیب تخلص کرتے تھے۔ آپ کے بڑے بھائی خواجہ میر درد دہلوی اُس دور کے نامور شعراء میں سے تھے۔ آپ نے ایک جگہ خوب فرمایا ہے

یا حضرت عندلیب بخشش — یہ تیرے ہی درد کا اثر ہے

آپ کی پیدایش دہلی میں ہوئی اور نشو و نما بھی وہیں پایا۔ بزرگی و پرہیزگاری اور علم و فضل میں آپ اپنے بڑے بھائی کے قدم بقدم تھے۔ چونکہ آپ کے والد ماجد کے انتقال کے بعد آپ کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے متکفل آپ کے بڑے بھائی خواجہ میر درد رہے، اس لیے آپ اُنکا بیحد ادب و احترام کرتے تھے اور اُن سے ویسی ہی عقیدت رکھتے تھے جیسی ایک حقیقی طالب اور مرید کو اپنے مرشد سے ہوتی ہے۔ میر درد کے انتقال کے بعد آپ ہی اُنکے سجادہ نشین ہوے۔ اپنی مثنوی خواب و خیال میں فرماتے ہیں:—

درد ہی میرے جی میں چھایا ہے — درد کا میرے سر پہ سایا ہے
تو نے ایسی ہی دستگیری کی — پدری، مادری و پیری کی
تو نے اس مہر و غور سے پالا — نہ پڑا مجھکو اور سے پالا

اسی طرح اپنے دیوان میں بھی اکثر مقامات پر درد کی محبت و شفقت کو یاد کرتے ہیں:—

ہے غلامی اثر کو حضرت درد — بدل و جاں تری جناب کے بیچ
شب زندہ داریوں اثر مردہ دل ہو درد — مانوں نہ پیر تیری کرامات کس طرح
درد کی ذاتِ پاک کا ہے — گو عین نہیں و لے اثر ہوں
بے درد تو کیونکہ رہ سکے گا — یہ حضرت درد کا اثر ہے

ایک رباعی لکھی ہے:—

---

[1] انجمن ترقی اُردو کے مطبوعہ دیوان اثر میں آپ کا نام سید محمد لکھا ہے، لیکن آزاد نے سید محمد میر ظاہر کیا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان میں سے کون حق پر ہے، مگر درد کا نام خواجہ میر ہونے کی رعایت سے اگر اثر کا نام بھی محمد میر ہو تو کچھ تعجب نہیں۔ تنہا

اے مرشد دستگیر قرباں تیرے　　　اے میرے زندہ پیر قرباں تیرے
تیری ہر بات پہ دل و جاں ہے فدا　　　یا حضرت خواجہ میر قرباں تیرے

دوسری رباعی میں فرماتے ہیں :-

یا درد یا اثر اثر تیرا ہے　　　اے سرد یہ بے پدر تیرا ہے
اللہ کریم اور تو کریم ابن کریم　　　یہ گو کہ گنہگار ہے پر تیرا ہے

اگرچہ آپ کے سنہ ولادت اور سال وفات کا کچھ پتہ نہیں چلتا، تاہم خواجہ میر درد کی وفات ۱۱۹۹ھ ہجری میں واقع ہونے کے خیال سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ تیرہویں صدی کے ابتدائی سنین میں ضرور زندہ تھے اور اپنے کلام سے لوگوں کے دل گرماتے رہتے تھے۔

کلام پر تبصرہ

آپ کے کلام میں سادگی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ آپ کے ہمعصر شعراء کے بھی اکثر اشعار سادہ ہیں لیکن آپ کے یہاں سادگی ایک نمایاں خصوصیت بن گئی ہے۔ مضامین عالی نہیں ہیں، وہی معمولی اور روزمرہ کے خیالات ہیں، لیکن طرز بیان ایسا سادہ اور دلکش ہے کہ آپ کا کمال فن اس سے ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ تشبیہات اور استعارات بہت کم بلکہ تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تصوف کی چاشنی بھی نہیں پائی جاتی۔ فارسی تراکیب بھی بہت کم ہیں۔ لیکن اشعار میں دلکشی، صفائی اور سلاست موجود ہے۔ اور یہ ایسی صاف زبان برتنے کا نتیجہ ہے کہ آپ کا کلام اثر سے خالی نہیں ہے۔ فرماتے ہیں :-

اتنا کوئی پوچھے بے وفا سے　　　منظور ہے کیا تجھے جفا سے
اس کوچے میں ہیں ہزار ہا دل　　　ہر سو افتادہ نقش پا سے
بگڑا نہ تو کس حساب میں ہے　　　رکھی نہ توقع آشنا سے
اس طرح جو کوئی ہوئے صدقے　　　ہونے دے تو تری بلا سے
افسوس کہ ان بتوں کے ہاتھوں　　　اب آن بنی اثر خدا سے

آپ کے کلام کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے تقریباً تمام دیوان چھوٹی چھوٹی بحروں میں اشعار لکھ کر مرتب کیا ہے۔ مشکل سے دو چار غزلیں ایسی نکلیں گی جو بڑی بحر میں کہی جا سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ چھوٹی بحر میں کسی مضمون کو سادگی کے ساتھ ادا کرنا کارے دارد کا مصداق ہے مگر یہ آپ ہی کا حصہ

ہے کہ آپ نے سادگی کو برقرار رکھتے ہوئے چھوٹی بحروں میں اچھے اچھے شعر نکالے ہیں بیشک غالب کی غزل اس بحر میں بہت خوب ہے، لیکن اثر بھی کچھ کم قابلِ تعریف نہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

حالِ دل مثلِ شمع روشن ہے   گو مجھے بات کر نہیں آتی
کیا کہوں آہ میں کسو کے حضور   نیند کس بات پر نہیں آتی
نہیں معلوم دل پہ کیا گزری   ان دنوں کچھ خبر نہیں آتی
کیجیے نامہربانی ہی آ کر   مہربانی اگر نہیں آتی
دن کٹا جس طرح کٹا لیکن   رات کٹتی نظر نہیں آتی
ظاہرا کچھ سوائے مہر و وفا   بات تجھ کو اثر نہیں آتی

مولانا حالی کی غزل اس بحر میں مشہور ہے، لیکن اثر کے بھی چند اشعار سن لیجیے:۔

تیرے ہی پاس دل ہے اپنے بدگماں رہے   بارے کسی طرح تری خاطر نشاں رہے
یہاں ہم سے خاکسار تو مانندِ نقشِ پا   ہر ایک قدم پہ آہ اب لے ہمرہاں رہے
رخصت ملی جو بولنے کی تو زباں نہیں   جب تک رہی زبان تو ہم بے زباں رہے
کب تک رہیں گی آہ یہی آزمائشیں   یارب بس اب تو ہم رہیں یا امتحاں رہے
کر لیجیے مرتے مرتے اثر نالہ و فغاں   سینے میں سوزِ عشق کہاں تک نہاں رہے

نواب مرزا داغ کا یہ شعر بہت مشہور ہے:۔

اُن کو آتا ہے پیار پر غصہ   مجھ کو غصے پہ پیار آتا ہے

لیکن اثر کی غزل بھی اسی طرح میں اپنی خصوصیات سے خالی نہیں ہے:۔

لوگ کہتے ہیں یار آتا ہے   دل تجھے اعتبار آتا ہے؟
دوست ہوتا جو وہ تو کیا ہوتا   دشمنی پر تو پیار آتا ہے
تیرے کوچے میں بے قرار ترا   ہر گھڑی بار بار آتا ہے
زیرِ دیوار تو سنے نہ سنے   نام تیرا پکار آتا ہے
حال اپنے پہ مجکو آپ اثر   رحم بے اختیار آتا ہے

ہمارے اردو شعرا کی عام روش کے خلاف آپ کے یہاں رکیک اشعار نہیں پائے جاتے۔ صرف حسبِ ذیل شعر ہم کو سخیف ملا ہے جو اردو کے دیگر رکیک اشعار کے بالمقابل بہت غنیمت معلوم ہوتا ہے:۔

دیکھیے رخصت پہ نہیں لے بیٹھیں گے — پیارے یہ یاد رہے جان بھی لے بیٹھیں گے

آپ کے یہاں بھرتی کے اشعار کم ہیں۔ اکثر غزلیں پانچ پانچ شعروں کی ہیں۔ صرف ایک طرح میں جو غزلہ لکھا ہے لیکن تمام اشعار کی تعداد اٹھائیس سے زائد نہیں ہے۔ اس سے آپ خود قیاس کر سکتے ہیں کہ اثر کے یہاں پانچ سات اشعار کی غزلیں کثرت ہیں اور گیارہ اور چودہ اشعار کی غزل تو خال خال ہی نظر آئے گی۔ آپ نے احتیاط ملحوظِ خاطر رکھی ہے کہ فضول اور لغو اشعار کو داخل دیوان نہیں کیا حالانکہ ہم اُردو کے بڑے سے بڑے شاعر کے دیوان میں بھی یہ نقص پاتے ہیں۔

دیوانِ اثر کے دیباچہ نگار نے اُنکے کلام کی سادگی کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ "یہ خوبی ایسی ہے جو اُردو کے کسی دوسرے شاعر میں نہیں پائی جاتی"۔ ہم اس میں یہ ترمیم پیش کرتے ہوئے کہ حضرت داغ کو مستثنےٰ کر دیا جائے، عرض کرتے ہیں کہ دیباچہ نگار کی رائے صحیح ہے۔ کوئی شبہہ نہیں کہ آپ کے یہاں قدیم اور متروک الفاظ موجود ہیں اور آپ کے لیے انکا استعمال ناگزیر بھی تھا۔ لیکن حیرت اور استعجاب کی بات بھی ہے کہ متروک الفاظ بھی آپ کے کلام میں ایسے اُکھڑے اُکھڑے نہیں معلوم ہوتے جیسے کہ دوسرے قدیم شعراء کے یہاں یا آپ کے دیگر ہم عصر شعراء کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً

کئی روز کی زندگانی ہے یہاں — بنے جس طرح زیست کر جائیے

آجکل ایسے موقع پر چند روز کہیں گے یا کوئی دن کہیں گے، تاہم آپ کے یہاں کئی روز بھی لطف دے رہا ہے۔

ذیل میں ہم اُن متروکات کو تحریر کرتے ہیں جو سرسری طور پر آپ کے کلام میں پائے گئے:

متروک		
بیگا بجائے بے	رہتا ہوں ہر حال سبھی وقت میں میں شاد	بیگانہ یہ اقر خاص ترے درد و الم کا
کیونکر کی جگہ کیونکہ	اللہ جانے آن پھنسا کیونکہ دام میں	میں تو نہ تھا فریفتہ کچھ خط و خال کا
بغل کے بیچ بجائے بغل میں	لا کر تجھے بٹھائے ہے میری بغل کے بیچ	میں منتظر ہوں جب سے اب، پنے خیال کا
کسو بجائے کسی	تصویر تیری آنکھوں میں آکر پھرے ہے آہ	مذکور جب چلے ہے کسو کے جمال کا
ٹک بمعنے ذرا	نظریں ہر ایک سے ملاتے ہو	ٹک تو آنکھیں کبھی ملائیے گا
ذرا بھی استعمال کیا ہے	کون ہو؟ کیجیے ہو کس لیے دل	نام اپنا ذرا بتائیے گا
ادھر بجائے اُدھر	دل تو اُدھر سے اُٹھ نہیں سکتا	ہاتھ اب کس طرح اُٹھائیے گا

قدر بجائے قدر — جانتا کچھ قدر ہماری بھی — تو بھی عاشق اگر ہوا ہوتا
دوانہ بجائے دیوانہ — ہوں دوانہ سمجھ کا میں اُس کی — جس نے دل کو تجھے دیا ہوگا
نت بجائے ہمیشہ — سخت جاں زشتک ہے سمندر کا — نت رہا آگ میں پہ جل نہ گیا
تس پر بجائے تاہم — جھوٹے نہ اُسے قرار کرنا — تس پر مجھے انتظار کرنا
اُس نے کے بجائے اُن نے — پھر کے دیکھا نہ اس طرف اُن نے — آہ ہر چند میں پکارا رہا
آئی نہیں بجائے آیا نہیں — مدت ہوئی کہ آئی نہیں ہے آنکھ کو خواب — رہتا ہے ان دنوں وہ کچھ اور ہی خیال میں
ان سیتے بجائے ان سے — مفت بر ہیں آنکھ بھی دلبر — دل کو ان سیتے کچھ بھی حاصل ہے
تو کی بجائے تو نے بولا جائے — تو نگہ کی نہ کی خدا جانے
اور ہم کی بجائے ہم نے — ہم تو ڈر سے کبھو نگاہ نہ کی
پھیر لے کے بجائے پھیر کر — ہر بات پہ ہے گالی نہ پھیر لے کے پیارے — اب در جواب آنا لگنے لگا ہے بارے
جاگہ بجائے جگہ — ناصح تو جیب سے اُٹھا ہاتھ — جاگہ نہیں اس میں اب رفو کی
مرا جان بجائے مری جان — کس قدر آہ مرا جان بکایا تو نے — گرچہ تجھ سے تو نہ تھی کچھ ہوس خام مجھے
سہج بجائے سہل — نشۂ عشق سہج ہے بنیا — لیکن اس کا سنبھال مشکل ہے

آپ کے کلام میں اثر ضرور ہے لیکن یہ کہنا کہ کوئی شعر اثر سے خالی نہیں، غلط ہے۔ آپ کا یہ فرمانا کہ "دیوان اثر تمام دیکھا ہے اُس میں ہر ایک شعر حالی" شاعرانہ تعلی ہے۔ بیسیوں اشعار ایسے ہیں جنکے پڑھنے سے کوئی اثر نہیں پیدا ہوتا۔

جس زمانہ میں میر جیسا شاعر زندہ ہو، ہر شخص کا حوصلہ نہیں ہو سکتا کہ شاعری کا دعوے کرے اور اپنے کلام کو موثر بنا دے۔ جو حضرات زمانہ شناس ہوتے ہیں وہ ایسے مواقع پر اپنی نئی طرز ایجاد کر لیتے ہیں، تاکہ اُنکا کلام سلیم الطبع خلائق ہو سکے۔ غزل گوئی میں میر نے وہ ناموری حاصل کی کہ نہ صرف اُس زمانہ میں بلکہ آج بھی کوئی اُسکا جواب نہیں۔ لہذا اُنکے معصروں نے یہ کوشش کی کہ میر کی راہ سے الگ ہو کر نئی روش اختیار کریں۔ سودا نے ہجو گوئی، مضامین آفرینی اور قصیدہ نگاری سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ خواجہ میر درد نے تغزل میں تصوف کے امتزاج سے اپنے کلام کو ناقابل فنا بنا دیا۔ سوز اور اثر نے سادگی اختیار کی لیکن آخرالذکر نے وہ کمال حاصل کیا کہ اتنے عرصہ کے بعد صرف داغ کو اُنکا مد مقابل کہا جا سکتا ہے۔ آپ کے خیالات بہت معمولی ہوتے ہیں، لیکن آپ کی طرز ادا اُنھیں دلکش اور موثر بنا دیتی ہے۔ سرسری طور پر پڑھنے سے تو اچھے سے اچھا شعر بھی بعض اوقات اپنی طرف

متوجہ نہیں کرتا۔ لہٰذا آپ کے اشعار بھی کوئی خاص کیفیت نہیں پیدا کر سکتے۔ ہاں آپ غور سے پڑھیے تو ہمارا ذمہ اگر آپ لطف اندوز نہ ہوں۔ چنانچہ ذیل میں آپ کے دیوان سے بہتر منتخب اشعار پیش کیے جاتے ہیں :-

۱- بلبل کرے ہے نالہ دگل ہے جگر فگار　　شاید کہ باغ میں وہ گل اندام ہو گیا

۲- تیرے آنے کا احتمال رہا　　مرتے مرتے یہی خیال رہا

۳- کون ہے وہ کہ خیر خواہی سے　　حال میرا تجھے سنائے گا

۴- گر تھا نہ یہ انداز یہ دل آہ نہ ہوتا　　رسوائے دو عالم کوئی واللہ نہ ہوتا

۵- نالہ کرنا کہ آہ کرنا　　دل میں آثر اُسکے راہ کرنا

۶- زیست ہوئی تعجبات ہے اب　　مر ہی جانا بس ایک بات ہے اب

۷- جس کی خاطر سبھی ہوے دشمن　　نہ ہوا وہ بھی دوست یا قسمت

۸- تو ہی بتا تجھے کہ یوں ہی بات کس طرح　　واں تو کہنا کہ کیجئے ملاقات کس طرح

۹- ہم اسیروں کی اُسے چاہیے خاطر داری　　اور اُلٹی نہ کہ ہم خاطر صیاد کریں

۱۰- کر دیا کچھ سے کچھ ترے غم نے　　اب جو دیکھا تو وہ آثر ہی نہیں

۱۱- بے وفا کچھ تری نہیں تقصیر　　مجکو میری وفا ہی راس نہیں

۱۲- اس بیکسی میں آہ مرا تو کوئی نہیں　　دل ایک ہے سو اور کے بس اپنے بس نہیں

۱۳- آہ و فغاں یہی ہے کہ سنتا نہیں کوئی　　فریاد ہے یہی کوئی فریاد رس نہیں

۱۴- کیا کیجیے اختیار نہیں دل کی چاہ میں　　ہیں سب وگرنہ تیری ہی باتیں نگاہ میں

۱۵- کیا کیجیے دم ہی لینے کی طاقت نہیں مجھے　　تھا ورنہ یاں تو کام تمام ایک آہ میں

۱۶- مر تو چلے کہاں تلک اب درگزر کریں　　یا ہم نہیں اس آہ میں یا آسماں نہیں

۱۷- جان سے ہم تو ہاتھ دھو بیٹھے　　اس دل بے قرار کے ہاتھوں

۱۸- سخت ناچار ہے تقدیر کے ہاتھوں بندہ　　ورنہ یوں باز رہوں تیری ملاقات سے میں

۱۹- نہ نگاہ، لے گئے جہاں دل کو　　آہ لے جائیے کہاں دل کو

۲۰- ہر دم فزوں ہے کجرویاں روزگار کی　　کچھ سیکھتا چلا ہے روش میرے یار کی

۲۱- دل اپنا پڑا اُس بت بے مہر کے پالے　　دشمن کو بھی حق سے کہ خدا یوں نہ ڈالے

۲۲- راہ تکتے ہی تکتے ہم تو چلے　　آئیے بھی کہیں جو آنا ہے

۲۳- دل جو یوں بے قرار اپنا ہے / اس میں کیا اختیار اپنا ہے

۲۴- نہ سنا تو نے کیا کہیں ظالم / ورنہ ہم عرض حال رکھتے تھے

۲۵- اسباب کوچ سارے سرانجام کر چکے / جس کام کو ہم آئے تھے سو کام کر چکے

۲۶- سمجھ تک غیر کی پہونچ ہو کہاں / یہ بھی اپنا گمانِ باطل ہے

۲۷- یاں سے اُڑیے بسانِ طائرِ رنگ / بے پروائی بال و پر کیجیے

۲۸- ہم سے اجل نصیب کہیں مارے مر چکے / اب تیغ کھینچیے کہ ڈرا کے سے ڈر چکے

۲۹- بنتی نہیں ہے اب تو کچھ اقرار کے سوا / جا ہے گریز پائی جہاں تک مکر چکے

۳۰- کہوں کیا خدا جانتا ہے صنم / محبت تری اپنا ایمان ہے

۳۱- یہ کیا ہو گیا دیکھتے دیکھتے / اثر میں تو ہیں، وہ بھی حیران ہے

۳۲- سیکھ لیجیے ٹک ایک دلداری / دلربائی تو خوب آئی ہے

۳۳- آسودگی کہاں جو دل زار ساتھ ہے / مرنے کے بعد بھی یہی آزار ساتھ ہے

۳۴- یا اپنے نہیں ہے دم میں تاثیر / یا اُٹھ ہی گیا اثر فغاں سے

۳۵- رہیو کنج قفس سلامت / کیا کام بہار اور خزاں سے

۳۶- اثر کیجیے کیا کدھر جائیے / مگر آپ ہی سے گزر جائیے

۳۷- کبھو دوستی ہے کبھو دشمنی / تری کونسی بات پہ جائیے

۳۸- اثر اس حال پر بھی جیتا ہے / کیا کہوں اُسکی سخت جانی کو

۳۹- تیرے کوچے میں جا کے جو بیٹھے / جان سے اپنی ہاتھ دھو بیٹھے

۴۰- حال اپنا کسو سے کیا کہیے / ایک دل تھا سو وہ بھی کھو بیٹھے

۴۱- دل پر یہ جبر یہ جور یہ جفا ہے / تقصیر یہی کہ با وفا ہے

۴۲- اب شوقِ چمن کسے رہا ہے / اپنا جی خاک ہو گیا ہے

۴۳- اس بحر میں جوں حباب سب کے / سر میں بھری اور ہی ہوا ہے

۴۴- یہ دیدہ ہے یا کوئی ہے طوفاں / یہ دل ہے یا کوئی بلا ہے

۴۵- آسودگی ہماری قسمت میں یاں نہ واں ہے / مر بھی چکے پہ وہ ہی نالہ وہی فغاں ہے

۴۶- ظاہر ہے سب اسی پر دیکھے ہے سب وہ ہی / جوں نور دیدہ لیکن نظروں سے خود نہاں ہے

۴۷- حقیقت جب کھلی دل پر ہوا معلوم تب ہم کو / کدھر کا عشق وے باتیں ترنگیں تھیں جوانی کی

۴۸- اختر احوال میرا رحم کھا کر کون سنتا ہے ۔ مگر یہ جان کر کچھ بات ہے شاید کہانی کی

۴۹- یا رب قبول ہووے اتنی دعا تو بارے ۔ دونوں جہان ہارے عاشق تجھی نہ ہارے

۵۰- پایا نہ کہیں نشان اپنا ۔ ہم نیں ہر چند جستجو کی

۵۱- دل کچھ اپنا اختر نہ چاہے ۔ بس ایک ہی تو آرزو کی

۵۲- آج کی رات اختر صبح تو ہوتی معلوم ۔ نہیں کٹتی نظر آتی ہے سر شام مجھے

۵۳- کچھ ان روزوں دل اپنا بخت سے آرام رہتا ہے ۔ اسی حالت میں لیکر صبح سے تا شام رہتا ہے

۵۴- کلیجا پک گیا ہے کیا کہوں اس دل کے ہاتھوں سے ۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ اسمیں خیال خام رہتا ہے

۵۵- تو آپ ہی خیر آپ شر ہے ۔ کچھ اور نہ نفع نے ضرر ہے

۵۶- اک تیرا خیال بیٹھ گیا ۔ دل سے خطرے تو سب اٹھائے تھے

۵۷- تھا جو منظور سو نہ دیکھا یاں ۔ ہم اختر کیا سمجھ کے آئے تھے

۵۸- ہے اختر یہ تو لازم و ملزوم ۔ عالم کون میں فساد رہے

۵۹- گو چشم بصیرت سے آئینہ بنا ہے دل ۔ لیکن نہ گئی اپنی قسمت کی تو حیرانی

۶۰- اختر اتنا تو کام کیجے گا ۔ کام اپنا تمام کیجے گا

۶۱- دم بدم ہے ترا مزاج کچھ اور ۔ کل جو تھا سو کچھ اور، آج کچھ اور

۶۲- آتش عشق کے ہاتھوں میں جلا جاتا ہوں ۔ آہ شعلہ کی طرح آپ جلا جاتا ہوں

۶۳- کیا کہوں کس طرح سے جیتا ہوں ۔ غم کو کھاتا ہوں آنسو پیتا ہوں

۶۴- جوں عکس کہاں مرا ٹھکانا ۔ تیرے جلوہ سے جلوہ گر ہوں

۶۵- نہ کہا جائے کہ دشمن نہ کہا جائے کہ دوست ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے اختر کون ہے وہ

۶۶- گلزار سب یہ اپنے تو نزد ایک خار ہے ۔ نظروں میں بس کہ اور ہی باغ و بہار ہے

۶۷- حقیقت میں دنیا کی نہ کچھ جانی نہ پہچانی ۔ ہے الجھیڑے اور ہی اے غفلت اے نادانی

۶۸- کام تجھ سے ابھی تو ساقی ہے ۔ کہ ذرا ہم کو ہوش باقی ہے

۶۹- آتش عشق لگائی ہوئی معشوق کی ہے ۔ بن لگے شمع کے پروانہ کہیں جلتا ہے

۷۰- مر گیا دل اختر اپنا تو سر شام فراق ۔ شام کے آہ مرے کو کوئی کب تک رو دے

۷۱- دل لیا اپنی خوشی جان بھی لے میری خوشی ۔ پھر مری جان تیرے کہنے تیری خوشی

۷۲- تیرے وعدوں کا اعتبار کرے ۔ گو کہ ہو، تاب انتظار کرے

محمد یحییٰ تنہا

مولانا محمد یحییٰ صاحب تنہاؔ نے میر علیہ الرحمہ کو زد و کوب کیا

آج کسی قدر فرصت تھی - میں رسالۂ الناظر نمبر ۲ جلد ۳۳ و نمبر ۵ جلد ۳۴ و نمبر ۴ و ۵ جلد ۳۶
و نمبر ۴ جلد ۳۷ - میں محمد یحییٰ صاحب کے مضامین دیکھ رہا تھا - جن میں اُنھوں نے ادبیات اُردو کو
اپنی نقادی کا سنت گزار بنایا ہے - مجھے بار بار خیال ہوتا تھا کہ یہ مولانا کون بزرگ ہیں اور کتنے بہتر
شاعر ہونگے کہ اُنھوں نے متقدمین کی شاعری کو پا در ہوا ثابت کرنے میں ایڑی سے چوٹی تک کا
زور لگایا ہے - میں سوچتا تھا کہ وہ ایک زبردست غزل گو ہونگے جنھوں نے میرؔ کے چودہ ہزار شعر
پڑھکر اور ناقدانہ غور و فکر کے بعد میر صاحب کو زد و کوب کے قابل قرار دیا ہے - انکا تخلص (تنہاؔ)
مجھے امید دلاتا تھا کہ وہ یقیناً غزل لکھتے ہونگے - الناظر نمبر ۲ جلد ۳۳ میں آپ نے ایک مکالمہ
کی صورت میں اُردو شاعری پر کچھ گل افشانی فرمائی ہے اور خصوصیت کے ساتھ جگرؔ، اصغرؔ، فانیؔ
کی غزل گوئی پر تبصرہ فرمایا ہے اسی سلسلہ میں صفحہ ۲۹ پر یہ دیکھکر کہ "تنہا صاحب کبھی غزل نہیں
کہتے" سخت مایوسی ہوتی تھی لیکن وہیں آپ کا ایک شعر بھی ملجاتا ہے جسکی بابت کہا گیا ہے کہ
تمام عمر کی شاعرانہ جدوجہد میں غالب کی غزل دیکھکر آپ نے یہ شعر فرمادیا ہے جسکی داد بھی آپنے
خود دی ہے کہ "اچھا خاصہ ہے" اس شعر سے اتنا پتہ تو لگ گیا کہ غزل گویوں کی فہرست
میں (گو وہ کتنی ہی مبتذل ہو) تنہا جیسے قابل شاعر بھی موجود ہیں - شعر بھی سُن لیجیے :

یہ کب کی دشمنی تھی فلک کو ہمارے ساتھ
جلتا ہے اُسکو بر سرِ آزار دیکھکر

شعر کے دوسرے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ فلک ہمارے معشوق کو بر سرِ آزار دیکھکر جلتا ہے وہ خود
آزار رسانی میں مشہور تھا اب ایک دوسرا ہم پیشہ پیدا ہو جانے سے اُسکو حسد پیدا ہوتا ہے - پہلے
مصرعہ میں فلک کے اس حسد کو اپنے ساتھ دشمنی سے تعبیر فرمایا ہے - جبکا شعر کے اندر کوئی ثبوت نہیں
ہے - معلوم نہیں ہوتا کہ فلک کی یہ حاسدانہ روش عاشق کے ساتھ کیونکر دشمنی ہو سکتی ہے - تنہا صاحب
کی فکر بلند پایہ نے کچھ سمجھ کر شعر کہا ہوگا - اور پھر بار ثانی غور فرما کر اپنے شعر کو اچھا خاصہ سمجھا ہے -
لیکن افسوس ہے کہ ہم شعر کے اندر کوئی خوبی نہیں پاتے - شعر بھی اُس شخص کا ہے جو غالب کے بعض
شعار کو مبتذل، اور اُردو اشعار میں انکی فارسیت کی مداخلت بیجا کو قابل اعتراض سمجھتا ہے -

ناسخ کے کلام کو بے نمک بتاتا ہے، ذوق کی شاعری کو جادۂ مستقیم سے ہٹا ہوا اور حقیقی شاعری سے دور سمجھتا ہے - میرؔ صاحب کو غزل کی شاعری کی پاداش میں قابل زدو کوب قرار دیتا ہے - اگر تنہا صاحب ہمارا مشورہ مانیں تو شعر کو اس طرح بنائیں، تخیّل کے لحاظ سے تو شعر میں بھی بلند نہیں ہوگا لیکن معمولی تلاش کیے جانے کے قابل ضرور ہو جائیگا :-

ہے آتش حسد بھی فلک میں ستم کے ساتھ　　　جلتا ہے اُسکو برسر آزار دیکھکر

اس قسم کے خیالات کثرت سے دماغ میں آتے جاتے تھے - آخرکار خیالات کے ہجوم نے مجھ پر غلبہ پاکر میرے اندر ایک استغراقی کیفیت پیدا کردی - میں خیال کی دنیا میں پہونچ گیا - یہ دنیا اس مادی دنیا سے مختلف ہے - موت کی معرفت جو انسانی ہستیاں مادی دنیا سے علیحدہ ہو جاتی ہیں یا جو غیر ذی روح اشیا حوادث روزگار سے مادی دنیا میں فنا ہو جاتی ہیں خیالی دنیا میں وہ سب موجود رہتی ہیں - خیالی دنیا کی وسعت گو لامحدود ہے مگر اُسکے سیر و سفر کے لیے ریلوے کمپنیوں کو کبھی کرایہ کے دینے کی ضرورت نہیں ہے - نہ ہوائی یا بحری جہازوں کے منت پذیر ہونے کی حاجت ہے - ہر شخص کا خیالی دنیا میں پہونچ جانا آسان ہے بشرطیکہ اُسکا دماغ فاتر ہو - میرا اس خیالی دنیا میں پہونچنا تھا کہ میرے کانوں میں کسی کے کراہنے کی آواز آنے لگی - اسکے بعد ہی میں نے سنا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے کہ "محمد یحییٰ نے میر علیہ الرحمہ کو زدو کوب کیا" - ان دونوں ٹکڑوں کو میرے تخیل نے ملاکر یہ نتیجہ نکالا کہ میر صاحب چوٹوں کے درد سے کراہ رہے ہیں اور اُنکا کوئی رفیق تنہا صاحب کی اس گستاخی کی منادی کر رہا ہے - میں چند ہی قدم بڑھا تھا کہ مجھے ایک شاندار عمارت نظر پڑی جسکے دروازہ کے متصل کمرے میں میرزا غالب ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور بآواز بلند فرما رہے تھے کہ "محمد یحییٰ نے میر علیہ الرحمہ کو زدو کوب کیا" میں نے میرزا صاحب کو سلام عرض کیا اور دوسرے کمرے میں جانے کی اجازت طلب کی - ارشاد فرمایا - بسم اللہ - جائیے - میر علیہ الرحمہ اور اُستاد ذوق سے شرف ملاقات حاصل کیجیے - میں دوسرے کمرے میں پہونچا جس میں نہایت صاف ستھرا فرش بچھا ہوا تھا - ایک پلنگڑی پر تکیے لگائے ہوئے ایک بزرگ لیٹے ہوئے تھے جو بیمار معلوم ہوتے تھے - کروٹیں بدلتے تھے اور کراہتے تھے - پلنگڑی سے ملے ہوئے فرش پر دوسرے بزرگ بیٹھے ہوئے تھے جو تیماردار معلوم ہوتے تھے - میں نے سمجھ لیا کہ بیمار میرؔ ہیں اور تیماردار اُستاد ذوق مرحوم ہیں - دونوں حضرات کو میں نے بہت ادب سے

ساتھ فرشی سلام عرض کیا۔ میر صاحب نے اشارہ سے سلام قبول فرمایا۔ ذوق مرحوم نے سلام
کا جواب دیا۔ دعا دی۔ اور تفصیل کے ساتھ میرا تعارف حضرت میر سے کرایا۔ ارشاد ہوا بیٹھ جاؤ۔
بیٹھ جانے کے بعد میں نے ہات جوڑ کر نہایت ادب سے عرض کیا کہ یہ میرزا صاحب کیا کہہ رہے ہیں
کہ تنہا نے آپ کے ساتھ گستاخی کی۔ سنا ہے جب سے آپ مادی دنیا سے قطع تعلق فرما چکے ہیں
مولوی محمد یحییٰ کو اب کوئی موقع باقی نہیں ہے کہ وہ کوئی ایسی گستاخی آپ کے ساتھ کر سکیں جسکا
میرزا صاحب اعلان کر رہے ہیں۔ میر صاحب نے فرمایا۔ بلا شبہ ایک صدی سے زیادہ زمانہ
گزرا کہ میرا جسم خاک ہو کر ریلوے لائن کے روڑوں میں پامال ہو چکا ہے۔ کوئی شخص اب میرے
جسم کو لات۔ گھونسہ۔ یا لٹھ۔ تلوار سے زدوکوب نہیں کر سکتا۔ مگر میری روح اب بھی موجود ہے
اور قیامت تک موجود رہیگی۔ محمد یحییٰ نے میری روح کو مضروب کیا جسکے صدمہ سے میں کراہتا
ہوں۔ اگر کوئی کسی سے یہ کہے کہ تم جوتیوں سے پیٹے جانے کے قابل ہو۔ تو مخاطب کے لیے جس میں
شرافت کا کوئی ایک ذرہ بھی ہے یہ الفاظ ہی اثر کرینگے گویا وہ جوتیوں سے پیٹا گیا۔ معلوم نہیں
یہ محمد یحییٰ کون بزرگ ہیں جنکو تبصرہ نگاری کا غیر معمولی شوق ہے۔ متعدد تذکروں میں ہم آسودگان لحد
کا ذکر ہو چکا ہے اور ان مصنفین کی مساعی جمیلہ سے ہماری خدمات اب تک دلدادگان ادب
اردو سے خراج تحسین وصول کر رہی ہیں۔ تنہا صاحب نے بھی انھیں تذکروں سے انتخاب
کر کے نقاد بننے کی کوشش کی ہے اور جو کچھ اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے وہ اس قدر نقل بے جوڑ
اور حیرت انگیز ہے کہ ایک ہی شخص ایسی متضاد رائیں کیونکر اختیار کر سکتا ہے۔
مادی دنیا کے اخبار و رسائل اس عالم میں بھی آتے رہتے ہیں۔ الناظر میں ہم نے تنہا
صاحب کے مختلف مضامین دیکھے ہیں جسکا کچھ اقتباس انھیں کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

"میں تو اردو زبان کی ترقی کے لیے سرے سے شاعری ہی کو کچھ عرصے کے لیے بند کرنا چاہتا ہوں
.... لوگ ابتک غزل لکھے چلے جاتے ہیں حالانکہ اس صنف میں اب کچھ لکھنے کے لیے باقی نہیں
رہا۔ اب غزل لکھنا حماقت شعاری میں داخل ہو گیا ہے۔ .... ہمارے بزرگوں نے غزل۔
مثنوی۔ قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ کو شاعری سمجھ رکھا تھا۔ ایسے صرف اصناف سخن میں سے
ہیں۔ لفظ شاعری کا اطلاق ان پر نہیں ہوتا" (الناظر ۱۳ جلد ۳۲)

پھر فرمایا کہ میری بابت کس قدر مضحکہ خیز رائے اختیار کی گئی ہے۔ شعرائے اردو کی رایوں کا
اس طرح انتخاب دیا ہے :-

"مسلمہ طور پر آپ (میرؔ) اردو کے غزل گو شعرا میں سب پر فوقیت رکھتے ہیں۔

سوداؔ۔ سوداؔ تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ — ہونا ہے تجھ کو میرؔ سے استاد کی طرف

مصحفیؔ۔ حسد کی جا نہیں سلطان مصحفیؔ کلام ان کا — کہ اپنے عہد کے مرزاؔ و میرؔ ہم بھی ہیں

ناسخؔ — شبہ ناسخؔ نہیں کچھ میرؔ کی استادی میں — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

ذوقؔ — نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب — ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

غالبؔ۔ غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

غالبؔ۔ ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

([illegible] ۱۹۲۶ء)

تنہا اردو شاعری کا علمبردار اور اس فن میں اپنا پیر و مرشد خواجہ حالیؔ کو مانتے ہیں (الناظر نمبر ۲ جلد ۲۳) لیکن حالیؔ کا بھی ایک شعر لکھا ہے جس سے مجھ حرماں نصیب کو ساتھ حالیؔ حسن عقیدت ظاہر ہوتا ہے۔

حالیؔ۔ حالیؔ سخن میں شیفتہؔ سے مستفیض ہوں — غالبؔ کا معتقد ہوں مقلد ہوں میرؔ کا (الناظر نمبر ۵ جلد ۳۶) مصحفیؔ کو میں نے ایک شعر کی داد دی تھی انھوں نے اسکی بڑی عزت کی۔ اس حکایت کو لکھ کر تنہا تحریر کرتے ہیں "اس حکایت سے مقصود یہ ہے کہ بڑے بڑے اہل سخن میر صاحب کو اعلیٰ درجہ کا شاعر تسلیم کرتے رہے ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ انکو مستند مانتے رہے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ غزل گوئی میں بے نظیر اور قابل استاد ہیں" (الناظر نمبر ۲، ۵ جلد ۲۳)

یہ جو کچھ محمد یحییٰ صاحب نے لکھا ہے دیگر مصنفین کی رائے سے مرعوب ہو کر لکھا ہے۔ اب آیندہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

"لیکن انکا کلام رطب و یابس سے پُر ہے اور یہ رائے انکے اعلیٰ اور بلند کلام کی نسبت ہے ورنہ انکا ادنیٰ درجہ کا کلام اس قابل نہیں کہ اسکو کلام کہا جائے۔ میر صاحب کا کلیات پڑھنے سے جہاں انکی عظمت اور زیادہ معلوم ہو جاتی ہے وہاں روز روشن کی طرح یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ شخص کس قدر پوچ گو بھی تھا۔ بعض غزلیں ایسی بھی ہیں کہ جن میں ایک شعر بھی شعر کہلانے کا مستحق نہیں ہے اور بعض غزلوں میں ایک آدھ شعر ہی کام کا ملتا ہے۔ بہت ہی کم ایسی غزلیں ہیں جن میں دو تین شعر اچھے نکل آتے ہیں۔ ورنہ مرصع غزل تو شاید دو چار غزلوں کے سوا ایک بھی نہ ملے۔ میرے اندازہ میں میر صاحب کی غزلوں کے اشعار تقریباً چودہ ہزار ہونگے ان میں سے صرف ایک ہزار شعر اچھے ہیں اور ایک ہزار معمولی۔ باقی بارہ ہزار اشعار صرف اس وجہ سے کہ میر صاحب کا کلام ہے تبرک سمجھنا چاہیے ورنہ میر صاحب اس حکایت کے مصداق ہیں جو انھوں نے ہلالی شاعر کے بارے میں

اپنی ایک مثنوی میں بیان کی ہے۔ یعنی انکا بلند کلام تو اس قابل ہے کہ میر صاحب کو انعام
و اکرام سے مالا مال کیا جائے اور ادنیٰ کلام اس قابل ہے کہ انکو بلا کی طرح زد و کوب کیا جائے۔"

(الناظر نمبر ۴ و ۵ جلد ۳۶)

میری ایک غزل سے "آیا کمال نقص مرے دل کی تاب میں" درج کی ہے اور تحریر کرتے ہیں
" اس زمین میں متاخرین شعراء نے اپنا زور قلم دکھایا ہوا اور خوب خوب اشعار رکھے ہیں لیکن
میر صاحب سے ایک شعر بھی اس طرح میں نہیں نکل سکا .... بہرحال ساری غزل ایسی ہے
کہ آج کل کے معمولی غزل گو اس سے بہتر اشعار کہہ سکتے ہیں۔" (الناظر نمبر ۴ و ۵ جلد ۳۶)

سننے والے کو تعجب ہوگا کہ اُردو غزل گویوں میں سب پر جسکی فوقیت تسلیم کی جائے جسکی بابت یہ بھی کہا جائے کہ بڑے بڑے اہل سخن اعلیٰ درجہ کا شاعر تسلیم کرتے ہیں اور بغیر کسی استثنا و شبہ کے وہ غزل گوئی میں بے نظیر اُستاد مانا جائے۔ اُسی کی بابت یہ اعلان بھی کیا جائے کہ وہ پوچ گو ہے اُسکی بعض غزلوں میں ایک شعر بھی شعر کہلانے کا مستحق نہیں ہے اور بعض بعض غزل میں ایک آدھ شعر کام کا ملتا ہے۔ دو یا تین شعر کسی غزل میں شاید ہی اچھے ہوں چودہ ہزار شعر میں بارہ ہزار شعر اس قابل ہیں کہ زد و کوب کیا جائے آج کل کے معمولی غزل گو بھی اس سے بہتر شعر کہہ سکتے ہیں۔ اس تبصرے سے یہ اچھا تھا کہ فاضل ناقد مجھے پوچ گو کہکر دنیائے شاعری سے قطعاً خارج کر دیتا اور ایسی متضاد رائے اختیار کرکے اپنے اختلال حواس کا ثبوت نہ دیتا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

اتنا فرمانے کے بعد میر صاحب پھر کراہنے لگے۔ تھوڑے وقفہ کے بعد فرمانے لگے کہ ان ملک الشعراء اُستاد ذوق نے غزل اُردو کو جس معراج کمال پر پہونچایا اُس احسان سے ہوا خواہانِ زبانِ اُردو قیامت تک سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ وقت اور زمانہ کو دیکھ کر ضرب الامثال اور محاورات کو جس خوبی سے غزل اُردو میں جگہ دی ہے وہ اب تک انکی یادگار رہیں اور یہ موتی آسمان غزل پر ہمیشہ ستارے بنکر چمکتے رہیں گے۔ حقیقت میں یہ کمال تھا جو تنہا کو عیب نظر آتا ہے۔ فارسی اور بھاشا کے انضمام سے زبان اُردو مکمل کیجا رہی تھی اسکی بناوٹ میں ذوق نے جو کچھ مدد دی وہ کم تحسین کے قابل نہیں ہے۔ لیکن تنہا کی رائے میں وہ شاعری کے جادۂ مستقیم سے ہٹ گیا۔ ایک صدی کے بعد تنہا کو توجہ ہوئی ہے کہ تفسیر کے مقابلہ میں ذوق سنگلاخ زمینوں میں غزل طرازی نہ کرتے بلکہ آج کل کے موجودہ طلبہ کی تائید و تقلید کرتے جنکے دماغوں میں کالجوں کی سموم آب ہوا

نے شاعر ہونے کا خیال پیدا کر دیا ہے۔ حقیقت میں یہ طلبہ نہ ماہیت شعر کے ماہر ہیں نہ تخئیل کی بلندی
و پستی کو سمجھتے ہیں لیکن انکا اور اُنکی شاعری کا ذوق کے زمانہ میں وجود نہ تھا۔ میر ملک الشعرا ذوق
سے ان حضرات کی تقلید کی امید کرنا بھی خلاف دانشمندی ہے۔ تنہا کو اگر اُردو کی موجودہ غزل
سرائی پسند نہیں ہے تو وہ اُسکو اپنے تبصرہ سے بھی معاف رکھتے۔ بہت چیزیں دنیا میں ابھی ایسی
موجود ہیں کہ زمانہ حال کو انکی ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً قلمی کتب، دستی تصویریں، قدیمی اسلحہ
(گرز وغیرہ) لیکن وہ بلیغ اہتمام سے محفوظ رکھے جاتے ہیں اور ان مصنوعات قدیم کو ایک آئینہ سمجھکر
اُسوقت کی صناعی اور طباعی کے خط و خال ان میں دیکھے جاتے ہیں۔ اگر غزل کی شاعری بقول تنہا
کے اب بیکار ہے تو بھی شعرائے قدیم کو ٹھکرانا نہیں چاہیے۔ اُنکے ساعی بارآور ہو چکے اب کم سے کم
اس نام نہاد جماعتِ شعراء کو بھی اُنکا احترام کرنا چاہیے۔

اس قدر طویل تقریر کے بعد میر صاحب پھر کراہنے لگے۔ آنکھیں بند کر لیں۔ میں سمجھا کہ سو گئے۔
تھوڑی دیر میں پھر آنکھیں کھول دیں اور فرمایا۔ عزیز من۔ ناسخ کے ساتھ بھی اس ناقد نے برملا
برتاؤ کیا۔ کچھ تفصیل کرنے والے تھے کہ میں نے عرض کیا ـــــــ اس بحث پر آسی صاحب
لکھنوی حضرت ناسخ کی حمایت میں کافی روشنی ڈال چکے ہیں۔ آپ کی طبیعت اسوقت صدمہ رسیدہ
ہے۔ اس بحث کو دوسرے وقت پر ملتوی فرما دیجیے۔ محمد یحییٰ صاحب سے میری ملاقات نہیں ہے۔
غالباً وہ مصنفین و مولفین کے طبقہ میں داخل ہونے کے لیے مضطرب ہیں اور اسکے اہل نہیں ہیں۔
آپ کی شہرت و عزت کو وہ نقصان نہیں پہونچا سکتے۔ نہ جناب ناسخ یا حضرت ذوق کے کارناموں
کو صفحۂ ہستی سے مٹا سکتے ہیں۔ دنیائے شاعری میں قیامت تک آپ کا نام رہیگا۔ آپ کی تقلید آپ کے
لیے ایک نعمت ہے۔ آپ اسقدر رنج نہ کریں۔ چاند پر خاک ڈالنے سے خاک نہیں پڑ سکتی۔ اگر آپ
حکم دیں تو میں تنہا صاحب کی تنقیدوں پر مسلسل تبصرہ کروں اور انکی نثر نگاری کی بھی پڑتال کروں
اور دنیا کو دکھا دوں کہ جس طرح وہ غزل لکھنے کے عادی نہیں ہیں اسی طرح وہ نثر لکھنے میں بھی عاری
ہیں۔

میری اس گزارش پر میر صاحب کے چہرہ پر کچھ بشاشت کے آثار پیدا ہوئے اور شاباش
شاباش۔ فرما کر میری عزت افزائی کی۔ میں نے عرض کیا کہ میں حضور کی زبان سے حضور
کا کوئی شعر سننا چاہتا ہوں۔ اُستاد ذوق نے سفارش فرمائی۔ میر صاحب نے سر کو ذرا تکیے
سے اونچا کیا اور یہ شعر پڑھا:-

جو مجھے دیکھنے کو آتا ہے — پھر مجھے دیکھنے نہیں آتا

شعر اپنی جگہ پر حد سے زیادہ ثقیل ہے اور میر صاحب نے پڑھا بھی اس طرح کہ اُسکی تاثیر دوبالا ہوگئی حقیقت میں ایسے ہی شعر کو سہل ممتنع کہتے ہیں۔ کس قدر سادہ طور پر اپنے بد سے بدتر حال کا نقشہ کھینچا ہے۔ اُستاد ذوق نے سبحان اللہ سبحان اللہ کہکر داد دی۔ مجھ پر خاموشی کا عالم طاری ہوگیا چند منٹ کے بعد مجھ میں بھی کچھ ہمت پیدا ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ حضور۔ شعر اپنے اندر اسقدر تاثیر رکھتا ہے کہ الفاظ سے اُسکی داد دیا جانا ممکن نہیں ہے۔ یہ آپ ہی کا حصہ ہے اور قدرت نے آپ ہی کو یہ طاقت عطا فرمائی ہے۔ بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے کہ تم کوئی اپنا شعر سناؤ میاں ذوق تمھاری بہت تعریف کر چکے ہیں۔ میں اس حکم کو سنکر ششدر ہو گیا اور سوچنے لگا کہ میرا کوئی شعر میر صاحب کو سنانے کے قابل کیونکر ہو سکتا ہے۔ ڈرتے ڈرتے اپنا ایک مطلع پڑھا جو اتفاق سے اُسوقت یاد آگیا۔ تخیل کے لحاظ سے میر صاحب کے شعر سے ملتا جلتا ہے۔ اور میں نے بھی اپنی بیماری کے بد سے بدتر حال کی مصوری کی ہے۔ وہ مطلع یہ ہے

بیمار ترا اب حرکت کر نہیں سکتا — جینے کی یہ صورت ہے کہ وہ مر نہیں سکتا

مطلع سننے کے بعد میر صاحب نے مجھے نہایت غائر نظر سے دیکھا اور تھوڑے سکوت کے بعد ذوق علیہ الرحمۃ سے فرمانے لگے تم سچ کہتے تھے یہ بہت اچھا کہتے ہیں۔ یہ الفاظ میرے لیے مایۂ ناز تھے۔ میں نے کھڑے ہو کر سلام عرض کیا۔ ارشاد ہوا کہ پھر پڑھو۔ میں نے دوبارہ مطلع پڑھا۔ بہت خوش ہوئے حضرت ذوق نے فرمایا۔ ماشاءاللہ۔ میں آداب بجا لایا۔ اور دونوں حضرات کا شکریہ ادا کیا۔ رخصت ہونے کی اجازت چاہی اور کمرے سے باہر آیا۔ واپسی میں مرزا غالب سے پھر ملاقات ہوئی۔ کرسی پر خود تشریف رکھتے تھے ایک خالی مونڈھا بھی پڑا ہوا تھا مجھے اشارہ کیا کہ بیٹھ جاؤ۔ میں سلام شکریہ کے بعد بیٹھ گیا۔ فرمانے لگے۔ بھئی اس محمد یحییٰ کی حرکت سے ہم کو سخت ندامت ہے۔ اچھا ہوا تم میر صاحب سے مل آئے اور انکا غم غلط کر آئے۔ میں بھی سن رہا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ یحییٰ صاحب آپکے تو بہت مداح ہیں۔ یہ سنکر اُچھل پڑے اور فرمانے لگے۔ کیا میری شاعری کو ایسے ناقدین کی مدح کی ضرورت ہے۔ جو شخص یہ کہے "بعض جگہ غالب کی فارسیت اردو کے محاورہ کو بھی بدل دیتا ہے لیکن ہم اُسکو قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں"۔ میں انکی مدح کو ہجو ملیح سمجھتا ہوں یحییٰ صاحب کس چیز کو اُردو سمجھتے ہیں اُردو ہماری ساختہ ہے۔ زبان اُردو میں وسعت پیدا کرنے کے لیے مجھے اختیار تھا کہ فارسیت اور عربیت کو اس بے مایہ زبان میں داخل کروں یا کسی کو

اعتراض کا حق نہیں ہے۔ اسکے علاوہ میں میر علیہ الرحمہ کو اُستاد کامل مانتا ہوں وہ اُن مرحوم کو گالیاں
دیتا ہے، پوچ گو لکھتا ہے، زد و کوب کے قابل سمجھتا ہے۔ ایسے شخص کی زبان سے مجھے اپنی مدح کیونکر
اچھی معلوم ہو سکتی ہے۔ ایسا شخص قدردانوں کی جماعت میں جگہ پانے کا بھی مستحق نہیں ہے۔ تہا فن شعر
سے اسقدر بیگانہ ہے کہ اُسکی خاموشی اس سے بدرجہا بہتر تھی کہ وہ میری شاعری کی ستایش کرے۔
اسوقت میرزا صاحب صاف گوئی پر تُلے ہوے تھے۔ موقع پاکر میں نے عرض کیا کہ اکثر حضرات
نے آپ کے دیوان اُردو کی شرح لکھ کر آپ پر اور آپ کے مداحین پر بڑا بھاری احسان کیا ہے۔
یہ سنکر میرزا صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا اور غصہ سے فرمانے لگے شارحین میں سب سے زیادہ
عالم۔ فاضل۔ ادیب مولانا طباطبائی صاحب ہیں اُنھیں کی شرح کو دیکھیے۔ میں نے جو کچھ
لکھا ہے وہ اچھا ہو یا بُرا لیکن ان حضرت نے شرح لکھ کر میرے اشعار کو نہیں بلکہ اپنی قابلیت کے
معمہ کو ضرور حل کر دیا۔ مثلاً میں نے بادشاہ کی مدح میں جب اُنھوں نے میرا وظیفہ مقرر فرمایا
تھا غزل کے رنگ میں چند شعر لکھے تھے لیکن طباطبائی صاحب نے اسکی شرح فرما کر میری روح
کو ایذا پہونچائی اور دنیا کو مغالطہ میں ڈالا۔ اُس غزل کے چار شعر مع شرح کے ملاحظہ کیجیے اور
میری مظلومیت پر افسوس فرمائیے۔

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے — لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

شرح طباطبائی: "حضرت کی طرف خطاب ہے اور معنی یہ ہیں کہ زر و گوہر و مال دنیا
کو آپ عزیز نہیں جانتے تھے کیا اُسی طرح مجھکو بھی سمجھتے ہیں۔ تو میں زر و گوہر نہیں ہوں"

میرزا غالب: "مجھ پر خدا کی لعنت ہو اگر میں نے یہ شعر نعت شریف میں لکھا ہو۔ زیادہ کیا کہوں۔"

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ — رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھکو منع قدمبوس کس لیے — کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

شرح طباطبائی: "ان دونوں شعروں میں بھی صاحب معراج کی طرف خطاب کیا ہے۔"

میرزا غالب۔ واللہ باللہ طباطبائی صاحب مجھ پر افترا کر رہے ہیں۔ میرے ان دونوں شعروں
کو نعت شریف سے کوئی تعلق نہیں ہے نہ ہو سکتا ہے۔ میں نے بادشاہ کی خوشامد میں کچھ مزید
انعام لینے کے لیے یہ شعر لکھے تھے اگر شارح صاحب عجلت نہ فرماتے اور مقطع کو پڑھ لیتے تو
شاید بصیرت ہو جاتی۔

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا — وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

شرح طباطبائی۔ "دکھو ادائے شکر کا ایک پہلو یہ بھی ہے"

میرزا غالب۔ "اس مقطع کو طباطبائی صاحب نے نعت شریف میں منتقل فرمانے کی کوشش نہیں فرمائی۔ افسوس یہ ہے کہ شارحین خود دل و دماغ سے کام نہیں لیتے اور میرے سادہ شعروں کو بھی معمہ سمجھتے ہیں۔ میں ان سب حضرات سے بیزار ہوں جو اپنے ذہن کی کند چھری سے میرے شعروں کو ذبح کرتے ہیں۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ موٹر لاری کے ہارن نے میرے بالاخانہ کے نیچے آدمیوں کو سڑک پر سے ہٹانے کے لیے شور مچایا۔ دفعتًا میں خیالی دنیا سے مادی دنیا میں آگیا اور میرے خیالات کا دلچسپ سلسلہ ختم ہوگیا۔ اسوقت میں ناظرین کی ضیافت طبع کے واسطے صرف اس سرگزشت کو حوالۂ قلم کرتا ہوں۔ آیندہ اگر مولانا تمنا صاحب اپنی روش پر قائم رہے اور اسی طرح بزرگان فن پر تنقید فرماتے رہے تو انشاءاللہ میں بھی انکے نقود کو پرکھنے میں اپنی بساط کے موافق پوری کوشش کروں گا۔

خاکسار امیر۔ نقاد بدایونی

ترے جلووں کو دیکھیں اور مرے دل کی تڑپ دیکھیں
کہاں ہیں انفعال موج و ساحل دیکھنے والے

ترے کوچہ میں آکر فخر سمجھے ہیں اسیری کو
زمیں سے آسماں تک وسعت دل دیکھنے والے

مری آتش نوائی کا بھی کچھ اندازہ فرمائیں
اسی محفل میں ہونگے نبض محفل دیکھنے والے!

شہیدان محبت سے لڑا آنکھیں نہ لے ناصح
یہی وہ ہیں جنھیں کہتے ہیں قاتل دیکھنے والے

ادھر آ ہر قدم پر حسن منزل تجھکو دکھلادوں
فلک کو یاس سے منزل بہ منزل دیکھنے والے

کمال بے حسیٔ شوق پر بھی اک نظر ڈالیں
مری ہر سانس میں اک محشر دل دیکھنے والے

کسی اک نقطۂ موہوم ہی کی شرح تو کر دیں
کتاب عشق کے گہرے مسائل دیکھنے والے

حقیقت ہیں نظر میں ہر تجلی اک حقیقت ہے
وہ خود باطل ہیں جو ہیں نقش باطل دیکھنے والے

زمین و آسماں کیا ہیں، مکان و لامکاں کیسے
سما جا تو بھی او گنجائش دل دیکھنے والے

مجھے آغوش طوفاں ہی میں جگر آغوش مادر ہے
وہ کوئی اور ہونگے امن ساحل دیکھنے والے

جگر۔ مرادآبادی

یادگارِ حسرت

رسالۂ "ادب" بابت جولائی ۱۹۳۰ء میں بعنوان "اُردو کی دو کمیاب کتابیں" پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب ایم اے نے اُردو کتابوں کی حفاظت کے متعلق نہایت قابلِ قدر خیال کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"ہی خواہانِ اُردو کو کم سے کم یہی کرنا چاہیے کہ جہاں کہیں اُردو کی کوئی کمیاب کتاب نظر آ جائے وہ اُسکے متعلق ضروری اطلاعات اور اسکے کافی اقتباسات کسی ادبی رسالہ میں شایع کر دیں۔ اس طرح اگر وہ کتابیں محفوظ نہ رہ سکیں تو بھی اتنا تو معلوم ہی رہیگا کہ کون لوگ اُردو کی خدمت کر چکے ہیں اور کس طرح کی کتابیں اس زبان میں لکھی جا چکی ہیں۔"

پروفیسر ادیب کا یہ خیال ہر ہی خواہِ ادب کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے اور ضرورت ہے کہ حتی الامکان اس پر عمل کیا جائے۔ اسی خیال کو مدنظر رکھکر آج کی صحبت میں میں بھی ایک نایاب یا بہرحال کمیاب کتاب کے متعلق چند سطور نذرِ قارئین کرام کرنا چاہتا ہوں یہ کتاب مرزا جعفر علی حسرت کا دیوان ہے۔

مرزا حسرت کے والد کا نام ابو الخیر اور پیشہ عطاری تھا۔ ابتدا میں مرزا نے بھی یہی پیشہ اختیار کیا تھا۔ آپ کا مولد دہلی اور مدفن لکھنؤ ہے۔ اولاً حسرت حضرت شاہ عالم ثانی آفتاب کے دامنِ دولت سے وابستہ رہے، لیکن جب زمانہ نے ورق پلٹا، وہ مجلسیں باقی نہ رہیں اور کورنمک غلام قادر نے آفتاب کی آنکھوں کی روشنی چھین لی، تو حسرت کو بھی ناچار دہلی چھوڑنا پڑا اس سانحہ کے متعلق حسرت نے ایک دردناک نظم لکھی ہے۔ دہلی چھوڑ کر مرزا فیض آباد آئے اور نواب کے حضور میں ایک قصیدہ نذر گزرانا۔ بعدہ جب آصف الدولہ سریر آرائے ریاست ہوئے تو حسرت نے انکی خدمت میں بھی ایک قصیدہ پیش کیا۔ جس زمانہ میں میر حسن اپنا تذکرہ لکھ رہے تھے۔ حسرت مرزا حسن علی خاں بہادر کی سرکار میں بوسیلۂ شاعری سرفراز تھے۔ اسکے بعد صاحب عالم جہاندار شاہ کے ملازم ہو گئے۔ مرزا سلیمان شکوہ بہادر بھی پرورش فرماتے تھے۔ حسرت نے اصلاحِ سخن رائے سرب سنگھ دیوانہ سے لی تھی۔ لیکن آخر میں بقول میر حسن اُن سے منحرف ہو گئے تھے۔ فارسی سے بھی ذوق تھا اور اس میں مرزا فاخر مکین سے مشورہ کرتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ حسرت نے اپنے زمانہ میں کافی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی۔

یہاں تک کہ انکے ہمعصر شعرا اُن سے رشک کرنے لگے تھے - مرزا رفیع سوداؔ نے انکی ہجو لکھ ماری جسمیں
انکے پیشۂ عطاری کا خاکہ اُڑایا - سید انشاؔ نے "دریاے لطافت" میں اپنے زمانہ کے ایک بڈھے
میر صاحب اور ایک کسبی کا فرضی مکالمہ لکھا ہے اُسکے دوران میں اُنھوں نے اپنے ہمعصر ممتاز شعرا کا
مذاق اُڑایا ہے یہاں تک کہ خود اپنی ذات کو بھی نہیں چھوڑا ہے - مرزا حسرت کا بھی ذکر اس میں
موجود ہے اور انکے پیشہ پر تعریض کی گئی ہے - حسرت کے تلامذہ بڑی کثرت سے تھے - میر حسن
لکھتے ہیں "کثرت شاگردانش چناں کہ در صورت شناسی ہم حیران ست" - انکے لیے یہ فخر کچھ کم نہیں
ہے کہ انکے دامن فیض سے جرأت ایسا صاحب کمال نکلا - جس کا سکہ مدتوں بازارِ سخن میں رائج
رہا اور آج بھی ٹکسال باہر نہیں - حسرت کا اندازِ بیان سیدھا اور زبان صاف ہے - الفاظ کی موزونی ترکیبوں
کی چستگی اور نئی انجلیہ سوز و گداز نے انکے کلام کو میر سے قریب تر کر دیا ہے - کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رنگ
جو جرأت کے یہاں جاکر چمک گیا اصل میں حسرت سے شروع ہوا تھا - انکے یہاں سیدھی سادی عاشقانہ شاعری ہے جو ہرگز نمک سے خالی نہیں
شمس العلما آزاد نے "آبحیات" میں حسرت کی محنت پر پانی پھیرنے کی کوشش کی ہے وہ انکے
پیشہ سے ناراض معلوم ہوتے ہیں - تین سطروں میں حاشیہ پر ان کا ذکر کیا ہے اور وہ بھی اس انداز سے

"حسرت بھی نامی شاعر تھے - مگر اصلی پیشہ عطاری تھا - دیوان موجود ہے - پھیکے شربت کا
مزہ آتا ہے"

حکیم عبد الحی اور لالہ سری رام دونوں نے اس کی تردید کی ہے اگرچہ صاحب خمخانہ جاوید نے دبی زبان
سے مولانا آزاد کی رائے کی توضیح کرنے کی کوشش کی ہے - فرماتے ہیں -

"راقم الحروف (لالہ سری رام) کے نزدیک مولانا (آزاد) کا یہ قول قابل تسلیم نہیں ہے
غالباً انکی نظر سے صرف ان کا دیوانِ دوم گزرا ہے اور اسی پر اُنھوں نے مذکور الصدر
رائے قائم کی ہے جو ایک حد تک صحیح ہے - اگر پورا کلیات اُنکے سامنے ہوتا تو یقیناً وہ حسرت
کے لیے اس سے بہتر رائے قائم کرتے کیونکہ فی الواقع ان میں اکثر جگہ بہت کچھ نمکینی اور چاشنی موجود
ہے - یہ امر مسلم ہے کہ کسی عمدہ سے عمدہ کہنے والے کا بھی تمام کلام یک رنگ ہونا بہت مشکل بلکہ
ناممکن ہے"

حسرت کے معاصرین میں مصحفیؔ کی رائے ہے -- "در قصیدہ و غزل ید طولیٰ دارد" میر حسن انکی تعریف میں
رطب اللسان ہیں - خود اُن ہی کی زبان سے سن لیجیے :-

"طبعش از چمن خوبی بشکل طوبیٰ برخاستہ و دُرجِ فطرتش رشتۂ سخندانی از جواہر معانی آراستہ"

شربت عذب بیانش، اقوام عالی ...... جولانی طبعش از حد گزشتہ قصیدہ با در زمین مشکل
گفتہ۔ مگر ہرکس بقدر ہمت اوست .... غرض مثل او پیدا نیست۔ خدایش سلامت دارد"

لالہ سری رام کا خیال مولانا آزاد کی نسبت درست معلوم ہوتا ہے۔ اسی سلسلہ میں شاید یہ بات دلچسپی سے پڑھی جائے کہ مولانا آزاد نے "آبحیات" کے صفحہ ۲۴۲ پر یہ مطلع

بے کس کا جگر جیسے یہ بیداد کرو گے　　وہ ہم تمھیں دل دیتے ہیں کیا یاد کرو گے

جرأت سے منسوب کیا ہے۔ حکیم عبدالحی اسکو "گل رعنا" کے ص ۲۱۸ اور لالہ سری رام "خمخانہ جاوید" جلد دوم ص ۲۱۴ پر مرزا حسرت سے منسوب کرتے ہیں۔ میر حسن بھی اس مطلع کو حسرت کا بتاتے ہیں۔ اس بات سے لالہ سری رام کے شبہ کو تقویت ہوتی ہے کہ غالباً آزاد کی نظر سے حسرت کا ایک دیوان نہیں گزرا۔ میر حسن کے ذوق سخن میں کلام نہیں ہو سکتا۔ مشہور ہے کہ انھوں نے میر تقی کے اشعار کا انتخاب خود میر صاحب سے بہتر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسرت کا پایہ اردو شاعری میں کچھ کم نہیں۔ انکی یادگار ایک کلیات ہے جس میں دیگر اصناف سخن کے علاوہ دو دیوان غزلوں کے ہیں۔ غزل گوئی میں انکا خاص انداز یہ ہے کہ اکثر مسلسل مضمون لکھتے ہیں اور بالعموم غزل کو قطعہ پر ختم کرتے ہیں۔

حسرت نے ۱۲۱۷ھ ہجری میں وفات پائی اور لکھنؤ میں دفن ہوئے۔

حسرت کی کلیات شائع ہوئی یا نہیں، میں یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا۔ لیکن غالباً اسکی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ کچھ عرصہ ہوا مولٰنا حسرت موہانی نے انکے کلام کا ایک انتخاب البتہ شائع کر دیا ہے۔ زیر نظر نسخہ میرے ایک ہندو بزرگ کی ملکیت ہے۔ یہ قلمی ہے اور بخط نسخ لکھا گیا ہے۔ اسکو بصورت مجموعی خوشخط کہا جا سکتا ہے۔ تقطیع معمولی کتابی ہے۔ یہ نسخہ کس نے لکھا، کب لکھا، اور کیوں لکھا، اسکے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اسکے شروع میں یا آخر میں یا بیچ میں کہیں کوئی عبارت اس قسم کی نہیں ہے جس سے اس راز کا انکشاف ہو سکے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ حسرت کی کلیات کا مسودہ ہے جسکا کچھ حصہ دست برد زمانہ سے کسی کے ہاتھ آگیا اور اس نے اسکی جلد بندھوالی جو نہایت معمولی ہے اور زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس برس کی پرانی معلوم ہوتی ہے۔ یہ کہیں نہیں لکھا کہ مرزا جعفر علی حسرت کی تصنیف ہے۔ البتہ رباعیات کے آخر میں ایک چھوٹی سی مہر بخط طغرا ثبت ہے۔ جسکی عبارت صاف پڑھی نہیں جاتی۔ لیکن اس میں ۱۱۹۳ھ صاف ہے۔ مرزا جعفر علی حسرت کا انتقال اس سے محض چھبیس سال قبل ۱۲۱۷ھ ہجری میں ہوا ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ حسرت مرزا جعفر علی ہی ہیں۔ علاوہ ازیں مرزا کے جو اشعار حکیم عبدالحی اور لالہ سری رام نے منتخب کیے ہیں

ان میں کے اکثر اشعار اس نسخہ میں پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ بہت ایسے بھی ہیں جو اس میں نہیں ملتے۔ بہرحال اس میں شبہہ نہیں رہتا کہ یہ نسخہ مرزا جعفر علی حسرت کی تصنیف ہے۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ انکا دیوان اول ہے یا دوم۔ کاغذ دبیز ہے اور کافی پرانا معلوم ہوتا ہے۔ اسکی کتابت ۱۲۴۳ھ ہجری کے لگ بھگ ہوئی ہے۔ بدیں وجہ اسکو معتبر بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ طرز انشا وہی پرانا ہے نگات کا ایک مرکز ہے، یائے معروف اور یائے مجہول میں کوئی فرق ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ "وہ" کا املا اکثر "وو" رکھا ہے۔ ٹ، ڈ، ڑ، وغیرہ پر بجائے "ط" کے نقطوں سے کام لیا گیا ہے۔ "مجھ" اور "تجھ" کو "مج" اور "تج" لکھا ہے اور بعض ایسے الفاظ کو ملا کر لکھا گیا ہے جنکا ملانا آجکل درست سمجھا جاتا ہے مثلاً "ایک تار" کو "ایکتار"، "کوچہ میں" کو "کوچیمیں" اور "لے گل" کو "لگل" وغیرہ۔ معلوم ہوتا ہے اس نسخہ کی کتابت میں کافی کد و کاوش کی گئی ہے۔ جدول مطلا ہے۔ مقطعوں میں تخلص سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ اکثر مقامات پر حاشیہ پر بھی اشعار لکھے گئے ہیں لیکن جدید جلد ساز نے کچھ اس طرح چھری تیز کی ہے کہ اب حاشیہ کا کوئی شعر نہیں پڑھا جاتا۔ جا بجا سے کیڑا کھا گیا ہے۔ اور اکثر حروف پڑھنے میں نہیں آتے۔ جس کی وجہ سے بعض شعر بیکار ہوگئے ہیں۔

اس نسخہ کے شروع میں ایک دیوان غزلوں کا ہے جسکے بعد ایک صفحہ چھوڑ کر کچھ رباعیات ہیں اور پھر تین صفحات خالی چھوڑ کر ایک مثنوی طوطی نامہ ہے۔ صفحات پر نمبر درج نہیں ہیں لیکن غزلیں ۲۲۲ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ آٹھ صفحات میں رباعیات ہیں اور ۱۹۲ صفحات پر طوطی نامہ ہے۔ ۲۸۲ غزلیں ہیں جنکے اشعار کی تعداد ۲۵۴۳ ہے۔ غزلوں کے آخر میں ایک مستزاد سات شعروں کا ہے۔ رباعیاں ۳۳ ہیں اور طوطی نامہ ۲۴۵۸ اشعار میں سمایا ہے۔ غزلوں کی کتابت میں اکثر غلطیاں ہوگئی ہیں جنھیں کہیں کہیں متن میں اور اکثر حاشیہ پر درست کیا گیا ہے بعض مقامات ایسے بھی ہیں جن میں بعض حروف کی جگہ جو غالباً کاتب کی سمجھ میں نہیں آئے خالی چھوڑ دی گئی ہے۔ تخلص عام طور سے سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے لیکن بعض بعض جگہ غالباً کاتب کی غلطی سے سیاہی میں بھی ہے۔ اکثر مقامات پر تخلص کی جگہ خالی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نے غزلیات کو ختم کرنے کے بعد سرخی سے تخلص کو لکھا ہے، لکھتے وقت بعض غزلیات نظر سے اتر گئیں اور تخلص لکھنا رہ گیا۔

طوطی نامہ ایک عاشقانہ مثنوی ہے۔ جسکی تصنیف کی تقریب یوں ہے :-

اب نئی اور داستاں کہیے　　　دو میں سب بیٹھ کر جہاں سے کہیے

ہوے پچھلے تو قصے افسانے — تازہ کچھ کیسے تو کوئی جانے
روئیے اور رلائیے سب کو — جو سنا ہے سنائیے سب کو

اس کا آغاز بارگاہِ ایزدی میں تخلیقِ عشق کی شکایت سے ہوتا ہے۔ نعت اور منقبت میں بھی غرض ہی عشق کا ذکر ہے۔ اسکے بعد اصل داستان شروع ہوتی ہے۔ طوطی نامہ کچھ عجیب سا نام معلوم ہوگا۔ اسکی معذرت حسرت یوں کرتے ہیں

کچھ یہ افسانہ کا نہیں ہے نام — کہتے ہیں ہندوؤں میں طوطی رام

دراصل اس داستان کے تمام کیرکٹر ہندو ہیں۔ مثنوی سیدھی سادھی زبان میں لکھی گئی ہے۔ آورد یا شاعری کو کار نہیں فرمایا گیا ہے۔ اس کا خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے:-

سچ ہے جو کوئی کھینچے ہے محنت — اس کو ملتی ہے آخر اک راحت
میں بھی کھینچی ہے محنت اے حسرت — کہنے میں شعر کتنی کر محنت
داستاں کے تئیں کیا موزوں — خوب اس میں جگر کیا ہے خوں
شاعری اس میں گرچہ میں نہیں کی — کہ نہیں لگتی اب کسی کو بھلی
سہل سے شعر اس زمانے میں — آتے ہیں سننے اور سنانے میں
میں بھی سمجھا اسی میں خوش ہے دیس — ہے مثل جیسا دیس ویسا بھیس
کیا اس بولی میں یہ قصہ تمام — اور رکھا اس کا طوطی نامہ نام
حق سے امید ہے کہ ہو مقبول — گو یہ معقول ہے کہ نا معقول
ہر کہ خواند دعا طمع دارم — زانکہ من بندۂ گنہگارم

اس تحریر کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ممکن ہے کوئی صاحبِ ذوق اس نسخہ کی اشاعت پر آمادہ ہو جائیں۔ میرے خیال میں ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دیوان کا انتخاب کسی ادبی رسالہ میں بطور ضمیمہ شائع ہو۔ بعد کو ایک مقدمہ کے ساتھ اسکو کتابی صورت دیدی جائے۔

آخر میں ہم نسخۂ زیرِ نظر سے ایک غزل، ایک مستزاد اور چند رباعیاں نقل کر کے مضمون ختم کرتے ہیں:-

غزل

اس رات میں سو صبح قیامت نظر آئی — اے وعدہ فراموش [illegible]
بیماری کہو، نزع کہو، مرگ کہو تم — جو کچھ کہو القصہ سو سب درد [illegible]

آنا تھا تجھکو تو نہ آیا پہ نہ آیا — میں لاکھ بہانے کیے سو بات بنائی
جی دم کا ہے دم آنکھوں میں آنکھوں میں بھرے اشک — وہ کونسی ساعت تھی جو میں لاگ لگائی
جی راہ میں، دل کوچہ میں، آنکھیں لگیں در پر — کس تفرقہ میں ہوں مجھے دے آکے رہائی
مائل ترا دل، دل کا تو قاتل میں ہوں لاچار — جس سے کہ بھلائی کروں ہوتی ہے برائی
دامن ترا ہاتھ اور رکے ہاتھ اور یہ گریباں — یہ بخت کی خوبی ہے وہ طالع کی رسائی
نم چشم میں، غم سینہ میں، دم لب میں، اے وائے — بسمل ہوں میں، غافل ہے تو اللہ خدائی
طاقت گئی اور تاب چلی، صبر کا ہے کوچ — اے شوخ ٹھہر آ تجھکو محبت کی دہائی
فریاد کروں، نالہ کروں، آہ کروں، آہ! — کیا فائدہ اے آہ کہ کچھ داد نہ پائی
ارمان مرے دل کا صد ارمان نہ نکلا۔ — افسوس کہ حسرت ہی میں سب عمر گنوائی

مستزاد

مجنوں ہوے تیرے لیے جنگل میں پھر آئے — وحشی ہو جنوں کے
فرہاد ہوئے سر پہ پہاڑ اپنے اٹھائے — احوالِ زبوں سے
سو ٹکڑے کیے جیب گریبان کے اپنے — اک تار نہ رکھا
تیشے بھی کئی بار اٹھا سر پہ لگائے — زخمیں ہوے خوں سے
تجھکو نہ کسی کوہ و بیابان میں دیکھا — اے ترکِ قمر آہ
تیرے لیے ہر روز نئے سانگ بنائے — سو مکر و فسوں سے
جوگی ہوے در در پھرے دیدار کی خاطر — کی ہم نے گدائی
پائی نہ کبھی بھیک الم سیکڑوں پائے — اس طالعِ دوں سے
اول ہی قدم عشق میں ٹھوکر لگی یارو — اٹھو اٹھے گرے ہم
جیسے گئے تھے ویسے ہی محروم پھر آئے — نکلے تھے شگوں سے
دلسوزی سے پوچھا نہ کبھی یار نے آکر — کیا حال ہے تیرا
جل شمع جلے داغ ہوئے [illegible] — اس سوزِ دروں سے
حسرت تو بیابانِ محبت میں بھٹکے گا — یاں گرم ہوا ہے
کتنوں نے یہاں اپنے کلیجے ہیں جلائے — اس دشت کی لوں سے

رباعیات

(۱) یہ رنج و الم کب تھے گوارا مجھکو — مجبور ہے یاں نہیں ہے چارا مجھکو
ہستی ہوتی نہ مرگ ہوتی در پے — افسوس کہ زندگی نے مارا مجھکو

(۲) غیروں کی ہمیں چاہ جتانے آئے — پھر دل جلوں کو اور جلانے آئے
جاؤ جی تم اس آنے سے آیا نہ کرو — کیوں بیٹھے بٹھاؤں کو رلانے آئے

(۳) دیکھی ہی آنکھ جا حیا کو سونپا — دل سخت نہ کیجیو وفا کو سونپا
رخصت کا زباں پہ نہیں لا سکتا حرف — جاتا ہے تو جا تجھ کو خدا کو سونپا

محمد اظہار الحسن بی اے ایل ایل بی (علیگ) وکیل غازیپور

عہد فاروقی کا ایک واقعہ

وظیفۂ اطفال

اک قافلہ مدینہ کے باہر تھا خیمہ زن — اور دشت بے پناہ میں پھیلا ہوا تھا مال
تھے جملہ اہل قافلہ بے یار و غمگسار — لٹ جانے کا تھا اُنکے سرراہ احتمال
جب حضرت عمرؓ کو ملی اس کی اطلاع — کرنے گئے وہ قافلے کی آپ دیکھ بھال
گو اہل قافلہ سے وہ واقف نہ تھے مگر — ہر دم تھا اُنکی راحت و آرام کا خیال
اس پاسباں نے آکے یہ دیکھا کہ اک طرف — روتا ہے بار بار کوئی طفل خورد سال
ظاہر ہوئے نگاہ سے آثار انتشار — آوازِ گریہ سُن کے طبیعت ہوئی نڈھال
پروانہ وار گھومتا پھرتا تھا ہر طرف — مقصد کی شمع کا نظر آتا نہ تھا جمال
دیکھا کہ ماں کی گود میں ہے طفل شیرخوار — کرتا ہے چشم اس سے جو دودھ کا سوال
بے رحم ماں مگر اُسے دیتی نہیں ہے دودھ — بچے کا روتے روتے بُرا ہو گیا ہے حال
بچے کی ماں سے حضرت فاروق نے کہا — یہ ظلم ناروا ہے کہ بچہ ہے خورد سال
اس بے زباں کو دودھ پلاتی نہیں ہے کیوں — سوچا نہیں ہے تا لگا اس جور کا مآل
ایسا نہ ہو کہیں کہ یہ مل جائے خاک میں — زینت ترے چمن کی ہے ناداں یہ نونہال
سنتی رہی خموش وہ پہلے تو یہ کلام — عورت تھی آخر آ ہی گیا اس کو اشتعال
کہنے لگی کہ جا تجھے معلوم ہی نہیں — پُر شیرخوار بچے ہیں ماں کے لیے وبال
احکام یہ خلیفہ کے نافذ ہوئے ہیں اب — ہو طفل کا وظیفہ نہ اُس وقت تک بحال
جب تک کہ دودھ ماں کا وہ اپنی نہ چھوڑ دے — خواہ اُسکے والدین کا غربت سے کچھ ہو حال
بہر وظیفہ دودھ چھٹاتی ہوں کیا کروں — اس بے زباں کا تجھ سے نہیں کم مجھے خیال
عورت کو کیا خبر تھی خلیفہ ہے وقت کا — تقریر اس کی سُنکے جو ہے غرق انفعال
جو سوچتا ہے ہونگے بہت ایسے شیرخوار — جنکا مرے سبب سے ہوا ہوگا انتقال

آتے ہی اپنے حکم کو منسوخ کر دیا
پھر بھی عمرؓ کو اسکا رہا مدتوں ملال

(محمود - اسرائیلی)

خلافِ رائے شیطاں نہ لے جستن   بجونِ خویش باید دست شستن

رائے شیطاں

چلے جاؤ اگر نیویارک و لندن   میسر ہوں وہاں درشن پہ درشن
مگر یہ شرط ہے مل جاؤ اُن میں   بدل ڈالو یہاں کا سارا فیشن
مُنڈی داڑھی ہو موچھوں کا صفایا   وہاں کا ہے یہی بس ایک فیشن
ہرا چہ ہوٹلوں میں دیکھو تھیٹر   پھرو کرتے ہوئے تم سیرِ گلشن
پڑھاؤ دوستی اور دو عورتیں دو   کھلاؤ کیک بسکٹ اور مکھن
رہے باقی نہ لذت کوئی اسلا   غذائیں حد سے زیادہ ہوں مرغن
چلے پھر دورِ ساغر اور ہو بدمست   کہ ہے تہذیبِ مغرب کا یہ قدغن

تباتا ہے تمھیں ترکیبیں اختر
بنا لو واں کی دوشیزہ کو دولھن

ملا دو خاک میں جب سارے کو ایش   روانہ ہند کو ہو جاؤ فوراً
یہاں آکر کرو اس پہ عمل تم   کہ جیسا دیس ہو ویسا ہی فیشن
ضرورت ہے یہاں داڑھی ہو لمبی   کہ اس کی آڑ میں ملتا ہے خرمن
گلے گی خوب ہی اس طرح سے دال   ملیں گے مال تازہ اور مرغن
پہننے کی یہاں یہ صورتیں ہیں   لبادہ ڈھیلا ہو اور نیچا دامن

انھیں ترکیبوں سے ہوں گھی میں پانچوں
یہی کہتا ہے اختر اور شیطن

جیو رکھشا
گدھا ایک رینگا تو پنڈت جی بولے   نکلتی ہے سینے سے آہ و بکا
چلا جائے گا سیدھا بیکنٹھ کو یہ   بڑا محنتی اور ہے تپلا دبلا

عشق ہستی کا
سنا کرتے تھے قیس تھا دبلا پتلا   مگر قول کر دیکھو گاندھی ہے کتنا

دم نہیں
اپنی ہستی قیس سے کچھ کم نہیں   ضعف میں گاندھی بھی ہیں پر دم نہیں

"کہ گرچہ غرقِ گناہ ہست می رود بہ بہشت" کی تفسیر جدید
گناہوں سے دامن ہے تر میرا تاہم   میں سوراج لیلوں گا جنت میں جاکر

نظرے خوش گزرے

مہماں سرائے شاہی سے ۳۰ اکتوبر ۳ء کو باہر نکلا، تو خیال تھا کہ دو تین دن وطن (کاکوری) میں قیام کے بعد لکھنؤ واپس آکر سب سے پہلا کام یہی ہے کہ الناظر کا جون نمبر شایع کرکے ششماہی دور کی تکمیل کردی جائے اور اُسی میں آیندہ عزائم کا اعلان ہوجائے۔ مگر "من درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال"۔ ۴ر نومبر کو وطن سے واپسی ہوئی۔ سواری سے اُتر کر گھر کے اندر داخل ہوا تو طبیعت مضمحل تھی۔ تکانِ سفر دور کرنے کی غرض سے لیٹ گیا اور لیٹتے ہی شدید تپ و لرزہ میں مبتلا ہوگیا۔ ایک ہفتہ انتہائی کرب و تکلیف میں گزرا۔ اسکے بعد تپ نے مفارقت کی بھی تو ضعیف اتنا کردیا کہ تقریبًا دو ہفتے تک صاحب فراش رہا اور جب آخر نومبر میں اس قابل ہوا کہ دفتر میں حاضری دوں تو ناتوانی و اضمحلال کے کافی نمایاں اثرات اسوقت بھی موجود تھے۔

انگریزی کی یہ مثل بہت مشہور ہے کہ "مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی" اسی خیال کو انوری نے یوں ظاہر کیا ہے:۔

هر بلائے کز آسماں آید — گرچہ بر دیگراں قضا باشد

بر زمیں نارسیدہ می پرسد — خانۂ انوری کجا باشد

میرا دفتر میں حاضری دینا تھا کہ ایک عشرہ کے اندر اندر جتنے کارکنان دفتر تھے ایک ایک کرکے سب کی خدمات سے میں محروم ہوگیا۔ ایک صاحب مستعفی ہوگئے، دوسرے نے مسہل لینے کی غرض سے رخصت لے لی، تیسرے بے اطلاع بیٹھ رہے، چوتھے لڑکی کا عقد کرنے کے لئے دو ہفتے کے واسطے وطن چلے گئے۔ اور اُس پر طرہ یہ ہوا کہ میرا بڑا لڑکا حافظ محمد داؤد جسکے سلسلۂ تعلیم عربی کو مارچ ۳۶ء میں بخیال خویش عارضی طور پر منقطع کراکے اپنی غیر موجودگی کے زمانہ میں گھر اور دفتر کا ذمہ دار قرار دیا تھا، دفعتًہ بے اطلاع کے کہیں چلا گیا۔ ایک طرف طبیعت کی ناتوانی، دوسری طرف دفتر کے کاموں کا ہجوم اور تیسری طرف یہ خانگی پریشانی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ ہی دس روز میں پھر پلنگ پڑ گیا۔ اسی حالت میں یہ خبر پاکر کہ لڑکا کلکتہ پہونچا، سفر کرنا پڑا۔ خدا خدا کرکے ایک ہفتہ کی تگ و دو کے بعد آخر دسمبر میں اُسے لیکر لکھنؤ واپس آیا اور باوجود خرابی صحت کوشش شروع کی کہ دفتر کے بگڑے ہوئے نظم و نسق کو سنبھالوں اور بعض ضروری کاموں کی تکمیل کروں۔ الناظر کی کتابت بھی شروع کرادی تھی

اور توقع کرتا تھا کہ جنوری میں پرچہ شایع کیا جا سکے گا۔ مگر کاموں کی کثرت اور عملہ کی قلت نے پرچہ کی تکمیل کا موقع نہ دیا۔ یہاں تک کہ ماہ صیام شروع ہوگیا۔ سالہا سال سے یہ ماہ مبارک ایک خاص نظام کے مطابق نہایت سکون و عافیت سے بسر کرنے کا عادی تھا۔ اس دفعہ بھی یہی تمنا رہی لیکن طبیعت پر جو ضعف و اضمحلال طاری تھا اُسکی بدولت اب کی سارا مہینہ نہایت بدمزگی سے گزرا نتیجہ یہ کہ الناظر کا جو کام ماہ صیام سے قبل ہو چکا تھا اُس سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ عید کے بعد ہی الناظر کی طرف پھر متوجہ ہوا تھا کہ دفعتہً میری اہلیہ نے بعض عزیزوں کی معیت میں حج و زیارت کی سعادت حاصل کرنے کا تہیہ کیا اور مجھے اُنکو جہاز پر سوار کرانے کے لیے ایک ہفتہ کے واسطے بمبئی جانا پڑا۔ مارچ کے تیسرے ہفتے میں بمبئی سے واپس آیا اور یہ سوچ کر کہ خانہ داری کے انتظامات اور بچوں کی نگرانی کے نئے فرائض کی بدولت اب چند مہینے خانہ نشین رہونگا اور اس مدت میں نہ صرف الناظر کی اشاعت سے سبکدوشی حاصل ہوگی بلکہ کئی اور ضروری کام بھی جو سکون و فراغت کی ساعت کے انتظار میں عرصہ سے معرض التوا میں تھے انجام پا جائیں گے۔ اور ساتھ ہی ساتھ مجھ کو علاج کرنے کا موقع میسر آسکیگا۔ چنانچہ "علاج بالعناصر" کے طریقہ پر جسکا ذکر آگے آئیگا باقاعدہ علاج بھی شروع کیا گیا اور الناظر و دیگر کارہائے ضروری کی تکمیل کا بھی سرانجام ہونے لگا بمشکل سے ایک ہفتہ کام کرنے کا موقع ملا ہوگا کہ کانپور میں شدید فساد ہوگیا اور مقامی کانگریسی رضاکار کی معیت میں اصلاح حال کی غرض سے وہاں جانا پڑا۔ اسی اثناء میں کراچی میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ رہنمایانِ ملک نے کانپور کے دردناک حالات سے متاثر ہوکر ایک تحقیقاتی کمیٹی اس غرض سے مقرر کی کہ ہنگامہ کانپور کی پوری پوری تفتیش اور جانچ کرکے فساد کے حقیقی اسباب و علل کی تشخیص اور ایسی تدابیر تجویز کرے جو اس قسم کے حادثات کا سدِّ باب کرسکیں۔ اور اس کمیٹی کا ایک رُکن میں بھی بنا دیا گیا نتیجہ یہ ہے کہ اُس وقت سے ۱۵ مئی تک میرا بہت سا وقت کانپور میں گزرا اور بیشتر توجہ اسی کام پر رہی۔ ابھی تک صرف شہادتوں کے قلمبند کرنے، مصیبت زدہ رقبہ جات کی دیکھ بھال، اور کانپور کی فضا کو سابقہ سکون و امن کی حالت پر لانے کا کام انجام پاتا رہا۔ رپورٹ کی تیاری کا کام ہنوز باقی ہے۔ جسکے لیے کم از کم ایک ماہ اور درکار ہوگا۔ مگر امید ہے کہ رپورٹ کے سلسلہ میں بہت سا کام یہیں لکھنؤ میں ہوگا۔ اس وجہ سے شاید الناظر کی اشاعت کا سامان اسی دوران میں ہو جائے۔ کم سے کم اسی توقع پر الناظر کی طباعت اور سطور ہذا کی تحریر کا کام بیک وقت شروع کیا جاتا ہے۔ السعی منّی والاتمام من اللہ۔

"الناظر" کی وجہ سے جو مالی خسارہ گذشتہ بائیس سال کے اندر برداشت کیا گیا اُسکی مجموعی مقدار دس بارہ ہزار روپیہ کے قریب ہوگی۔ تحریک خلافت کے سلسلہ میں دو سال کے قریب اسیر رہنے کے باعث میرے کاروبار کو جو عظیم نقصانات پہونچے اُنکی بنا پر حقیقتاً چاہیے یہ تھا کہ الناظر اُسوقت تک پھر جاری نہ کیا جاتا جب تک کاروباری حالت قابل اطمینان نہ ہوجاتی لیکن دنیا بامید قائم۔ اس توقع پر الناظر دوبارہ جاری کر دیا گیا کہ یکسوئی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے گا تو کاروبار کے ساتھ ساتھ الناظر کو بھی ترقی دی جاسکے گی۔ لیکن گذشتہ آٹھ نو سال کے اندر پے بہ پے ایسے حالات رونما ہوتے رہے اور بن بن کر اتنے کھیل بگڑتے رہے کہ الناظر کو جاری رکھنا قریب قریب نا ممکن ہوگیا۔ بار بار اسکی کوشش کی گئی کہ مجلسی و سیاسی مشاغل سے مخلصی حاصل کرکے یکسوئی کے ساتھ الناظر اور کاروبار کتب پر توجہ کی جائے لیکن جب کبھی ان کوششوں کے بار آور ہونے کے آثار نمودار ہوئے کچھ عجیب اتفاق ہے کہ عین اُسی زمانہ میں کوئی نہ کوئی سبب ایسا درپیش آگیا جس نے ساری توجہ کو ہٹا کر کچھ دنوں کے لیے اپنی طرف پھیر لیا اور تھوڑی مدت قبل کافی محنت و جان فشانی کے بعد جو نظم قائم ہوا تھا وہ کلیتہً درہم و برہم ہوگیا۔ اور معاملات کی صورت بد سے بدتر ہوتی گئی۔

۱۹۲۹ء کے جولائی نمبر میں (جو غالباً اگست یا ستمبر میں شایع ہوا تھا) عرض کیا گیا تھا کہ الناظر اور کاروبار متعلقہ کو ترقی دینے کے خیال سے پریس کے لیے مشین کی خریداری کی فکر ہے اور اب مجلسی کاموں کو چھوڑ کر ہمہ تن اس کاروبار ہی کی خدمت میں کچھ مدت تک مصروف رہنا چاہتا ہوں۔ یہ کوئی رسمی بیان نہ تھا، بلکہ اُسوقت سپرد قلم کیا گیا تھا جبکہ مسلم لیگ، خلافت کمیٹی اور کانگریس سب کی رکنیت سے مستعفی ہوکر کامل بے تعلقی حاصل کر چکا تھا اور کچھ عرصہ تک اپنے کاموں میں اس انہماک سے مصروف رہا کہ روزانہ اخبارات کا باقاعدہ مطالعہ بھی نہیں کر پاتا تھا۔ چنانچہ لاہور میں کانگریس نے اپنے قدیم دیرینہ نصب العین کو جس اہم تجویز کے ذریعہ سے بدلا میں بروقت اُسکے مطالعہ سے بھی محروم رہا ——— حالانکہ بحیثیت اسکے کامل آزادی کو علی الاعلان قومی مطمح نظر بنانے اور ملک کے اندر اس تحریک کی باقاعدہ اشاعت کرنے کے متعلق شاید سب سے پہلی آواز بلند کرنے کا افتخار الناظر ہی کو حاصل ہوا ——— اس تجویز سے مجھے صد درجہ دلچسپی ہونا چاہیے تھی۔

۲۶ر جنوری ۱۹۳۰ء کو جب سارے ملک میں آزادی کا اعلان کیا جانے والا تھا تو مقامی کانگریس کمیٹی کے زیر اہتمام جو عظیم الشان جلسہ عام لکھنؤ میں منعقد ہوا، خواہش کی گئی کہ میں اسکی صدارت کروں اور باوجودیکہ مجھے جتایا گیا اور مجھ سے اعتراف کرایا گیا کہ اپنے عقائد و اعمال سیاسی کے لحاظ سے

اس خدمت کے لیے میں خاص طور پر موزوں ہوں اور کارکنان کانگریس کو دوسرے مناسب شخص کی فراہمی میں جو دشواریاں ہیں، اُن سے بھی مجھے آگاہ کیا گیا۔ لیکن میں اپنی خانہ نشینی اور مجلسی کاموں سے بے تعلقی کے عہد پر قائم رہا۔ اور پیہم اصرار پر بھی آمادۂ کار نہ ہوا۔

مگر جب "ینگ انڈیا" کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ مہاتما گاندھی واقعۃً آزادی کی جنگ چھیڑنے والے ہیں، تو میں سخت کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ ایک مہینہ کامل عین اُس زمانہ میں جبکہ دن اور رات کا بیشتر حصہ یکسوئی کے ساتھ نماز اور تلاوت قرآن میں گزرنا چاہیے تھا، اس بارے میں غور کرتا رہا کہ مجھے اس لڑائی میں شریک ہونا چاہیئے یا نہیں۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ تراویح نہیں پڑھی یا تلاوت قرآن نہیں کی۔ بظاہر معمول کے مطابق وہ سب کچھ کیا گیا جو ماہ صیام کے اندر ہر سال ہوتا تھا مگر جنگ میں شرکت کا مسئلہ دل و دماغ پر اس بُری طرح مسلط تھا کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کسی ایک وقت کی نماز بھی ٹھیک طور سے ادا ہوئی یا تلاوت جو کی گئی، اُس سے قلب کا تو کیا ذکر کام و دہن بھی کچھ لذت اندوز ہوئے؟

ایک طرف ذاتی اور خانگی مجبوریوں، اہل وعیال کی ذمہ داریوں، الناظر اور کاروبار کی ابتری اور مالی زیر باریوں کا تقاضا تھا کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں مگر میں آیندہ چند سالوں تک مجلسی و سیاسی کاموں سے کوئی سروکار نہ رکھوں۔

دوسری طرف جسم کا رویاں رویاں جنگ آزادی میں کود پڑنے کے لیے بیقرار تھا اور اُن تمام مصلحت آشنائیوں اور عاقبت بینیوں کی دھجیاں اُڑا ڈالنا چاہتا تھا۔ جو طرح طرح کی دلیلوں سے مانع کار ہو رہی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ مسلمانوں کو اس تحریک سے جس طرح علیحدہ رکھنے کی کوششیں ہو رہی تھیں اور طبقۂ احرار کے بعض ممتاز رہنماؤں نے جو روِیّہ اختیار کر رکھا تھا اُسکی بنا پر ذاتی جذبات و خیالات سے اگر قطع نظر بھی کیجا سکتی تو اپنی قوم کو رسوائی سے بچانے کے لیے اس فرض کفایہ کی ادائی ضروری نظر آتی تھی۔ یہ ذہنی کشمکش اور خیالات کی جنگ تقریبًا چار ہفتے جاری رہی۔ بالآخر ماہ صیام کے آخری دنوں میں جبکہ دو تین دن کے لیے خانۂ خدا کے ایک گوشہ میں عافیت و سکون نصیب ہوا، اس نزاع کا قطعی فیصلہ ہو گیا اور طے پا گیا کہ جنگ آزادی میں مجھے شریک ہونا چاہیے۔

خیال تھا کہ اس فیصلہ کے نفاذ کے بعد بھی اتنی مہلت حاصل رہے گی کہ الناظر کی ششماہی جلد کی تکمیل ہو جائے اور اُسی وقت الناظر کے مستقبل سے متعلق بیش نظر اعلان کر دیا جائے۔ مگر حالات میں کچھ ایسی سرعت سے تبدیلیاں ہوئیں کہ امید پوری نہ ہوئی۔ اور آج تقریبًا ایک سال کی غیر حاضری کے بعد الناظر کا یہ آخری پرچہ پیش کیا جا رہا ہے۔

الناظر کو بند کرنے کا اعلان کچھ آسان بات نہ تھی - برسوں سے اس قسم کے منصوبے بنتے رہے اور ہر دفعہ ہمت نے جواب دیدیا - لیکن مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ جس مہم کو سر کرنے سے ہمت قاصر رہتی تھی اب پست ہمتی کی بدولت وہ کام سرانجام پا رہا ہے -

کشتیِ بے ناخدائیم سرگذشت من مپرس — از شکست خویش بر دریا کنار افتادہ ام

الناظر نے اپنی اکیس سال کی عمر میں ملک و قوم کی کوئی خدمت انجام دی یا نہیں؟ اسکے متعلق کچھ عرض کرنا بے محل ہوگا - یہ حق دوسروں کا ہے - وہی اس بارے میں صحیح رائے قائم کرسکتے اور سچا فیصلہ دے سکتے ہیں -

مجھے اپنے علم و فضل کا دعوی نہیں، ادیب و انشا پرداز ہونے کا غرہ نہیں، سخن فہمی و سخن گوئی کا ادعا نہیں، جو کبھی بھولے سے بھی یہ خیال پیدا ہوتا کہ میرے قلم سے ادب اردو میں کسی قسم کا اضافہ ہوسکیگا - جب الناظر جاری کیا گیا ہے تو ممکن ہے کہ جوانی کی ترنگوں میں اس قسم کے خیالات پیدا ہوئے ہوں - مگر عرصہ ہوا کہ وہ دور ختم ہوچکا اور اسکے ساتھ ہی اسکی سب اگر نہیں تو بیشتر خود فراموشیاں بھی رخصت ہوگئیں - البتہ میری یہ کوشش ضرور رہی کہ انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کے دلوں میں ادب اردو کا ذوق پیدا کیا جائے انھیں اپنی مادری زبان کی خدمت کا شوق دلایا جائے اور اسطرح اردو کو جدید علوم و فنون کا سرمایہ دار بنایا جائے - اور اپنی نااہلیتوں کے واقعی احساس کے باوجود میں بے تامل یہ عرض کرنے کی جسارت کرسکتا ہوں کہ یہ مرکزی نقطۂ خیال کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی نظر انداز نہیں ہونے دیا گیا -

الناظر ہی کے سلسلہ میں پہلے مطبع قائم کیا گیا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد کتابوں کی ایجنسی معرض وجود میں آئی اور تا حد امکان کوشش کی گئی کہ ان دونوں ذریعوں سے بھی پیش نظر مقصد کے حصول میں امداد لے - چنانچہ گذشتہ بیس سال کے اندر علاوہ تاجرانہ کاموں کے جن کی کوئی ذمہ داری بلاواسطہ مجھ پر نہیں پریس نے دو درجن کے قریب ایسی جدید کتابیں شایع کیں جو ادب اردو میں کسی نہ کسی حیثیت سے [illegible] قرار پاسکتی ہیں - اور ان میں سے بعض تو نہایت ممتاز درجہ رکھتی ہیں -

الناظر ایجنسی نے بھی گذشتہ پندرہ سولہ سال کے اندر، بلا لحاظ اسکے کہ تاجرانہ مفاد اور مالی مفاد پر اس طریق کاروبار کا کیا اثر پڑیگا، اپنی بساط بھر اسکی کوشش کی کہ اردو کی بہترین کتابوں کو اہل ملک سے روشناس کرائے اور لوگوں میں اعلیٰ درجہ کی تصانیف کے مطالعہ کا ذوق پیدا کرے -

ان تمام کوششوں میں مجھے کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی، اسکا اندازہ کرنا بھی دوسروں کا کام ہے -

میرا کام تو صرف سعی کرنا تھا اور الحمد للہ کہ آج جب میں ادبی دنیا سے خدا معلوم کتنی مدت کے لیے رخصت ہو رہا ہوں تو میرا ضمیر اس بارے میں بالکل مطمئن ہے کہ الناظر اور اسکے متعلقہ کارخانجات کی خدمات خواہ کتنی ہی حقیر اور ناقابل ذکر ہوں لیکن جہاں تک کہ فکر و سعی کا تعلق تھا میں نے اس میں کوتاہی نہیں کی۔ اور گذشتہ بیس سال کے اندر ضروری خانگی مشاغل اور دیگر مصروفیتوں سے جو وقت بھی بچایا جا سکا وہ اسی ایک غرض و غایت کے لیے وقف رہا۔

خدا کا شکر ہے کہ اب حالات بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ اُردو کی ترقی و توسیع کے کام سے جدید تعلیم یافتہ اصحاب کو کافی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ ملک کے گوشہ گوشہ میں اُردو کی خدمت کرنیوالے پیدا ہو گئے ہیں۔ اچھے اچھے رسالے اور اخبار شایع ہو رہے ہیں۔ عمدہ عمدہ کتابوں کی اشاعت ہو رہی ہے۔ جگہ جگہ اُردو کے کتبخانے قائم ہو گئے ہیں۔ بڑے بڑے سرمایہ کے مطابع اور کتاب گھر جاری ہو چکے ہیں اور سب سے بڑھکر یہ ہے کہ ملک کے اندر دو ایسی یونیورسٹیاں وجود میں آ گئی ہیں جنکے ذریعہ سے تمام علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم اُردو زبان میں ہو رہی ہے۔

ان خوش آیند اور امید پرور حالات میں بزم ادب سے رخصت ہوتے وقت میرے قلب کے اندر کسی قسم کا حزن و ملال محسوس نہیں ہوتا بلکہ اس خیال سے کافی طمانیت و مسرت ہے کہ جو کام ناموافق حالات میں نہایت بے مائگی و بے بضاعتی کے ساتھ شروع کیا گیا تھا اُسکو جاری رکھنے اور پایۂ تکمیل کو پہونچانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ سب ساز و سامان فراہم ہو گیا ہے اور خدا نے چاہا تو وہ دن دور نہیں جبکہ اُردو زبان دنیا کی مجلس السنہ میں دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے ہمدوش ہو سکے گی اور خود اس ملک کے اندر وہ مرتبۂ عالی حاصل کر لیگی جسکی وہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے سزاوار و مستحق ہے۔

بے محل نہ ہوگا اگر اس موقع پر ایک بار پھر یہ حرف شکایت زبان قلم پر آ جائے کہ لکھنؤ کو اُردو کے ساتھ جو مخصوص نسبت تھی اور اسکی بنا پر یہاں کے باشندوں کو اُسکی خدمت اور ترقی میں جو حصہ لینا چاہیے تھا افسوس ہے کہ اس حق کو اُنھوں نے ادا نہیں کیا اور اگر حال مستقبل کے لیے کسی حد تک آئینہ دار ہو سکتا ہے تو دلی رنج کے ساتھ اسکا اعتراف کرنا پڑیگا کہ آیندہ زمانہ بھی کچھ زیادہ پُر امید نظر نہیں آتا۔

انفرادی کوششوں کا تو ذکر ہی کیا ہے، چند سال اُدھر جو ایک انجمن اُردو یہاں قائم ہوئی تھی جسکا تذکرہ وقتاً فوقتاً ان اوراق میں ہوتا رہا ہے آج ہم دیکھتے ہیں کہ اُسکا عدم وجود بھی برابر ہے۔ جن اصحاب نے ابتدا میں اُسکے اجراء و قیام کا بیڑا اُٹھایا تھا اور طرح طرح کے دلخوش کن مواعید کرکے مجھے بھی اپنا وقت عزیز قربان کرنے پر آمادہ کر لیا تھا سب سے پہلے اُنھیں نے یہ دیکھ کر دامن کشی اختیار کی کہ اُن کے

پیش نظر اغراض و مقاصد کے حصول میں یہ انجمن کچھ زیادہ معین نہیں ہو سکتی - دوسرے اصحاب نے کچھ زیادہ
عرصہ تک ساتھ نباہا لیکن قومی و ملکی نقطۂ نظر سے مخلصانہ خدمت کا ولولہ نہ تھا اس لیے نمود و نمائش،
ترفع و تفوق کے گرداب سے باہر نہ نکل سکے - اور ان سب خود غرضیوں و خود بینیوں کا نتیجہ آخر یہ ہے
کہ اب اُس انجمن کو شاید کوئی ماتم گسار بھی نہ میسر آئیگا -

الناظر کے اسی نمبر کے ساتھ ہر ہر خریدار کا حساب بھی روانہ کیا جا رہا ہے - تاکہ جن صاحبان
کی پوری قیمت ادا نہ ہوئی ہو اُنکو معلوم ہو جائے کہ وہ کس قدر رقم واپس پانے کے مستحق ہیں - ہندوستان
کی دنیائے ادب میں اور علی الخصوص اُردو رسائل و اخبارات کے یہاں اگرچہ یہ رسم نہ تھی کہ کسی پرچہ
کے بند ہونے پر خریداروں کو انکی بقایا رقم واپس کی جائے - لیکن میں اس رسم کہن کو قابل تعریف اور
لائق تقلید نہیں جانتا - اس لیے چاہتا ہوں کہ کسی خریدار کی کوئی چھوٹی سی چھوٹی رقم بھی میرے ذمہ
واجب الادا نہ رہے - البتہ یہ خیال کر کے کہ اتنے بہت سے اصحاب کو علحدہ علحدہ منی آرڈر کے ذریعہ
روپیہ بھیجنے میں کافی نقصان ہوگا اور سب صاحبوں کو بیک وقت ادا کرنے کے لیے جس قدر روپیہ
درکار ہے شاید اُسکا انتظام بھی کاروبار کی موجودہ حالت میں میرے لیے خالی از دشواری نہ ہو - میں
ناظرین کرام سے یہ التماس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جو صاحب بغیر کسی زحمت یا انقباض قلب کے اسے
گوارا کر سکیں کہ نقد کے بجائے جنس کی صورت میں اپنا روپیہ واپس لے لیں وہ از راہ کرم اپنی رقم کے معاوضہ
میں کتابیں منگا لیں - مطبوعات الناظر اگر طلب فرمائیں گے تو بقدر ایک ثلث قیمت میں رعایت کی جائیگی
اور عام ذخیرہ کی کتابیں منگائیں گے تو ۲ر روپیہ کے حساب سے اُنکی قیمت بھی کم کی جائے گی - لیکن جو صاحب
اتنی عنایت اور رعایت کرنا پسند نہ فرمائیں وہ بے تکلف ایک کارڈ لکھ بھیجیں - انشاء اللہ اُنکی رقم
بذریعہ منی آرڈر ارسال خدمت ہو گی -

گذشتہ سال بعض اتفاقات کی بنا پر مجھے اُس جدید قدرتی طریقۂ علاج سے مستفید ہونے کا موقع ملا، جو عام
طور پر "پانی کا علاج" کہا جاتا ہے اور جو فی الاصل "علاج بالعناصر" کے لقب کا مستحق ہے - دسمبر ۲۹ء سے
میں نے فنی حیثیت سے اس کا مطالعہ شروع کیا - اور جب اُسکے نافع ہونے کا یقین ہو گیا تو جنوری
۳۰ء میں جناب بابو کرشن سروپ صاحب وکیل بجنور سے جا کر ملا، جو خود موجد علاج سے اُسکی زندگی میں مراسلت
کر کے اس طریقۂ علاج سے کامل واقفیت حاصل کر چکے اور ہندوستان میں یہ طریقۂ علاج رائج کرنے

میں بہت کچھ معین ہوئے ہیں۔ انکی عملی ہدایات اور قابل قدر مشورہ کی مدد سے میں نے اپنے گھر میں اس طریقۂ علاج کو رائج کیا اور بحمد اللہ کہ بہت نافع پایا۔ اسیری کے زمانہ میں فنی حیثیت سے اس طریقہ علاج کے مزید مطالعہ کا موقع ملا اور یہ خیال کرکے کہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت سے دوسرے بھائیوں کو بھی مستفیض ہونے کا موقع فراہم کیا جائے، ایک مختصر سے رسالہ میں اس طریقۂ علاج کی موٹی موٹی باتیں قلمبند کردی ہیں۔ جنکے مطالعہ سے امید ہے کہ لوگ اُسکے مبادیات اور خصوصیات سے یک گونہ آشنا ہو جائینگے۔ اور ان کو ضرورت کے وقت اس طریقہ کے بموجب علاج کرنے میں سہولت حاصل ہوگی۔ چنانچہ "علاج بالعناصر" کے نام سے یہ رسالہ الناظر میں بھی شایع کیا جا رہا ہے اور عام تقسیم کی غرض سے کچھ نسخے زائد بھی چھپوا لیے گئے ہیں۔ خدا کرے کہ ناظرین کو پسند آئے اور اس سے فائدہ پہونچے۔

۱۸ - مئی سنہ ۱۹۳۱ء

الناظر کے ساتھ جنوری سنہ ۲۹ع سے تاریخ امریکہ بالاقساط شایع ہو رہی تھی، اس نمبر میں اُسکے آخری اوراق پیش کیے جا رہے ہیں۔ کتاب مکمل ہوگئی ہے۔ فہرست مضامین، مختصر سا دیباچہ، امریکہ کا نقشہ، اور سرورق بھی تیار ہے۔ جن اصحاب نے شروع سے اوراق محفوظ رکھے ہوں وہ [illegible] کے لیے یہ چیزیں طلب فرمالیں۔ اور جو اصحاب کتاب کی اشاعت شروع ہونے کے بعد خریدار بنے ہوں انکو اگر کتاب کی تکمیل کیلئے پہلے ابتدائی اجزاء مطلوب ہوں تو انکی خدمت میں بھی بقیمت روانہ کیے جا سکتے ہیں۔

گذشتہ ایک سال کے اندر یوں تو ملک کے اندر بہت سے حوادث ایسے پیش آئے جنکے متعلق، الناظر کی باقاعدہ اشاعت کی صورت میں کچھ نہ کچھ لکھنا میرا فرض ہوتا۔ لیکن چند حادثات ایسے ہیں جنکا ذکر کیے بغیر اب بھی نہیں رہا جا سکتا۔

(۱) ہر ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ والیہ بھوپال کے۔ جو دِبا جود پر ہندوستان اور مسلمانوں کو بجا طور پر فخر و ناز تھا۔ مرحومہ نے اپنے طویل عہد حکمرانی میں برطانوی ہند کے باشندوں اور خاصکر مسلمانوں کے ساتھ جو حسن سلوک مرعی رکھا، وہ ہمیشہ یادگار رہیگا۔ حکمرانیوں کی ذمہ داریوں اور سلطنت العثمانیوں کے باوجود سادہ معاشرت، پاکیزہ سیرت، اور مخلوق کی خدمت کا جو نمونہ سرکار عالیہ نے پیش کیا اُسکی نظیر ملنا مشکل ہے۔ قومی و ملکی اداروں کی مالی امداد سب والیان ریاست کرتے ہیں، اہل علم

سرکار عالیہ اپنے فرائض حکومت کو انجام دیتی رہیں اور جس خلوص اور سرگرمی کے ساتھ وہ تعلیمی اور نسوانی تحریکات میں حصہ لیتی رہیں بے تامل کہا جا سکتا ہے کہ والیان ریاست کے طبقہ کا کیا ذکر ہے عام روسا و امرائے ملک میں بھی اُن کا کوئی ہمسر تلاش و جستجو کے بعد نہ مل سکے گا - اور ان سب خوبیوں سے بالا یہ صفت تھی کہ نہ صرف وہ ذاتی طور پر مذہبی احکام اور اسلامی تعلیم کے اتباع میں ہر لحظہ کوشاں رہتی تھیں بلکہ ہر آن اُنکی یہ کوشش بھی رہتی تھی کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کے قلوب فکر اسلامی سے معمور رہیں - اور ہر ہائینس کی زندگی کا یہ اہم ترین کارنامہ ہمیشہ یادرہیگا کہ اُنھوں نے غیر معمولی عزم و جرات سے کام لیکر اپنے صاحبزادہ نواب حمید اللہ خاں کو علیگڑھ میں بغرض تعلیم بھیجا، اور دنیا پر آپ اچھی طرح واضح کردی کہ اسلام شاہ و گدا، امیر و فقیر کے امتیازات کو تسلیم نہیں کرتا - اور اُنکے اسی دانشمندانہ اقدام کا آج یہ ثمرہ مل رہا ہے کہ موجودہ نواب صاحب بھوپال بھی اپنی مادر مرحومہ کے نقش قدم پر چلنے اور مسلمانوں کے ہر درد دُکھ میں شریک ہونے کے لیے تیار رہتے ہیں - اللہ تعالیٰ مرحومہ بیگم صاحبہ کو جنت النعیم میں جگہ عطا فرمائیں اور نواب صاحب کو توفیق بخشیں کہ وہ عملی طور سے زندگی کے ہر شعبہ میں مرحومہ کے صحیح جانشین ثابت ہوں اور خاص کر تقویٰ و دینداری کی راہ میں اُنکا کامل اتباع کرکے فلاح دارین حاصل کریں اور اُنکی روح پاک کو راضی رکھیں - آمین -

---

(۲) مولانا محمد علی کی عظیم الشان الجلیتوں کا وقتاً فوقتاً اِن اوراق میں ذکر ہوتا رہا ہے - مسلمانوں کے قومی کارکنوں میں کسی ایک شخص میں وہ تمام صفات جمع نہیں ہو سکے جنکا مجموعہ مولانا محمد علی تھے - علمی و ادبی قابلیت کے لحاظ سے تو وہ ملک کے ممتاز ترین افراد میں شمار ہوتے ہی تھے، مگر اسلام کی محبت اور مسلمانوں کا درد جیسا اُنکے دل میں تھا، اُسکی نظیر نہیں پائی جاتی - تحریر و تقریر کا جو ملکہ اُنھیں حاصل تھا اُسکے لحاظ سے وہ یگانۂ روزگار سمجھے جا سکتے تھے - مگر حق گوئی اور اخلاص مندی کا جوہر خاص جو اُن میں ودیعت ہوا تھا اُسکی مثال بھی مشکل ہی سے ملیگی -

مسلمانوں میں جو قحط الرجال ہے اُس کی بنا پر ہر بڑے اور صاحب کمال شخص کی وفات سے قوم کو شدید نقصان پہونچتا ہے - ایسی صورت میں اُس رہنمائے قوم کا اُٹھ جانا کیسی بڑی محرومی ہے، جو بیک وقت سرسید کا سا مفکر و مدبر تھا، محسن الملک کا سا طباع معاملہ فہم اور وقار الملک کا سا اخلاص مند و حق گو . .

مولانا محمد علی کی عمر طبعی صرف ۵۳ سال ہوئی، زمانہ نے بھی کچھ زیادہ سازگاری اُنکے ساتھ نہیں کی، اور قوم سے تو اس کی توقع ہی فضول تھی کہ وہ اُنکی خدمات جلیلہ اور متنوع کمالات کی پوری قدردانی

کرگئی، پھر بھی گذشتہ تیس سال کے اندر، علیگڈھ کالج، ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی،
مجلس خلافت، جامعہ ملیہ، انڈین نیشنل کانگریس کی کارروائیوں، کامریڈ و ہمدرد کے صفحات، جنگ
طرابلس، جنگ بلقان، اور ترک موالات کی سرگرمیوں اور چھندواڑہ و کراچی کی نظربندی و اسیری کی
روداروں میں جو کارنامے اُنکے ثبت ہیں وہ نہ صرف اُنکے بقائے نام کے لیے کافی ہیں، بلکہ اُن کی عظیم
شخصیت اور اعلیٰ سیرت کو آنے والی نسلوں کے روبرو پیش کرنے کے لیے عرصہ تک مشعل راہ کا کام دینگے۔

راقم الحروف نے سب سے پہلے دسمبر ۱۹۰۶ء میں یہیں لکھنؤ میں مولانا محمد علی کو دیکھا اور چھ سال
بعد ۱۹۱۲ء میں یہیں ایک دوست کے ذریعہ اُن سے تعارف حاصل ہوا - اور اسکے بعد برابر اسکے
مواقع ملتے رہے کہ اُنکے خانگی حالات اور ذاتی سیرۃ سے پوری واقفیت حاصل ہو - اور اسی کا نتیجہ یہ
تھا کہ بہت سے معاملات میں اختلاف رائے ہونے کے باوجود حتیٰ کہ بعض اوقات اسکی بھی نوبت آجاتی
تھی کہ علی الاعلان اُنکی رائے یا روش کی مخالفت کرنا پڑتی تھی - میرے دل میں مہاتما گاندھی کو چھوڑکر
ہندوستان کے کسی ملکی و قومی رہنما کی اتنی عظمت و محبت جاگزیں نہیں ہوئی جتنی مولانا محمد علی کی - اور یہی
سبب ہے کہ اُنکی وفات کو میں ہندوستان کے لیے، مسلمانوں کے لیے، اسلامی برادری کے لیے اور عالم انسانیت
کے لیے شدید مصیبت کا مرادف جانتا ہوں -

مرنے کے بعد، عالم اسلامی نے جس ہم آہنگی کے ساتھ نوحہ خوانی کی، اور اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس
کی پاک سرزمین کو اُنکا مدفن بنا کر جس طرح نوازا ہے اس سے قومی خدمت کرنے والوں اور مسلمانوں کے
سرداروں کو سبق حاصل کرنا چاہیے اور اپنی خودغرضیوں اور نفس پرستیوں کو چھوڑکر مولانا محمد علی کی پیروی
و تقلید کی کوشش کرنا چاہیے - اللہ تعالیٰ مولانا کی روح پاک پر اپنی رحمتوں اور نعمتوں کی بارش فرمائیں،
اُنکی بیگم صاحبہ اور اہل خاندان کو صبر جمیل اور تمام مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائیں کہ وہ مولانا کے خلوص و
صداقت، دردمندی و ہوا خواہی ملت کا اتباع کریں - آمین یا رب العالمین -

---

(۳) ملکی رہنماؤں اور کانگریس کے سرداروں میں پنڈت موتی لال نہرو کی عجیب و غریب شخصیت
تھی - اپنی ذہانت اور قابلیت سے کمائی ہوئی دولت کو ملک و قوم کی راہ میں جس بے جگری سے انھوں
نے صرف کیا، عیش و عشرت کی زندگی پر لات مار کر مہاتما گاندھی کے اتباع میں سادہ زندگی بسر کرنے پر
جس طرح اُنھوں نے قناعت کی، ضعیفی اور خرابی صحت کے باوجود جس جوان ہمتی اور سرگرمی کے ساتھ انھوں
نے فرائض قیادت و رہنمائی انجام دیئے اور جیل کے اندر ...

نھوں نے برداشت کیے، ہندوستان کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔

مہاتما گاندھی نے ہندوستانی سیاست میں عموماً اور کانگریس کے حالات میں خصوصاً جو انقلابِ عظیم
زشتہ بارہ سال کے اندر پیدا کر دیا ہے، بحیثیت ایک مفکر اور رہنما کے اگرچہ ان ساری کامیابیوں کے لیے
ہی سزاوار تحسین و آفریں ہیں، لیکن اس میں ذرا شبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اگر پنڈت موتی لال نہرو شروع
ں سے اُنکے شریکِ کار نہ بن جاتے اور مرتے دم تک اپنی تمام قوتوں کو اس مہمِ عظیم کے لیے وقف نہ
دیتے تو مہاتما جی کی کامرانیوں میں بہت بڑی کمی واقع ہو جاتی۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں جب مہاتما جی نے ترکِ موالات کا نظامِ عمل اہلِ ملک کے روبرو پیش کیا ہے،
کانگریس کے اربابِ اقتدار اور نامور قائدین میں پنڈت موتی لال نہرو کے سوا، کوئی بھی اُنکا ساتھ دینے
الا نہ تھا۔ اور اگرچہ کلکتہ کانگریس میں جو فتح مہاتما جی کو حاصل ہوئی اُس نے بعض دیگر زعماء کو مجبور
یا کہ وہ اپنی اختیار کردہ روش کو ترک کرکے مہاتما گاندھی کے جھنڈے تلے آجائیں لیکن اس سے پنڈت موتی لال نہرو کے
ے امتیاز میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی اور تحریکِ خلافت کی تائید میں مہاتما گاندھی کے ادنیٰ شریک و سہیم ہونے کے لحاظ سے پنڈت جی بار احسا
مسلمان کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اور اگرچہ آج مسلمانوں کے خیالات میں ایک عظیم تبدیلی واقع
ئی ہے اور وہ مہاتما گاندھی اور پنڈت موتی لال نہرو کے ممنونِ منت ہونے کے بجائے اُلٹے کانگریس
تما گاندھی اور نہرو خاندان پر اپنے احسانات جتانے میں دریغ نہیں کرتے، لیکن یقین ہے کہ آیندہ
انہ میں جب عہدِ حاضر کے حالات تاریخی واقعات کے طور پر کتابوں میں لکھے اور پڑھے جائیں گے تو
موقت کے مسلمان، اِن ہندو بزرگوں کی خدماتِ اسلامی کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کر سکیں گے۔

دعا ہے کہ پنڈت موتی لال کی اِن خدماتِ اسلامی کی قدر بارگاہِ ایزدی میں ہو اور عقیدت و
ت پذیری کے جو پھول اُنکی یادگار خدمات پر میں نچھاور کرتا ہوں، اُنکو شرفِ قبول حاصل ہو۔

---

(۴) ان اوراق میں برابر راجہ صاحب محمود آباد کی رایوں اور طریقِ کار سے اختلاف کیا جاتا
ہے، مگر نا حق شناسی ہو گی اگر اُنکی وفات سے جو نقصان ملک و قوم کو پہونچا ہے، اُس کا دل سے
عتراف نہ کیا جائے۔

گزشتہ چوبیس سال کے اندر، مہاراجہ صاحب نے جس فیاضی، اولوالعزمی اور انہماک سے
سلمانوں کے تعلیمی کاموں، سیاسی زندگی اور ملکی معاملات میں حصہ لیا، کم سے کم اُنکے طبقہ میں اسکی نظیر
ہیں مل سکتی۔ سرمایہ داروں اور دولتمندوں کی ملک میں کمی نہیں، مسلمانوں میں بھی مہاراجہ صاحب کی

ملک کے متعدد تاجر، زمیندار و امراء موجود ہیں، لیکن ملکی و قومی تحریکوں کی اعانت اور مہمانداری وغیرہ میں
جس حوصلہ مندی اور شاہ خرچی کا ثبوت اُنھوں نے دیا، عام دولتمندوں کا کیا ذکر ہے، بڑے بڑے والیانِ
ریاست کو بھی شاید یہ امتیاز نصیب نہ ہوا۔ اسکے علاوہ سالہا سال تک اپنی عیش و عشرت کی مصروفیتوں
کو ترک کرکے جس انہماک و سرگرمی کے ساتھ وہ اپنا وقت قومی اور ملکی کاموں میں صرف کرتے رہے،
وہ بھی کچھ کم لایقِ ستایش نہیں۔ اودھ اور لکھنؤ، مہاراجہ صاحب کے انتقال سے سُونا ہوگیا۔ اب
یہاں ہندو مسلمان، کسی گروہ کا کوئی رئیس ایسا باقی نہیں رہا جسکی فیاضی و حوصلہ مندی کو قومی و ملکی
کارکن اپنا ملجا و ماوٰے قرار دے سکیں، یا جس کی دولت، ساز و سامان، اور وقتِ عزیز کو وطنی و قومی ضروریا
ت کے لیے بے دریغ وقف سمجھا جائے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کے حق میں اپنے رسولِ مقبولؐ کی شفاعت قبول کریں اور اُنکے صاحبزادوں کو
صبرِ جمیل اور اپنے اولوالعزم باپ کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

۲۰- جون ۱۹۳۱ء

الناظر کی اشاعت جب گذشتہ سال دفعتہً رُک گئی تو اکثر و بیشتر معاصرین کرام نے اسکی پرواہ نہیں کی
کہ تبادلہ میں رسالہ وصول نہ ہوگا، بلکہ ازراہِ لطف و کرم اپنے اخبارات و رسائل برابر ارسال فرماتے رہے
اور اب بھی بہت سے اصحاب کی اس عنایت سے میں محروم نہیں ہوں۔ گو بعض نے میری رہائی کے بعد بھی
الناظر کے جاری نہ ہونے کی وجہ سے شاید مایوس ہوکر اپنے پرچے بھیجنا بند کردیے ہیں۔

جیل خانہ میں اخبارات صرف وہی جانے پاتے ہیں جنکو حکومت منتخب کرتی ہے۔ اور ایکی تو یہاں
کی حکومت خود اپنے ہی خرچ سے ایسے اخبارات فراہم کرتی رہی۔ اس لیے جو اخبارات میری عدم
موجودگی میں آتے رہے وہ میرے پاس نہیں پہونچ سکے مگر رسائل سب پہونچتے تھے اور اسیری کی فرصتوں
میں مجھے اُن سے لذت اندوز ہونے کا خوب موقع ملتا تھا، بلکہ دیگر احباب جو ساتھ تھے اُن میں سے بھی اکثر
اُن رسالوں سے مستفید ہوتے تھے۔ میں جملہ معاصرین کرام کی اس محبت و عنایت کا بدل ممنون ہوں۔
خدا کرے کہ آیندہ اُنکی کوئی حقیر خدمت مجھ سے بھی بن پڑے۔

اسی سلسلہ میں احباب و معاصرین کرام علی الخصوص مولوی عبدالحق صاحب یہ سُنکر بہت مسرور ہونگے
کہ جیل میں ایکی دفعہ جہاں مجھے اسکا موقع ملا کہ تھوڑی سی ہندی پڑھ لوں، وہاں متعدد ہندو احباب نے اُردو کی
تحصیل پر توجہ کی، خصوصاً میرے ہندی کے اُستاد پنڈت ونکٹیش نرائن تواری ایم اے سابق رکن سرونٹ آف
انڈیا سوسائٹی اور کنور سرپش سنگھ صاحب برادرِ خورد راجہ صاحب کالا کانکر نے تو چند ہی ماہ میں اُردو سے کافی مناسبت
پیدا کرلی ہے۔

نوٹ :- عام اجازت ہے کہ اخبارات و رسائل اسکو نقل کریں اور جو صاحب چاہیں مفت تقسیم کی غرض سے طبع کرائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علاج بالعناصر

خداوند قدوس نے انسان ضعیف البنیان کے لیے جہاں قسم قسم کی نعمتیں اتاری ہیں، اس اپنی رحمتِ کاملہ سے ایک نعمت یہ بھی عطا فرمائی ہے کہ قوانین قدرت کی خلاف ورزیوں کی بدولت انسان کو جو انواع و اقسام کے عوارض جسمانی لاحق ہوتے رہتے ہیں اُنکے دفعیہ کے لیے طرح طرح کی تدابیر تعلیم کی ہیں۔ اور جدید تہذیب و تمدن کے علمبرداروں نے تو اپنے اکتشافات اور طبی تحقیقات کی بدولت ایسے ایسے طریقے علاج کے نکالے ہیں اور انکی بنا پر ایسے ایسے بلند دعاوی کرتے ہیں کہ گویا انسانوں کی موت و زیست کا مسئلہ قضا و قدر کے قبضۂ قدرت سے نکل کر اب خود ان سائنس دانوں اور ڈاکٹروں کے حیطۂ اقتدار میں آگیا ہے۔

لیکن ایک طرف انسانی کمالات کے یہ مظاہرے ہیں اور دوسری طرف مشاہدہ اور تجربہ بتا رہا ہے کہ جیسے جیسے علم العلاج کا فن ترقی پا رہا ہے ویسے ویسے عوارض کی کثرت ہوتی جاتی ہے اور ایسی ایسی بیماریاں پھیلتی جاتی ہیں جن سے نوع انسانی کی سابقہ نسلیں غالباً قطعاً نا آشنا تھیں۔ اسکے علاوہ ماہرینِ فنِ علاج کے طرزِ عمل نے علاج کے طریقوں کو اسقدر گراں اور پیچیدہ بنا دیا ہے کہ دنیا کی کثیر آبادی اُس سے پریشان اور بیزار ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی کے خلاف احتجاج کرنے کی غرض سے یورپ اور امریکہ کے بہت سے لوگوں کا خیال اس طرف رجوع ہوا کہ مروجہ طریقہ ہائے علاج سے قطع نظر کر کے ایسے طریقے دریافت کیے جائیں جو زیادہ آسان و سہل الحصول ہوں اور فطرت انسانی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھتے ہوں۔ اور گزشتہ سو ڈیڑھ سو سال کے اندر جو کوششیں اُن لوگوں نے کیں اُنکی بدولت اس وقت یورپ اور امریکہ میں اور وہاں سے نکل کر دوسرے حصص عالم نیز خود ہمارے ملک کے اندر تقریباً ایک درجن ایسے جدید طریقہ ہائے علاج رائج ہو گئے ہیں جو "قدرتی علاج" کے نام سے موسوم ہیں۔ اور جن میں نہ تو دوا استعمال کی جاتی ہیں اور نہ کسی قسم کے عمل جراحی کی ضرورت ہوتی ہے۔

انھیں جدید طریقہ ہائے علاج میں سے ایک "علاج بالعناصر" کا طریقہ ہے جسکے متعلق یہ آسانی سے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے سب طریقوں سے زیادہ آسان اور ارزاں ہے۔ اور چونکہ اسکے فوائد بذات خود میرے ذاتی تجربہ میں آئے ہیں اس لیے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت سے اپنے

دوسرے بھائیوں کو بھی مستفیض ہونے کا موقع فراہم کروں۔

جرمنی کے ایک محقق نے۔ جسے خود اپنے شدید و مزمن مرض کے علاج کی ضرورت سے قدرتی علاجوں کے مروجہ طریقوں پر غور کرنے کی ضرورت پیش آئی، مسلسل غور و فکر اور مشاہدہ و تجربہ کے بعد یہ طریقۂ علاج ایجاد کیا ہے۔ اور نصف صدی سے زائد زمانہ گزرا کہ اُس نے اپنے کاروباری پیشہ کو ترک کر کے اس طریقۂ علاج کی ترویج میں اپنا بقیہ حصۂ عمر صرف کیا اور جن لوگوں نے اسکے تجربات سے فائدہ اُٹھایا ہے وہ جانتے ہیں کہ نوع انسانی کی کتنی عظیم الشان خدمت اُس نے انجام دی ہے۔ لوئی کوہنی (جرمن محقق) کی تحقیقات کے یہ نتائج جس کتاب میں درج ہیں اُس کا نام خود اُس نے "نیا علم شفا بخشی" تجویز کیا ہے۔ اور اُسکے تراجم دنیا کی اکثر و بیشتر زبانوں میں شایع ہو چکے ہیں۔ اُردو میں بھی پچیس سال سے زائد زمانہ گزرا جب بابو کرشن سروپ صاحب بی اے ایل ایل بی، ایڈوکیٹ، بجنور (صوبۂ متحدہ) نے اسکا ترجمہ کیا تھا اور اُس وقت سے اب تک سات بار یہ کتاب شایع ہو چکی ہے۔

بنیادی اصول اس طریقۂ علاج کی بنا اس حقیقت پر رکھی گئی ہے، کہ انسان ہوا، پانی، آگ اور مٹی کے عناصر اربعہ سے بنا ہے اور یہی عناصر اربعہ اُسکی زندگی کی بقا کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ لوئی کوہنی نے اپنے طریقۂ علاج کی بنیاد بھی انھیں عناصر اربعہ پر رکھی ہے اور اُسکے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کیا جائے تو انسان کے جملہ عوارض جسمانی کا علاج انھیں چاروں عناصر کی امداد سے ہو سکتا ہے۔

بیماری کی جڑ لوئی کوہنی نے اپنی تحقیقات، مشاہدات اور تجربات سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچا دیا ہے کہ انسان کے جسم میں مادۂ فاسد کے داخل ہونے سے بیماری پیدا ہوتی ہے۔ جب تک مادۂ فاسد کی مقدار بہت قلیل رہتی ہے یا کوئی سبب ایسا نہیں پیدا ہوتا کہ مادۂ فاسد ہیجان میں آئے، بیماری کا اثر اچھی طرح محسوس نہیں ہوتا۔ جسم انسانی میں مادہ فاسد کے داخل ہونے کی حسب ذیل صورتیں ہیں:—

(۱) ہوا کی صورت میں پھیپھڑوں کے اندر۔

(۲) غذا کی شکل میں معدہ کے اندر۔

(۳) مسامات کے ذریعے کُل جسم کے اندر۔

اور تمام بیماریوں کی جنکے مختلف نام طبیبوں، ویدوں اور ڈاکٹروں نے رکھ چھوڑے ہیں، یہی اصل ہے۔

واحد علاج

لوئی کوہنی کی تحقیقات سے چونکہ یہ امر واضح ہو گیا کہ جملہ امراض ایک ہی سبب سے پیدا ہوتے ہیں، اس بنا پر اُس کا دعویٰ یہ ہے کہ سب بیماریوں کا واحد علاج یہ ہے کہ مادۂ فاسد کو جسمِ انسانی سے خارج کیا جائے۔

طریقۂ علاج

جسمِ انسانی سے مادۂ فاسد کے اخراج کی قدرتی صورت یہ ہے کہ پسینہ اور پیشاب یا پاخانہ کی صورت میں مادۂ فاسد خارج ہو جائے۔ اس لیے لوئی کوہنی نے ایسے وسائل تجویز کیے ہیں کہ بغیر کسی دوا کے استعمال کے، صرف ہوا، پانی، آگ اور مٹی کے خارجی استعمال سے مادۂ فاسد خارج کیا جاتا اور ہر مرض دفع ہو جاتا ہے۔

چار غسل

لوئی کوہنی نے مادۂ فاسد کو جسمِ انسانی سے خارج کرنے کے لیے مریضوں کے واسطے چار قسم کے غسل تجویز کیے ہیں :-

(۱) دھوپ کا غسل (Sun Bath)
(۲) بھاپ کا غسل (Steam Bath)
(۳) جانگھ کا غسل (Hip Bath)
(۴) بیٹھک کا غسل (Sitz Bath)

دھوپ کا غسل

مریض کو تیز دھوپ میں برہنہ لٹا دیتے ہیں۔ صرف ستر پوشی کے لیے ہلکا سا کپڑا لپیٹ دیا جاتا ہے۔ اور پیڑو کو (جو لوئی کوہنی کی تحقیقات کے بموجب جسمِ انسانی کے اندر مادۂ فاسد کے اجتماع کا مرکز یا خزانہ ہے) برہنہ کر کے سبز پتوں سے ڈھک دیتے ہیں۔ اور کسی خاص عضو میں کوئی شکایت ہو تو اُسے بھی سبز پتوں سے ڈھک دیتے ہیں۔

جہاں جہاں سبز پتے رکھے جاتے ہیں، قدرت کی کرشمہ سازی دیکھیے کہ وہاں سے خوب پسینہ نکلتا ہے۔ اور جسم کے اندر جو مادۂ فاسد جمع ہو اُسکو منتشر اور خارج کرنے میں اس طریقے سے بہت مدد ملتی ہے۔

بھاپ کا غسل

مریض کو برہنہ کر کے بید کے کوچ یا کھری چارپائی پر لٹا دیتے ہیں۔ اوپر سے صاف چادر ڈال کر کمبل اس طور پر اُڑھا دیے جاتے ہیں کہ مریض کے ساتھ کوچ یا چارپائی بھی چاروں طرف سے بالکل ڈھک جائے۔ پھر تین بند برتنوں میں کھولتا ہوا پانی چارپائی کے نیچے رکھ دیا جاتا ہے۔ ایک برتن مریض کی گردن کے نیچے، دوسرا کمر کے نیچے، اور تیسرا پاؤں کے نیچے رہتا ہے۔ اور اسکے بعد برتنوں کے ڈھکنے ہٹا دیے جاتے ہیں۔ کچھ

لیٹ رہنا چاہیے۔ تاکہ غسلوں سے جو ٹھنڈک جسم میں پہونچی ہے اُسکا اثر جاتا رہے اور بدن گرم ہوجائے

غذا | لوئی کوہنی کے طریقۂ علاج میں غذا پر خاص توجہ کی جاتی ہے۔ کیونکہ اسکی رائے میں جسم انسانی کے اندر مادۂ فاسد کے داخل ہونے کا سب سے بڑا ذریعہ معدہ ہے۔ خوراک کی زیادتی، یا غذا کی ثقالت کے باعث معدہ جن چیزوں کو اچھی طرح ہضم نہیں کرتا اور جنکا بروقت اخراج بھی نہیں ہوپاتا، وہی مادۂ فاسد بنکر جسم کے اندر مجتمع ہوتی رہتی ہیں۔ اور بکثرت عوارض کا موجب بن جاتی ہیں۔ اس لیے اگر مریض کو تندرستی حاصل کرنا یا تندرست آدمی کو بیمار ہونے سے بچنا منظور ہے تو اسکی بہترین صورت یہ ہے کہ سب غذائیں حتی المقدور قدرتی صورت میں استعمال کرے اور خوراک کی مقدار اتنی رکھے کہ معدہ بآسانی ہضم کر سکے۔

بیماری کی حالت میں تو مریض کے لیے لازم ہے کہ لوئی کوہنی کی ہدایات کے بموجب غذا کھائے۔ صحتیاب ہونے کے بعد بھی اگر ان ہدایات پر عمل ہوگا تو انشاء اللہ تندرستی برقرار رہیگی۔

پرہیز | بیماری کی حالت میں جن چیزوں سے پرہیز کرنے کی خاص ہدایت کی جاتی ہے، وہ حسب ذیل ہیں :-

جملہ نشئی اشیا، چاے، قہوہ وغیرہ محرکات، گوشت، مصالحہ جات، اور جملہ ثقیل و دیر ہضم غذائیں۔ علی الخصوص مرکبات۔

مفید غذائیں | اشیاے ذیل کو لوئی کوہنی غذا کے لیے مفید قرار دیتا ہے :- تازہ پھل، ترکاریاں غلہ، خشک میوہ جات، دودھ، اور مریض کی حالت کے لحاظ سے انھیں اشیاء کو سادہ یا مرکب صورت میں استعمال کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ مناسب ہوگا کہ غذا اور پرہیز کے بارے میں ضروری ہدایات معالج سے حاصل کی جائیں یا لوئی کوہنی کی کتاب میں جو ہدایات درج ہیں اُنکا بغور مطالعہ کیا جائے۔

مٹی کا استعمال | اکثر و بیشتر امراض کا علاج بالعموم غسلوں سے ہوتا ہے، لیکن خاص حالات میں مادۂ فاسد کو جسم کے اندر منتشر کرنے کے لیے علی الخصوص اورام اور پھوڑے پھنسی یا چوٹوں کا علاج کرنے میں مٹی کا لیپ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس بارے میں بھی یا تو کسی معالج سے مشورہ حاصل کیا جائے یا لوئی کوہنی کی کتاب میں جو ہدایات درج ہیں اُن پر عمل ہونا چاہیے۔

علاج بالعناصر کے مخصوص فائدے | جو کچھ اختصار کے ساتھ اوپر لکھا گیا ہے اُس سے ناظرین کو

اندازہ ہوگیا ہوگا کہ یہ طریقۂ علاج کس قدر آسان، سہل الحصول اور ارزاں ہے۔ لوئی کوہنی کی کتاب "نیا علمِ شفا بخشی" کے مترجم بابو کرشن سروپ صاحب نے کتاب کے دیباچہ میں جن فوائد کی طرف ناظرین کتاب کی توجہ منعطف کرائی ہے اُنکو بعض اضافوں کے ساتھ یہاں اس خیال سے درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اجمالاً اس جدید طریقۂ علاج کی خصوصیات ذہن نشین ہوسکیں۔

(۱) چونکہ جملہ امراض کے پیدا ہونے کا سبب واحد ہے یعنی جسم میں مادۂ فاسد کا داخل ہونا۔ اس بنا پر ہر مرض کی جداگانہ تشخیص کی ضرورت نہیں پڑتی۔

(۲) تشخیص کی غلطی سے دوسرے قسم کے علاجوں میں جس طرح کے نقصانات کا خطرہ ہوتا ہے اس طریقۂ علاج میں ویسا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

(۳) کوئی دوا استعمال نہیں کی جاتی اس لیے ناقص یا غلط دوا سے یا دوا کے وزن میں کمی بیشی ہوجانے سے جو نقصانات ہوتے ہیں اُن کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

(۴) کسی قسم کی چیر پھاڑ یعنی عمل جراحی یا انجکشن کی ضرورت نہیں پڑتی اس لیے نہ اُنکی تکلیفات کا سامنا ہوتا ہے اور نہ وہ خطرات درپیش ہوتے ہیں جو بعض اوقات نازک یا خراب عمل جراحی اور ناقص انجکشن کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں۔

(۵) حکیموں، ویدوں، اور ڈاکٹروں کی بڑی بڑی فیسوں، دواؤں اور دیگر سامان متعلقہ کی قیمت اور اسپتالوں کے گراں قدر اخراجات سے مریض کو نجات رہتی ہے۔

(۶) جو لوگ مذہباً بعض ادویہ کا استعمال نہیں کرسکتے یا خاص اوقات میں دوا کا استعمال کرنا پسند نہیں کرتے اُنکو اس طریقۂ علاج میں ایسی کسی قسم کی دقت نہیں پیش آتی۔

(۷) عورتوں کو ناگوار طبی معائنہ جات سے نجات مل جاتی ہے۔ اور پڑھی لکھی عورتوں کے لیے جو لوئی کوہنی کی کتاب "نیا علم شفا بخشی" کو مطالعہ کرکے خود ہی اپنا علاج کرسکیں اسکی بھی حاجت نہیں کہ وہ اپنے مخصوص امراض کا کسی سے ذکر کریں۔

(۸) جو لوگ خبیث امراض میں مبتلا ہوتے ہیں اور بسا اوقات شرم کے مارے معالجین سے اپنا حال نہیں بیان کرسکتے اور اس بنا پر علاج سے محروم رہ جاتے ہیں، یہ طریقۂ علاج اُنکے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگا۔ کیونکہ وہ لوئی کوہنی کی کتاب کے بغور مطالعہ کے بعد اپنا علاج خود کرسکتے ہیں۔

(۹) اس طریقۂ علاج کے متعلق اگرچہ بعض خاص قسم کے ظروف و آلات بنائے گئے ہیں جو ایک بار تھوڑے روپیے کے صرف سے مہیا ہوجاتے ہیں اور پھر سالہا سال تک سارے گھر بھر کے کام آتے

ہیں لیکن کسی کے پاس وہ ظروف و آلات نہ ہوں تو بغیر اُنکے ایسی گھریلو چیزوں سے کام نکالا جا سکتا ہے جو ہر مقام پر حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے گاؤوں میں بھی آسانی میسر آجاتی ہیں - اس بنا پر غریبوں اور تنگ حال لوگوں کے لیے یہ طریقۂ علاج خدا کی رحمت خاص ہے۔

(۱۰) جہاں کہیں اس طریقۂ علاج کے ایسے جاننے والے موجود ہوں جو محض رفاہ عام کی خاطر لوگوں کو مشورہ دیتے ہوں، وہاں ایسے لوگوں کے مشورے سے علاج کیا جا سکتا ہے - اور جہاں کہیں ایسا کوئی موجود نہ ہو یا اُسکے باقاعدہ پیشہ کرنے کی وجہ سے فیس وغیرہ کا جھگڑا ہو، وہاں لوئی کوہنی کی کتاب "نیا علم شفا بخشی" کا ایک نسخہ منگا لینا کافی ہے - کیونکہ اُسکے بغور مطالعہ کے بعد ہر سمجھدار آدمی اپنا اور اپنے اہل خاندان کا علاج بآسانی کر سکتا ہے - جو شخص کتاب کے مطالب کو اچھی طرح نہ سمجھ سکے وہ دوسرے سمجھدار آدمی سے پڑھوا کر کام نکال سکتا ہے۔

آخری گزارشات

یہ طریقۂ علاج چونکہ دوسرے مروجہ طریقہ ہائے علاج کے مقابلہ میں بالکل جدید ہے اور دیکھنے میں ٹوٹکا سا معلوم ہوتا ہے - اس بنا پر نہ تو عام طور پر اسکے فوائد اور خوبیاں معلوم ہیں اور نہ لوگوں کو جلد باور ہوتا ہے کہ ایسی آسانی سے امراض کا دفعیہ ہو سکتا ہے۔

خود لوئی کوہنی کو شروع شروع بہت دشواریوں کے بعد مریضوں کو اس طریقۂ علاج کے بموجب علاج کرنے کی ترغیب دینے میں کامیابی ہوئی اور اس ملک میں بھی جو لوگ اس طریقہ کو رائج کرنے کے لیے کوشاں ہیں اُنھیں کافی دشواری پیش آتی ہے اور عموماً ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی مریض سب قسم کے علاج کرکے تھک جاتا اور صحتیابی سے مایوس ہو جاتا ہے تب وہ اس علاج کی آزمائش کرنے پر آمادہ ہوتا ہے - گو لوئی کوہنی نے اپنی کتاب کے آخر میں جو خطوط شائع کیے ہیں اور بابو کرشن سروپ صاحب نے جو اپنے تجربات قلمبند کیے ہیں اُنکے مطالعہ سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ جب آخر کار باقاعدگی کے ساتھ لوگ اس طریقہ کے مطابق علاج کرتے ہیں تو اسکے کامیاب نتائج دیکھ کر اسکے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔

ناواقفیت اور بے اعتقادی کے علاوہ اس طریقۂ علاج میں تھوڑی دشواری اس سبب سے بھی پیدا ہوتی ہے کہ بعض لوگ اُن پابندیوں سے گھبراتے ہیں جو حالت مرض میں بتائی جاتی ہیں خصوصاً غذا کے معاملہ میں ہم لوگوں کی عادتیں جس قسم کی پڑی ہوئی ہیں اُنکے باعث پرہیز جیسا چاہیے ویسا عمل کرنا دشوار نظر آتا ہے

لیکن اگر ذرا سمجھ اور ہمت سے کام لیا جائے اور دوسرے طریقہ ہائے علاج میں جو دشواریاں، دقتیں اور زیر باریاں ہوتی ہیں اُن پر نظر رکھی جائے تو ہر شخص بے تامل اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا کہ بنی نوع انسان کے لیے عموماً اور ہندوستان جیسے مفلس ملک کے لیے خصوصاً یہ طریقۂ علاج نہایت بیش بہا

پُر منفعت ہے۔

لوئی کوہنی نے اپنی کتاب میں بار بار لکھا ہے کہ اس طریقہ سے ہر مریض کا نہیں مگر ہر مرض کا علاج ممکن ہے۔ دنیا میں اسوقت جتنے طریقہ ہائے علاج رائج ہیں اُن کے ماہرین بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں۔ زندگی اور موت خدا کے اختیار میں ہے۔ اگر قوتِ زیست بالکل زائل ہو چکی ہے اور موت کا معین وقت قریب آپہونچا ہے تب تو نہ اس طریقۂ علاج سے اور نہ کسی بڑے سے بڑے حاذق و ماہر طبیب وید یا ڈاکٹر کے علاج سے کوئی فائدہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر زندگی کی میعاد ختم نہیں ہوئی ہے تو انشاء اللہ شدید سے شدید مرض کا بھی اس طریقہ علاج سے ازالہ ہو جائیگا بشرطیکہ مریض پوری پابندی اور باقاعدگی کے ساتھ کچھ عرصے تک علاج کرتا ہے۔

پیچیدہ اور مزمن امراض میں جو لوگ بدنصیبی سے مبتلا ہوں اُنکو مروجہ طریقہ ہائے علاج میں سے کسی طریقہ پر بھی کافی مدت تک علاج کرنے ہی کے بعد صحت کی امید ہو سکتی ہے۔ اور لوئی کوہنی کے بتائے ہوئے طریقہ پر بھی علاج کرنے میں دیر ضرور لگتی ہے لیکن دوسرے طریقوں پر جو خاص امتیاز اور فوقیت اس علاج بالعناصر کو حاصل ہے وہ یہ ہے کہ صرفِ کثیر اور عمل جراحی کی ضرورت پڑے تو اسکی تکالیف ومصائب کے علاوہ دوسرے طریقوں میں مریض کو نقصان پہونچنے اور مرض کے بڑھ جانے کے بہت امکانات ہیں۔ اور لوئی کوہنی کے طریقہ پر علاج کرنے میں نہ تو روپئے کا صرف ہے اور نہ کسی قسم کے نقصان اور تکلیف کا اندیشہ۔ پھر دوسرے طریقوں پر علاج کرنے میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ مریض کی فوری تکالیف دفع ہو جاتی ہیں یا مرض کچھ دنوں کے لیے دب جاتا ہے لیکن مرض جڑ سے نہیں جاتا۔ برخلاف اسکے لوئی کوہنی کے طریقۂ علاج میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سارے جسم سے بیماری دفع ہو جاتی ہے اور مرض جڑ سے جاتا رہتا ہے۔

سطور بالا کے مطالعہ کے بعد جن اصحاب کو اس طریقۂ علاج سے فائدہ اُٹھانا منظور ہو وہ بابو برج کرشن سروپ صاحب ایڈوکیٹ۔ کوہنی آشرم۔ بجنور (صوبۂ متحدہ) کے پاس سے کتاب "نیا علم شفا بخشی" قیمتی [illegible] منگالیں۔ یا خود صاحب موصوف سے جو تقریباً تیس سال سے اس طریقہ پر علاج کر رہے ہیں اور جنھوں نے بجنور میں کوہنی آشرم کے نام سے ایک طرح کا اسپتال قائم کر رکھا ہے یا کسی ایسے مقامی معالج سے جو اس طریقہ کے بموجب علاج کرتے ہوں رجوع کریں۔ بابو کرشن سروپ صاحب مراسلت کے ذریعہ سے بھی برابر علاج کرتے رہتے ہیں۔ مقامی اصحاب چاہیں تو حسب صحت وموقع راقم الحروف بھی رضا کارانہ ہر ممکن خدمت کے لیے حاضر ہے۔ فقط

ظفر الملک
ایڈیٹر الناظر لکھنؤ

گئے تھے۔ جب اسپین، یورپ کے بادشاہوں کی امداد اور پوپ کی اعانت سے بھی اپنی گم شدہ نوآبادیوں کی واپسی میں ناکام رہا تو اس نے مجبوراً مختلف صلحناموں کے ذریعہ سے قریب قریب تمام نوآبادیوں کی آزادی تسلیم کر لی۔

ہسپانوی امریکہ، انقلابات کے بعد

بولی ور کی وفات کے ایک سال بعد کولمبیا کی جمہوری سلطنت تین خود مختار جمہوری حکومتوں وینیزولا غرناطۂ نوا اور ایکویڈر میں ایک ہی سے مشروطوں کے ساتھ جو عام طور پر شمالی امریکہ کے مشروطہ کے نمونہ پر بنائے گئے تھے منقسم ہوگئی۔ انتظامی طاقت کا سردار منتخب شدہ صدر ہوتا تھا اور اس کے ساتھ اس کے وزراء، انتظام سلطنت ہوتے تھے۔ قوانین وضع کرنے کا کام کانگریس کے ہاتھ میں تھا جس میں ایک سینیٹ اور نمائندوں ہوتے تھے فوجی طاقت ایک مستقل فوج اور رضا کاروں کی جماعت سے مرکب تھی لیکن شمالی امریکہ کی ریاستہائے متحدہ میں مختلف فرقے ایک دوسرے کی مخالفت مشروطہ کی حدود کے اندر کرتے تھے اور جنوبی امریکہ میں جھگڑے اور فساد برابر ہوتے رہتے تھے کبھی انقلابی اور کبھی جوابی جن میں بڑے فرقوں کا ہر ایک شخص اپنے ہاتھ میں حکومت کی باگ رکھنا چاہتا تھا اور اپنے اصول کے مطابق حکومت کی تنظیم کو پسند کرتا تھا۔ یہاں تک کہ آخر کار نسلی جذبات اور مخاربات نے جو سفید اور رنگین آبادیوں میں وقوع پذیر ہوئے سیاسی مناقشات میں اور اضافہ کر دیا۔ علیحدہ علیحدہ حکومتوں کے صیغوں کی تقسیم ایک ہفتہ وار منتظم مرکزی طاقت کی ماتحتی میں آزادی کے احساس کو برقرار رکھنے کے لیے کافی نہیں تھی جیسا کہ شمالی امریکہ میں ہوا بلکہ اس سے اس رجحان کا پتہ چلتا ہے جو اندرونی نااتفاقی اور علیحدگی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

وینیزولا

۱۸۴۸ء کے بعد وینیزولا کی جمہوری سلطنت دو فرقوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک قدامت پرست تھا اور دوسرا نہایت آزاد۔ ان دونوں کے حسد و رقابت سے سلطنت نے تباہی اور بدامنی کی شکل اختیار کی۔ خاندان مونیگاز نے اس حالت سے فائدہ اٹھا کر ایک قسم کی امراشاہی حکومت قائم کر دی۔ دس برس تک اس خاندان کے افراد نے رشوت اور بغاوتوں کے ذریعہ سے اپنے ہاتھ میں طاقت رکھی یہاں تک کہ جنرل کیسٹرو کو قدامت پرست فرقے نے

صدر بنا دیا اور قومی مجلس سے مشروطہ پر نظر ثانی کرائی لیکن کیسٹرو کسی فریق کو بھی خوش نہ رکھ سکا۔ اور
صدارت تین سال کے اندر چار شخصوں کے ہاتھوں میں آئی۔ آخر کار فیلکن جو مرکزی حکومت کے طرفداروں کا
سردار تھا ۱۸۶۳ء میں صدر بنایا گیا اور اس نے ایک نئی مجلس ملی طلب کی۔ اُس نے نیا مشروطہ تیار کیا جو
شمالی امریکہ کے اتحادات سے بے حد مشابہ تھا۔ اٹھارہ ریاستیں جو اپنے اندرونی سیاسی اور قانونی معاملات کے لیے
آپس میں سر ٹکرا رہی تھیں وینیزولا کی ریاستہائے متحدہ بن گئیں جو ایک کانگریس اور ایک صدر کے ماتحت
ہو گئیں اور ۱۸۶۴ء میں کیراکاس کو دارالسلطنت بنا دیا گیا۔ لیکن بغاوتوں اور خانہ جنگیوں کا سلسلہ ۱۸۷۰ء
تک قائم رہا۔ اس سال گزمان بلانکو صدر بنایا گیا جو پندرہ سال تک اپنے عہدہ پر فائز رہا۔ اس کے زمانے میں
ملک میں بے حد مادی ترقی ہوئی۔ بعد ازاں برطانیہ نے سرحد کے متعلق جھگڑا شروع کر دیا جو ۱۸۹۹ء میں جا کر
وینیزولا کے حق میں طے ہوا۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۰۱ء میں کیسٹرو صدر منتخب کیا گیا اور ستمبر ۱۹۰۳ء میں ملک کو
کامل امن و امان نصیب ہوا۔ اور خانہ جنگی کا خاتمہ ہو گیا۔

غرناطۂ نو یا کولمبیا

غرناطۂ نو انقلاب کے بعد ۲۰ ستمبر ۱۸۶۱ء سے ریاستہائے متحدہ کولمبیا کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں
سیاسی، مذہبی اور فوجی انقلابات یکے بعد دیگرے رونما ہوئے اور ملک متواتر بدامنی کی آماجگاہ بنا رہا۔ جب
جنرل ہیرن اور جنرل ماسکیرا کو صدارتیں ملیں اس وقت باشندوں میں اعتدال کی روح پیدا ہوئی اور
امن و امان قائم ہوا۔ مشروطہ کی اصلاح کی گئی۔ تباہ شدہ مالی محکمہ کو درست کیا گیا اور تعلیم، تجارت اور عمومی ملکی
مدافعت کے صیغہ جات قائم کیے گئے۔ لیکن عرصہ تک خانہ جنگی رہی۔ پناما اس جمہوری سلطنت سے علیحدہ ہونے کی
خواہش کرتا رہا۔ دسمبر ۱۹۰۳ء میں جنرل ریز صدر ہوا اور اس کا زمانۂ صدارت چار سال کی بجائے دس سال
کر دیا گیا۔ ۱۹۰۴ء میں خاکنائے پناما میں جہازوں کے لیے نہر بنانے کے متعلق ریاستہائے متحدہ امریکہ سے
بہت قیل و قال کے بعد صلح ہوئی اور ایک کروڑ ڈالر لے کر آخرالذکر کو نہر بنانے کا اختیار دے دیا گیا۔

پیرو

تمام جمہوری سلطنتوں میں جو جنوبی اور وسطی امریکہ میں واقع تھیں صرف پیرو کی آزادی کو سپین نے

(۷۱)

ملک کے اصلی باشندوں سے ارتباط شروع کیا اور ان کا اور اپنا معاملہ ایک بنالیا۔ اگرچہ یہ لوگ زیادہ تر فاتح قوم سے تھے لیکن ان کو سرکاری عہدے نہیں دیے جاتے تھے اور اس لیے وہ بھی مفتوح قوم کے مشابہ ہو گئے تھے چنانچہ اسی بنا پر اُنھوں نے مشترکہ بدلہ بھی لینا چاہا۔ دوسری جماعت میں جس کو سرکاری فرقہ بھی کہہ سکتے ہیں تمام حکام اور نوآبادی کے سرکاری منتظمین شامل تھے جو زیادہ تر ہسپانوی نسل سے تھے۔

۱۷۸۹ء سے جب کہ آبائی ملک کے خلاف پہلی سازش (اور یہ ایک چنگاری تھی جو ایک بڑی آتش زدگی کا پیش خیمہ تھی) کی گئی تھی ۱۸۵۷ء تک جب کہ مشروطہ اور اصلاحی قوانین یکجا کیے گئے میکسیکو میں علی التواتر جنگ کی آگ بھڑکتی رہی بعض اوقات غیر ممالک سے بھی لڑائی ہوئی لیکن زیادہ تر خانہ جنگی ہی کا دور دورہ رہا۔ اور نتیجہ ہمیشہ تباہ کن اور خونریز ثابت ہوا۔ جس وقت بغاوت کی پہلی علامت شاہی طاقت کے خلاف اسپین نو میں ظاہر ہوئی تو اس وقت اِرِانزا وائسرائے تھا۔ لیکن پہلی انقلابی تحریک اگرچہ جلد منکشف ہو گئی اور فنا بھی کر دی گئی تاہم ڈان پیڈرو ڈی گیری بے کی حکومت میں یہ پھر ظاہر ہوئی۔ ۱۸۰۹ء میں موریلیا میں ایک نئی سازش کا پتہ لگا اور ۱۸۱۰ء میں بمقام ڈولورس وہ عظیم بغاوت شروع ہوئی جس سے آخرکار میکسیکو کی آزادی حاصل ہو گئی۔ اس کا بانی ہیڈالگو تھا۔ اس کی نیت بُری نہیں تھی اور اس کے ارادے نیک تھے غالباً اُس نے اپنی کارروائی کی وسعت اور انجام کا کچھ پہلے سے خیال نہیں کیا تھا۔ غرض اس کی بغاوت سے ایسی سخت خانہ جنگی کی بنیاد پڑی کہ جس کی نظیر تاریخ کے صفحات میں تلاش کرنا بے سود ہے بغاوت کا طوفان ملک میں اس زور سے اُٹھا کہ سوسائٹی کے تمام درجے اُس کے پریشان کن اثر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے اور تمام پُرانی باتیں فنا ہو کر نئی باتوں کو بھی مشکل سے فروغ ہوا۔

تمام گاؤں کے مکھیا ہسپانوی حکومت کے طرفدار ہو گئے۔ ہیڈالگو نے جس کے ساتھ ایک کثیر جماعت تھی گواناجواٹو پر قبضہ کرلیا اور ویلاڈولڈ کو بھی لے لیا جس کے بعد وہ ٹولوکا کی طرف بڑھا اور اس کے بعد ٹیناکنٹ لین پر قابض ہو گیا۔ ہسپانوی گورنر نے تھوڑی سی فوج اس کے مقابلہ کے لیے روانہ کی جس کو لاس کروسیس کے مقام پر ۳۰/ اکتوبر کو ہیڈالگو نے شکست دی لیکن اس فتح کے بعد بھی ہیڈالگو نے واپسی اختیار کی اور آٹھ دن بعد کیلجا نے اس کو شکست دی۔ ہیڈالگو، ویلاڈولڈ اور گواڈالاجارا کو واپس ہوا

آخرالذکر مقام کے آس پاس اُسے پھر شکست ہوئی جس کے بعد اسے گرفتار کرلیا گیا اور گولی سے اُڑا دیا گیا۔

اس دوران میں تمام ملک بغاوت کے لیے آمادہ ہو گیا تھا اور بہت سے سرداروں نے علیحدہ علیحدہ بغاوت شروع کر دی تھی۔ ان سب میں نہایت ممتاز ڈان جوسی میریا موری لوس تھا جس نے نہایت چستی و چالاکی، ذہانت اور کامیابی سے جنوبی صوبوں کو گورنر کے خلاف بغاوت کے لیے کھڑا کر دیا اور ایک سیاسی جماعت یا مرکزی حکومت بنائی جو ستمبر ۱۸۱۱ء میں شہر زیتاکوارو میں مجتمع ہوئی جو صوبہ مکواکین میں واقع ہے۔ لیکن بعد ازاں کیلیجا نے اس شہر پر قبضہ کرلیا اور سیاسی جماعت منتشر کر دی گئی مگر کیلیجا کو جلا موری لوس کے خلاف کوچ کرنا پڑا جو جنوب سے ٹینانک ٹیلین کی سطح مرتفع میں داخل ہو گیا تھا۔ کیلیجا نے کوانٹ لے ایلپاس مقام پر پہونچکر اس پر حملہ کیا لیکن اس مقام نے اپنی مدافعت تقریباً تین ماہ تک بڑی ہوشیاری اور بہادری سے کی۔ اس کے بعد اس نے اس مقام کو چھوڑ کر اوجاکا پر قبضہ کرلیا۔

اب سیاسی جماعت میں نئے ارکان شامل ہونے سے کافی اضافہ ہو گیا تھا چنانچہ اس جماعت کا نام مجلس ملی رکھ کر میکسیکو کی آزادی کا اعلان ۱۳ نومبر ۱۸۱۳ء کو کر دیا گیا۔ لیکن اس کے بعد موری لیس کو اپنی شجاعانہ مہمات میں کم کامیابی ہوئی اور نومبر ۱۸۱۵ء میں وہ گرفتار کرلیا گیا۔ اس کو میکسیکو لے جاکر گولی سے مار دیا گیا۔ اس کے رفقا نے کچھ عرصہ تک جھگڑے کو جاری رکھا لیکن انھوں نے ایکدوسرے سے متفق ہو کر کام نہ کیا خصوصاً جب سے کہ ان میں ایک شخص تیران نامی نے کانگریس کو برطرف کر دیا تھا جو اُجاکا سے ٹیھوکان مرقوعہ ریاست پیوبلا کو منتقل ہو گئی تھی۔ وائسرائے وینی گاس نے کیلیجا کی ہوشیاری اور بہادری سے اعانت پاکر ان سرداروں کی فوجوں کو یکے بعد دیگرے برباد کر دیا یہاں تک کہ جب ڈان جیویر مینا جو مشہور ہسپانوی سردار تھا میکسیکو میں ۱۸۱۷ء میں آیا تو اس وقت باغیوں کی حالت اس قدر گر گئی تھی کہ وہ ان کے معاملہ کو آگے نہ بڑھا سکا بلکہ خود اس کوشش میں فنا ہو گیا۔ ملک رفتہ رفتہ زیادہ با امن ہوتا گیا۔ اور ۱۸۲۰ء میں اُسی درجہ پر پہنچ گیا جس میں وہ ۱۸۰۸ء میں تھا اور یہ حالت نئے وائسرائے اپوڈاکا کی ملاطفت اور نرمی سے اور ترقی پذیر ہو گئی۔

۱۸۲۰ء کے آغاز سے جو واقعات اسپین میں رونما ہوئے انھوں نے یہاں بھی معاملات کی صورت

بدل دی اور اسپین کو اپنے نہایت قیمتی مقبوضات امریکہ سے محروم کر دیا۔ ہسپانوی اور تمام گاؤں کے کھیا
جنھوں نے پہلے اتفاق کر لیا تھا اب دو فرقوں میں منقسم ہو گئے جن کا نام شاہی وفادار اور شرط پسند ہو گیا
اسپوڈاکا جو اول الذکر فریق کی طرف مائل تھا میکسیکو کے شروط کو بدلنا چاہتا تھا اور اس نے ڈان آگسٹن
ڈی اٹربائڈ کو اپنا آلۂ کار بنایا جو ایک نوجوان شخص تھا اور ویلاڈولڈ کے صوبہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے
والدین معزز تھے مگر مالدار نہ تھے۔ اس نے جنگ لاس کروسیس میں نام پیدا کیا تھا اور ہسپانوی فریق کا ہمیشہ
سے بڑا طرفدار تھا۔ اٹربائڈ کے پاس آٹھ سو آدمیوں کی جمعیت تھی، جب ۲۴ر فروری ۱۸۲۱ء کو اگوالا کے
چھوٹے قصبہ میں اس سڑک پر جو میکسیکو سے اکاپلکو کو جاتی ہے اس نے اعلان شایع کیا جو اُس وقت سے
اب تک اگوالا کی تجویز کہی جاتی ہے۔ اس کا مقصد جملہ فرقوں کو خوش کرنا تھا۔ وہ میکسیکو کی آزادی قائم
کرکے اسپین سے اس کا تعلق رکھنا چاہتا تھا اور اُس کو برقرار رکھنے کے لیے تاج میکسیکو شاہ اسپین کو پیش
کیا گیا اور اگر وہ انکار کرے تو اس صورت میں اس کے بھائی ڈان کیرولس یا ڈان فرانسسکو ڈی پالو کو
دیا جائے بشرطیکہ وہ اس ملک میں رہنا اختیار کریں۔

اگرچہ اٹربائڈ اُن اختیارات سے تجاوز کر گیا تھا جو وائسرائے اسپوڈاکا نے اسے دیے تھے لیکن
اس نے یہ دیکھ کر کہ اس تجویز کو اکثر اشخاص پسند کرتے ہیں اٹربائڈ کو تباہ کرنے کی کوئی کوشش نہ کی اور
دار السلطنت کے ہسپانویوں نے اس تاخیر سے مخوف ہو کر اس کو معزول کر دیا اور ڈان فرانسسکو نویلا کے
ہاتھ میں معاملات کی باگ دے دی لیکن اُن بدامنیوں سے جو ہمیشہ ایسی سخت تبدیلیوں کی لازمی عناصر ہیں
اٹربائڈ کو وقت مل گیا اور اس نے اپنی افواج کو گوریرو کے ساتھ ملا لیا جو اب تک ملک میں ایک باغی سردار بنا تھا
اور اس طرح اس کے شریک تمام شمالی اور مغربی صوبے ہو گئے۔ ماہ جولائی سے قبل تمام ملک نے اُس کی
حکومت تسلیم کر لی۔ صرف دار السلطنت نے جس میں نوویلا اور تمام یورپی افواج بند ہو گئی اس سے انکار کیا
اس موقع پر اٹربائڈ نے ویرا کروز پر ڈان جوان اوڈانجو نئے شروط کے وائسرائے کی آمد کی خبر سُنی وہ فوراً
ساحل پر پہنچا اور اوڈانجو سے ملاقی ہوا۔ اسے اگوالا کی تجویز منظور کرنے کی ترغیب دی اور اسی تجویز کو ابتدائی
صلح اور آخری تصفیہ کی بنیاد قرار دیا بشرطیکہ اسپین بھی اس پر راضی ہو جائے۔ یہ معاہدہ صلح نامۂ قرطبہ کے نام سے

مشہور رہے کیونکہ جہاں یہ گفت وشنید ہوئی اس جگہ کا نام قرطبہ ہے۔

اس طرح اٹربائڈ نے دارالسلطنت پر قبضہ حاصل کر لیا جہاں ایک سیاسی جماعت اور شاہی حکومت قائم ہوگئی لیکن اس طریقے سے کہ تمام طاقت اٹربائڈ کے ہاتھ میں رہی۔ کورٹیس کے فرمان مورخہ ۱۳ فروری ۱۸۲۲ء سے صلحنامۂ قرطبہ ناجائز اور کالعدم قرار دیا گیا اور اٹربائڈ کو جس کے ہاتھ میں طاقت تھی اور جس کے بہت سے متبعین تھے تخت پر جلوہ آرا ہونے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ فوج نے اس کو شہنشاہ میکسیکو ۱۸ مئی ۱۸۲۲ء مشتہر کر دیا اور اس نے آگسٹن اول کا خطاب اختیار کیا۔ ۲۴ فروری کو میکسیکو کی کانگریس کا آغاز ہوا اور اس نے بھی اس کو بادشاہ تسلیم کر لیا۔ لیکن اٹربائڈ اور کانگریس میں طاقت کے لیے جلد جھگڑا شروع ہوگیا اور شہنشاہ نے مجلس کو برطرف کر دیا، اسی طریقے سے جس طرح کرامویل نے انگلستان کی دراز پارلیمنٹ کو موقوف کر دیا تھا۔ مگر اسی روز اس نے نئی کونسل جو واضعان قوانین کی تھی طلب کی اور اس میں ان لوگوں کو اس کا رکن بنایا جو اس کی خواہشات اور ارادوں کے موید تھے۔ لیکن وہ اپنے رفقا کو جو میدان جنگ میں اس کے شریک حال رہے تھے ان تبدیلیوں کے لیے آمادہ نہ کر سکا۔ بہت سے جنرلوں نے اسکی کارروائیوں سے اختلاف کیا اور مقابلہ کے لیے آمادہ ہوگئے اٹربائڈ نے اس طوفان سے خوفزدہ ہو کر جو ہر طرف پھیلنے والا تھا قدیم کانگریس کو طلب کیا اور مارچ ۱۸۲۳ء میں تخت چھوڑ کر یورپ چلا گیا جہاں سے وہ ۱۸۲۴ء میں میکسیکو واپس آیا اس کو کانگریس نے قابل گردن زدنی قرار دیا اور جب وہ ساحل پر اترا تو پیڈی لا پر گولی سے مار ڈالا گیا۔

اس طرح میکسیکو کسی باقاعدہ حکومت کے بغیر چھوڑ دیا گیا۔ اس کے پاس کوئی مشروطہ نہ تھا معاملات عارضی طور پر کبھی بریوو کبھی وکٹوریا اور کبھی نیگریٹ نے انجام دیے لیکن ۴ اکتوبر ۱۸۲۴ء کو ایک مشروطہ جس میں سولہ اصلی ریاستیں شامل تھیں ایک جمہوری سلطنت کے لیے بنایا گیا۔ جس قومی مجلس نے یہ مشروطہ تیار کیا اس کا اجلاس چودہ ماہ تک رہا یکم جنوری ۱۸۲۵ء کو جنرل وکٹوریا جمہوری سلطنت کا صدر بنایا گیا اس نے اپنا زمانہ خیر و خوبی سے ختم کیا لیکن اس کے بعد دو فریق ہوگئے اور صدارت کے متعلق اس قدر خون خرابے ہوئے کہ جسکی کوئی انتہا نہ رہی جب ایک فریق کا صدر منتخب ہو جاتا تھا تو دوسرا فریق اپنی شکست تسلیم نہیں کرتا تھا اور بغاوت اختیار کرتا تھا یہ الٹ پلٹ اور خونریزی برابر جاری رہی۔ ایک مرتبہ دارالسلطنت کے اندر ایک ماہ تک برابر تلوار چلتی رہی۔

۱۸۴۵ء میں کانگریس نے عام معافی اور امن و امان کا اعلان کیا اور جنوبی ٹیکساس کو آزادی کی
رائے دی بشرطیکہ وہ ریاستہائے متحدہ میں شامل نہ ہو۔ لوگ اس فیصلہ سے بہت ناخوش ہوئے اور ریاستہائے
متحدہ سے نہایت خونریز جنگ شروع ہوگئی جو ۱۸۴۸ء میں جاکر ختم ہوئی اس جمہوری سلطنت کی تاریخ بجز بدامنی اور
فساد کی تاریخ ہے۔ صدر کا انتخاب پھر اسی کے مقابلہ میں دوسرے صدر کا کھڑا ہونا کبھی اس کا کامیاب ہونا
کبھی اُس کا کامیاب ہونا، اور ایک مرتبہ نہیں بلکہ ہر صدر کے انتخاب پر ایسا ہوتا۔ اس امر کے متعلق مناقشات
کہ مرکزی حکومت رہے یا علیحدہ علیحدہ جمہوری سلطنتیں بن جائیں، خانہ جنگیاں، تمام فرقوں کا رو بانحطاط ہونا
سانٹا انا کا صدر کا بار بار جلاوطن ہونا اور بار بار بوقت ضرورت آنا (تین مرتبہ جلاوطن کیا گیا اور تین مرتبہ
واپس بلایا گیا) ملک کی مالی اور اقتصادی حالت کا خراب ہونا عام طور پر یہ خاص واقعات ہیں جن سے جمہوری
سلطنت کی تاریخ کے صفحات پُر ہیں اور جنکی تفصیل ہم بیان کرنا نہیں چاہتے۔ بہرحال یہ امر با آسانی سمجھ میں
آسکتا ہے کہ ان حالات میں ایک شاہی پسند فرقہ بتدریج بڑھتا گیا۔ اُس نے ایک اخبار یونیورسل نامی جاری
کیا اور اس بات پر زور دیا کہ شاہی اداروں سے ہی ہماری نجات ہوسکتی ہے۔ اس فریق میں بہت سے
لائق اشخاص شامل تھے، چنانچہ ایک ممتاز شخص ڈان گوٹی رز دی ایسٹریڈ تھا جو یورپ گیا اور ۱۸۴۶ء میں
وائنا میں اس نے یہ کوشش کی آسٹریا کا ایک آرچ ڈیوک میکسیکو کی شہنشاہی کے لیے آمادہ ہوجائے لیکن وہاں
اُسے ناکامی ہوئی اور میکسیکو کی خانہ جنگیاں اپنا کام کرتی رہیں چونکہ اہل یورپ کے لوگوں کا جان و مال ان
بدامنیوں سے خطرہ میں تھا اس لیے فرانس، انگلستان اور اسپین میں باہمی معاہدہ ہوا کہ میکسیکو کو مجبور کیا جائے کہ وہ
بیرونی ممالک کے اشخاص کی حفاظت کرے البتہ اُسے حق ہے کہ وہ جس طرز کی حکومت پسند کرے اُسے اختیار کرے
کچھ دنوں بعد فرانس نے سیاسی معاملات میں بھی دخل دینا شروع کر دیا لہذا اسپین و انگلستان اُس سے
کنارہ کش ہوگئے۔ ۱۸۶۲ء میں فرانس اور میکسیکو میں باہم جنگ شروع ہوگئی۔ فرانس کو کامیابی حاصل ہوئی
اور اس نے تاج میکسیکو، آسٹریا کے میکسیملین کو پیش کیا۔ میکسیملین کو مجبور کیا گیا کہ وہ تاج آسٹریا سے
دست بردار ہو جائے۔ چنانچہ وہ شہر میکسیکو ۱۲ر جون ۱۸۶۴ء کو پہنچا لیکن اہل میکسیکو اس انتظام سے
خوش نہ تھے۔ اُدھر ریاستہائے متحدہ امریکہ نے اصول منرو کے نفاذ کی طرف توجہ کی۔ دو فرانس کو مجبور کیا کہ وہ

میکسیکو کے سیاسی معاملات میں دخل نہ دے۔ پس نپولین سوم نے فرانسیسی افواج میکسیکو سے واپس
بلالیں۔ اس وقت میکسیملین کی بیوی فرانس پہنچی اور شہنشاہ سے ہر چند مداخلت کے لیے کہا مگر وہ راضی نہ ہوا
اس کے بعد اس نے پوپ سے سے بھی مل کر اس کی مداخلت چاہی لیکن اس نے بھی انکار کر دیا۔ ان
ناکامیوں سے وہ اس قدر متاثر ہوئی کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا اور وہ پاگل ہو گئی میکسیملین نے میکسیکو
کا شہنشاہ بن کر کسی کانگریس یا مجلس ملی کے بغیر حکومت شروع کر دی تھی اور تمام کام وزراء میں تقسیم
کر دیا تھا۔ اس کے ارادے نیک تھے لیکن صلح و آشتی کے زمانے میں وہ ایک کامیاب بادشاہ ہو سکتا تھا، جنگ
وجدال کا زمانہ اس کے لیے موزوں نہ تھا کیونکہ وہ فوجی قابلیت اس میں نہ تھی جس کے ذریعہ سے وہ مختلف
بغاوتوں کی سرکوبی کر سکتا جب تک فرانسیسی افواج میکسکو میں رہیں، اہل میکسیکو کچھ دبے رہے لیکن
جب وہ واپس فرانس طلب کر لی گئیں تو اُنھوں نے سر اُبھارا اور ہر جگہ بغاوتیں ہونے لگیں ہسپانوی اُمرا
پادری اور سرکاری عمال شہنشاہ میکسیملین کے طرفدار رہے اور اس نے فوج جمع کر کے بغاوتوں کا انسداد
بھی کرنا شروع کیا لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی اگرچہ وہ اپنی جان بچا کر میکسیکو سے باہر جا سکتا تھا لیکن وہ
اپنی حماقت سے باغیوں کا برابر مقابلہ کرتا رہا اور ان سے لڑتا رہا۔ آخر کار اُسے شکست ہوئی اور وہ
گرفتار ہو گیا۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا اور اُس کو بغاوت، قتل اور فساد وغیرہ کے جرم میں ۱۹؍ جون ۱۸۶۹ء کو
سزائے موت دی گئی۔

میکسیملین کے قتل کے بعد جوارز صدر بنایا گیا مگر ڈیاز اور اس کے دوستوں نے اُس کو صدر
نہ تسلیم کیا اور جب تک جوارز نہ مر گیا یہ جھگڑا برابر جاری رہا۔ ۱۸؍ جولائی ۱۸۷۲ء کو اس کا انتقال ہوا
اور مخالفین نے اسی روز اپنے ہتھیار رکھ دیے اور سب کے سب شرط کے جھنڈے کے نیچے آکر جمع ہو گئے
کہا جاتا ہے کہ خانہ جنگی کا خاتمہ ۱۸۶۵ء میں ہو گیا تھا لیکن تاریخ میکسیکو میں امن وامان کا پتہ آج تک
نہیں ملتا کوئی نہ کوئی جھگڑا کوئی نہ کوئی فساد ضرور ہوتا رہتا ہے البتہ ۱۸۸۴ء سے ۱۹۰۲ء تک کوئی
سیاسی جھگڑا نہیں ہوا۔ ۱۸۷۳ء میں ویراکروز اور میکسیکو ریلوے جاری ہوئی۔ ڈیاز صدر کے زمانہ میں
ابتدائی تعلیم مفت اور لازمی کر دی گئی تار اور ڈاکخانہ کے محاصل میں بے حد اضافہ ہوا اور ملک کی نہ صرف

ایک مرتبہ بڑا سخت قحط پڑا اور اہل میکسیکو کے کچھ خاندان وہاں سے ادھر آکر آباد ہو گئے کیونکہ یہاں اُنکو کھانے پینے کا سامان بکثرت مل گیا۔ ان لوگوں نے یہاں پہنچ کر عمدہ مکانات تعمیر کیے اور اگرچہ اُس شان و شوکت کے یہ مکانات نہ تھے جو میکسیکو میں پائے گئے تاہم ان کی تعمیر سے بھی ان کی دستکاری اور صناعی کا پتہ چلتا تھا۔ گل گونزیلز ۲۵ جون سنہ ۱۵۲۳ء کو نیاما واپس آیا اور اپنے ساتھ بہت سونا لایا۔ اُس نے وہاں تیس ہزار آدمیوں کو بپتسمہ بھی دیا۔

پیڈریریس نے جو نیاما کا گورنر تھا ہرنانڈیز ڈی کورڈوا کو نکاراگوا پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا اور اُسنے گونزیلز کو نکال باہر کیا لیکن گورنر نے اُس پر خودمختاری کا الزام لگا کر اس کو قتل کرا دیا اور وہ سنہ ۱۵۲۶ء سے سنہ ۱۵۳۱ء تک نکاراگوا کا بھی گورنر رہا۔ درحقیقت۔ اس مملکت کے قبضے کے لیے بہت سے ہسپانویوں نے جو دربار اسپین سے اجازت بھی حاصل کر لیتے تھے باری باری کوشش کی اور اس سعی میں آتشزدگی قتل و غارت لوٹ مار سب کچھ ہوتا تھا جس کا خمیازہ صرف ہندوستانی بھگتتے تھے۔ چنانچہ وہ سخت مصیبت میں مبتلا تھے ہرچند انھوں نے ہسپانویوں سے نجات پانے کی تدابیر کیں لیکن کوئی کارگر نہ ہوئی۔

گواٹی مالا کی دریافت

کورٹیز نے میکسیکو کی فتح کے بعد جنوبی سمندر کے متعلق کچھ حالات سُنے تھے کہ اتفاق سے میکسیکو کی تباہی کے بعد شاہ گوآن نے کورٹیز کی خدمت میں سفیر بھیجے۔ اس سفارت سے بھی کورٹیز کو وہاں کے حالات بخوبی معلوم ہو گئے اور اُس نے اپنے نائب پیڈرو ڈی الوراڈو کو وسطی امریکہ پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ ٹی ہان ٹی پیک اور ٹیوٹوٹی پیک جو اس وقت دو صوبے تھے آپس میں ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ ٹی ہان ٹی پیک کے جنوب میں سوکونسکو کا صوبہ واقع ہے اور اس کے جنوب میں گواٹی مالا ہے۔ الوراڈو نے ان صوبوں کو مغلوب کیا اور صوبہ ٹیوٹوٹی پیک میں ایک شہر سیگورا نامی آباد کیا لیکن سخت گرمی اور کیڑوں کی کثرت کی وجہ سے اسے چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد اس نے دو پیغامبر گواٹی مالا کو جس کے معنی لکڑی کی جگہ کے ہیں روانہ کیے تاکہ وہ اُس صوبے کے سردار کو مذہب عیسوی کی تعلیم دیں۔

اس صوبہ پر ایک قوم جس کا نام ٹلٹی کا تھا حکمراں تھی جو میکسیکو سے آئی تھی۔ یہ قوم شہر میکسیکو سے

پر رہتی تھی۔ جو شخص اپنی قوم کو یہاں لے کر پہنچا اور بادشاہ بنا اُسکا نام مانکو کیش تھا۔ اس کی
ین زرخیز تھی۔ جوار، مکا، روئی بکثرت پیدا ہوتی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس میں گیہوں اور
ں پیدا ہو سکتے تھے۔ حکومت بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتی تھی لیکن اگر وہ ظالم ہوتا تھا تو اُنکے
لطنت کے تمام ججوں اور خاص لوگوں کو جمع کیا جاتا تھا اور وہ اس کو معزول کر دیتے
ں چوری کی بھی عجیب سزائیں تھیں اور دیگر جرائم کے لیے جرمانے سے لے کر موت تک کی سزائیں
ں وہ تمام قیدیوں کو یا غلام بنا لیتے تھے یا مار ڈالتے تھے اور ان کو کھا جاتے تھے۔ اُن کے یہاں
ں اور لڑکیوں دونوں کے لیے) تمام بڑے شہروں میں مدارس قائم تھے۔ اور اُن کے یہاں
ں بولی جاتی تھیں ۔
نے اس ملک پر حملہ کیا اور زپاکاکے بادشاہ کو قتل کر دیا۔ قرب وجوار کے تمام ہندوستانیوں کو
یع و منقاد بنایا گیا۔ اس نے گواٹی مالا میں جولائی ۱۵۲۴ء میں ایک شہر سینٹیاگو کے نام سے
ت کا کوئی حصہ غیر مفتوح نہ چھوڑا۔ نیز ہندوستانیوں کو جو اس کی تیغ خوں آشام سے بچے
ب عیسوی اختیار کریں چارلس پنجم نے اُس کو یہاں کا گورنر مقرر کر دیا یہاں تک کہ وہ
ت ہو گیا۔ اُس کے مرنے کے بعد شاہ اسپین نے ایک کونسل ایک صدر کے ماتحت مقرر
نظام مملکت کرتی رہی لیکن درحقیقت ظلم و ستم کے سوا ان کا کوئی اور شعار نہ تھا انصاف
نچہ ۱۸۰۸ء میں وہاں بھی بغاوت کے پہلے نشانات ظاہر ہونے لگے۔ وہاں کے باشندوں
جماعت بنائی اور آزادی حاصل کرنے کے درپے ہو گئے ۔

جمہوری سلطنت کا قیام

ی مجلس ۲۴ جون ۱۸۲۳ء کو منعقد ہوئی۔ ۱۲ جولائی کو مکمل آزادی کا اعلان ہوا اور ۲ دسمبر کو
یاستہائے متحدہ امریکہ کی طرز پر بنایا گیا۔ جمہوری سلطنت کا نام "وسطی امریکہ کے متحدہ صوبجات"

یکا پر ۶ ستمبر ۱۸۲۴ء کو کانگریس نے تمام کام ختم کر دیا اور ۱۹ ستمبر کو متحدہ کانگریس نے اپنی

نشست اختیار کی ۲۲ر نومبر کو مند وبین نے شرائط پر اپنے دستخط بھی کر دیے۔ لیکن باوجود ان سب باتوں کے
لوگوں میں اتحاد قائم نہ رہا اور دو فریق پیدا ہوگئے اور خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ آخر کار ۱۸۳۱ء میں مورازان جمہوری
سلطنت کا صدر منتخب ہوا اور پبلک حالات کو امن وامان کے ساتھ آٹھ سال تک انجام دیتا رہا مگر اُس کے آخری
ایام حکومت میں ایک بدنام شخص کیریرا نے ہندوستانیوں، پادریوں اور شاہی پسند لوگوں کو ملا کر بغاوت کر دی
جس میں جمہوری سلطنت کی افواج کو شکست ہوئی اور مورازان جلاوطن کر دیا گیا۔ اس وقت سے وسطی امریکہ کی
پانچوں ریاستیں علیحدہ علیحدہ ہوگئیں اور جمہوری سلطنت کا نام ہی نام رہ گیا۔ کیریرا نے ۲ر فروری ۱۸۵۱ء کو متحدہ
افواج وسطی امریکہ کو ایک اور شکست دی اور یہ ایسی سخت تھی کہ پھر وہ پنپنے نہ پائی۔

وسطی امریکہ کی ریاستوں کی علیحدہ علیحدہ تاریخ اندرونی مناقشات اور جھگڑوں سے پُر ہے اور تاریخ عالم
پر اپنا کوئی اثر مترتب نہیں کرتی اور نہ وہ کچھ دلچسپ ہے۔ نکاراگوا نے اسپین سے ۱۸۵۰ء میں بلجیم سے ۱۸۵۸ء
میں فرانس سے ۱۸۵۹ء میں اور ریاستہائے متحدہ امریکہ سے ۱۸۶۷ء میں نہر نکاراگوا کی غیر جانبداری کے متعلق
عہد نامہ کر لیے۔ ایک اور صلحنامہ ریاستہائے متحدہ امریکہ سے ہوا جس سے نہر بنانے کا حق آخر الذکر کو دیدیا گیا۔

باب بستم (۲۰)

برازیل

پہلا شخص جس نے سواحل برازیل دریافت کیے وانسینٹی یینیز پنزن تھا جو کولمبس کے ساتھ اپنے
پہلے سفر پر نینیا جہاز کا کمانڈر ہو کر گیا تھا۔ اُس نے اور اس کے بھتیجے نے سات سال بعد پالس سے دسمبر ۱۴۹۹ء
میں کیپ ورڈ ہو کر مغرب کی طرف سفر کیا وہ ۲۶ر جنوری ۱۵۰۰ء کو راس سینٹ آگسٹائن پر پہنچے جو ساحل
پنزن نے دریافت کیا تھا وہ اس خطہ کے اندر تھا جو پرتگیزوں کے حصہ میں دیدیا گیا تھا۔ قبل اس کے کہ پنزن
یورپ پہنچے پرتگیزوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ۹ر مارچ ۱۵۰۰ء کو جہازات کا ایک بیڑہ جزائر کنیری سے ہوتا
ہوا کو ابورس پہنچا اور اس نے اس زمین کا نام ویرا کروز رکھا۔ شاہ ایمونیل اس دریافت سے ایسا خوش ہوا
کہ کیم مئی ۱۵۰۱ء کو اس نے ایک اور بیڑہ روانہ کیا۔

ناپسند کرتی تھیں اور انتہائی درجہ تک مقابلہ کرنے کو تیار تھیں۔

نوآبادی کا طریقہ

جان سوئم نے ایمونیل کا بیٹا اور وارث تھا وہ طریقہ نوآبادی شروع کیا جو اس نے پہلے جزائر ازورس اور میڈیرا کے لیے تیار کیا تھا۔ اس نے ملک کو موج کے کپتانوں کے حوالے نسلاً بعد نسل کر دیا پرتگیزی اُمرا کو دے دیا جن کو اس نے اس قابل سمجھا۔ اُس نے سزائے موت اور سکہ کے اختیارات کے علاوہ جملہ اختیارات ان اُمرا کو دے دیے تھے۔ پہلا شخص جس کو یہ جاگیر عطا ہوئی مارٹم آفونسو ڈی سوسا تھا۔ اس نے دریائے یوجلینیز و کے قرب میں تمام ساحل کو دریافت کیا۔ مارٹم آفونسو جس نے جزیرہ سان سیباشین اور راس سینٹ ونسینٹ دریافت کی خوب سمجھتا تھا کہ وحشیوں کو کس طرح بنائے۔ چنانچہ وہ ان کے درمیان ان پر حملہ کیے بغیر رہنے لگا۔ پیڈرو ڈی گوز جس کو بادشاہ نے تیس فرسخ کا علاقہ عطا کیا تھا۔ پانچ برس تک وحشیوں سے لڑتا رہا اور آخر کار واپس چلا گیا۔ خلیج سان سالوی ڈور فرانسسکو پیری راکوٹن ہو کو اس شرط پر دی گئی کہ وہ وحشیوں کو مہذب بنائے یا ان سے لڑ جھگڑ کر ایک شہر آباد کرے اور وہاں مستقل نوآبادی قائم کرے انفرادی مراعات گو شروع میں نوآبادی کی ترغیب کیلیے مناسب معلوم ہوں تاہم زیادہ عرصہ تک اُن کا قائم رہنا مناسب نہیں تھا کیونکہ نوآبادی اور آبائی ملک کے تعلقات روزانہ کم ہوتے جاتے تھے اور نوآبادوں کی زندگی عزت و آبرو، مال و منال سب اُن کے ہاتھ میں تھا چنانچہ بادشاہ کو شکایات پہنچنے لگیں۔ پس جوآؤ سوم نے ان تمام چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر ایک افسر اعلیٰ یعنی گورنر جنرل کو مقرر کرنا ضروری سمجھا جس کو تمام پرتگیزی برازیل پر دیوانی اور جنگی اختیارات عطا کیے۔

پہلا گورنر جنرل ٹھامی ڈی سوسا تھا۔ وہ اپریل ۱۵۴۹ء کو روانہ ہوا اور دو ماہ کے بعد خلیج سان سالوی ڈور میں پہنچا۔ ٹھامی نے فوراً ایک شہر کی بنیاد ڈالی جس کا نام اس نے سان سالوی ڈور رکھا۔ چار سال کی محنت اور کامیابی کے بعد جس میں اس نے ساحل سمندر کو محکوم اور خاموش بنا دیا تھا اور نوآبادی کو مرفہ الحال کر دیا تھا۔ اپنی واپسی کی درخواست کی۔ اُس کے بعد ایڈورڈ ڈاکوسٹا بھیجا گیا پادریوں کی ایک کثیر جماعت بھی اُس کے ساتھ گئی، اور ان لوگوں نے ہتھیاروں سے بڑھ کر کام کیا

یعنی مذہب عیسوی اشاعت خاموشی کے ساتھ کی۔ پرتگیزوں نے چند ناگزیر لڑائیوں کے بعد ایک معتد بہ رقبہ پر اپنا مستحکم قبضہ کر لیا۔ جوآؤ سوم کی وفات کے بعد اس کا پوتا تخت نشین ہوا جس کی عمر صرف تین سال کی تھی۔ ریجینسی کام کرتی رہی اور انتظام نوآبادی مختلف گورنروں کی ماتحتی میں بخیر و خوبی انجام پاتا رہا۔ شاہ پرتگال ۱۵۸۰ء میں لاولد فوت ہو گیا اور سلطنت پرتگال فلپ دوم شاہ اسپین کو مل گئی اب تمام پرتگیزی نوآبادیاں ہسپانویوں کے قبضے میں آگئیں اور برازیل کا بھی یہی انجام ہوا۔ اس سے برازیل کو سخت نقصان پہنچا۔ کیونکہ فلپ دوم اور انگلستان کی ملکہ ایلزبیتھ میں لڑائی شروع ہو گئی اور انگریزی بحری قزاق برازیل کے سواحل پر بھی لوٹ مار کر جاتے تھے۔ فلپ دوم سے اس نوآبادی کو نقصان کے سوا کچھ فائدہ نہ پہنچا۔ اس کے وارث فلپ سوم نے ڈام پیڈرو دبوٹل ہو کو گورنر بنا کر بھیجا اور اس نے اندرون ملک کی حالت معلوم کرنے کے لیے سرگرمی ظاہر کی۔ اس کے جانشین گورنر نے دریا ایمیزان کے دہانے پر نوآبادی قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ رفتہ رفتہ پرتگیز برازیل کے بہت سے حصہ کو نوآباد بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ان کی بدنصیبی تھی کہ ان کو اہل فرانس اور ہالینڈ سے لڑنا پڑا۔ مگر آخرکار پرتگیز کامیاب ہوئے۔ اور برازیل پر اپنا قبضہ بدستور رکھا۔

پرتگیزی سلطنت برازیل کو منتقل ہوتی ہے

ڈام پیڈرو جو ملکہ پرتگال کا شوہر تھا۔ برائے نام بادشاہ تھا۔ ۱۷۸۶ء میں انتقال کر گیا اس کی وفات پر اس کی بیوی میریا حکومت کرتی رہی اس کا بڑا لڑکا جو ولی عہد تھا وہ بھی مر گیا اس کا دوسرا لڑکا ڈام جوآؤ ڈی برگینزا جو شہزادۂ برازیل کے نام سے موسوم تھا ولی عہد ہو گیا اس وقت پرتگال پر فرانسیسی حملے کی تیاریاں ہو رہی تھیں انگریزی سفیر نے کہا کہ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاہی خاندان برازیل چلا جائے تاکہ وہاں نپولین کے حملے سے محفوظ رہے۔ ڈام جوآؤ اس بات پر آمادہ ہو گیا اور تمام شاہی خاندان ۲۹ نومبر ۱۸۰۷ء کو برازیل روانہ ہو گیا یہ لوگ ۱۹ جنوری ۱۸۰۸ء کو برازیل کے صوبہ باہیا میں پہنچے جہاں شاہی خاندان کا استقبال نہایت گرم جوشی اور وفاداری سے کیا گیا۔ اس کے بعد یہ شاہی خاندان ریو جنیرو پہنچے جو تجارت کا

مرکز تھا اور جہاں سے جہازات یورپ، امریکہ، افریقہ، ہندوستانی اور بحر جنوبی کے دیگر جزائر کو آتے جاتے تھے
ڈام جوآؤ کو وہاں بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ شہزادہ نے برازیل کی صنعت و دستکاری پر جو رکاوٹیں تھیں دور کیں
اب ہر شخص کارخانے کھولنے اور مصنوعات تیار کرنے کے لیے آزاد ہو گیا۔ مختصر یہ کہ ہر بات برازیل کو بقیہ
دنیا کی محتاجی سے آزاد کرنے کے لیے اختیار کی گئی۔ وہاں ایک چھاپہ خانہ بھی کھولا گیا اور ایک اخبار بھی جاری کیا گیا
اب لوگ غفلت کی میٹھی نیند سے جاگ اٹھے اور دربار لسبن کا جو پہلے اثر تھا وہ باقی نہ رہا۔ نوآبادوں
اور ان ماتحتوں میں جو آبائی ملک سے ابھی آئے تھے اختلافات شروع ہو گئے لیکن ۱۸۱۵ء کے فرمان سے جو برازیل کو
نوآبادی کی بجائے سلطنت کا درجہ عطا ہو گیا تو قوم پرست لوگ خوش ہو گئے۔ ملکہ کا انتقال ہو چکا تھا اور شہزادہ نے
عنان سلطنت جوآؤ ششم کے لقب سے ہاتھ میں لے لی تھی۔ پرتگیزوں اور اہل برازیل میں روزانہ جھگڑے اور
فساد کے اسباب ترقی پذیر تھے۔ واقعات یورپ نے بادشاہ کو لسبن واپس بلا لیا (۱۸۲۱ء) اور اس کے
چلے جانے کے بعد انقلاب ضروری ہو گیا۔ برازیل نے سیاسی تبدیلی کو ضروری سمجھ کر ایک دارالمندوبین بنایا
انتخاب کنندگان کی ایک مجلس کو جبر کے ساتھ منتشر کیا گیا اور قابل نفرت سختی کا برتاؤ جائز رکھا گیا
جوآؤ ششم نے اس کے بعد کم و بیش اپنی ہی خوشی سے حقوق برازیل سے دست برداری دے دی اور
اس کا بیٹا ڈام پیڈرو مشروطہ کا شہنشاہ مشتہر کیا گیا۔ جب مشروطہ کا ایک بار وعدہ کر لیا گیا تو وہ برازیل کو
دینا بھی پڑا۔ صوبوں سے ریو جینرو پر نائبین قوم جمع ہوئے۔ شہنشاہ نے خیال کیا کہ ان لوگوں میں جمہوری
سلطنت کی طرف میلان پایا جاتا ہے لہذا اس نے دارالمندوبین کو شکست کر دیا۔ ڈام پیڈرو نے پھر خود
ایک مشروطہ کی تجویز پیش کی اور حکام نے اس کی وفاداری کا حلف ۲۵ مارچ ۱۸۲۴ء کو اٹھایا۔ اس
مشروطہ کی بنا پر چونکہ اس میں دور اندیشانہ اور فیاضانہ اصول کار فرما تھے برازیل میں چند ماہ تک امن
و امان رہا اور حکومت کی طاقت مستحکم معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس کے بعد اندرونی لڑائیاں شروع ہو گئیں
اور شہنشاہ نے یہ مناسب سمجھا کہ خود تاج چھوڑ کر اپنے بیٹے کو بادشاہ کر دے اور وہاں سے یورپ چلا جائے
چنانچہ ۷ اپریل ۱۸۳۱ء کو ایسا ہی ہوا۔ دوسرے روز لڑکے کو پیڈرو دوم کے نام سے شہنشاہ بنا دیا گیا
اور انتظام سلطنت کے لیے ایک کونسل مقرر کر دی گئی۔ پیڈرو اول یورپ کو روانہ ہو گیا اور ۲۴ ستمبر ۱۸۳۵ء کو

میں ایک قومی کانگریس جمع ہوئی اور اُس نے ایک مشروطہ برازیل کی ریاستہائے متحدہ کے
تیار کیا۔ اب پہلے صوبوں کو بجائے ریاستوں کے نام سے موسوم کر دیا گیا تھا ۱۸۹۲ء میں ایک بڑی
بغاوت ہوئی اور بڑے خون خرابہ کے بعد فرو ہوئی ڈاکٹر موراس کی صدارت با اثر رہی اور
جھگڑے کم ہوے۔ اس کے بعد ڈاکٹر کیمپس سیلس صدر بنایا گیا اُس نے انتظام حکومت کا خرچ
کم کر دیا اور لوگوں کے ذاتی حقوق کی بے حد نگہداشت کی۔

برازیل میں آج تک جمہوری سلطنت کے ابتدائی اصول کی کمی ہے۔ کانگریس کے صدر
کے انتخاب میں لوگوں کی کوئی رائے نہیں لی جاتی۔ ہر صوبے اور مقام میں اُمراشاہی
حکومت ہے وہی لوگ طے کرتے ہیں کہ کون صدر ہو چنانچہ انھیں کے فیصلے کے مطابق
صدر اور ممبران کانگریس منتخب ہو جاتے ہیں۔ عوام سیاسی آزادی کے معنی بھی نہیں جانتے
اور وہ رائے دینے بھی نہیں آتے تاوقتیکہ انھیں مجبور نہ کیا جائے ایک زمانہ میں جرمن آبادی
برازیل میں بہت ترقی کر رہی تھی اور ریاستہائے متحدہ کے لوگ اصول منرو کا نفاذ چاہتے تھے
اور ان کی خواہش تھی کہ اس آبادی کو روک دیا جائے۔ شاید گذشتہ جنگ یورپ کے نتیجے نے
جرمنی کے اندیشے کو دلوں سے محو کر دیا ہے۔ بہر حال اب بھی وہاں ایک لاکھ چالیس ہزار
جرمن موجود ہیں۔

۱۹۰۲ء میں ڈاکٹر کیمپس سیلس کی بجائے ڈاکٹر روڈرگس آلویز صدر مقرر کیا گیا تھا
اور یہ سلسلہ اسی طرح چلا آتا ہے۔